قیمت ...... [redacted] 8/=

ملنے کا پتہ

ادارہ فروغ اردو دہلی

مطبوعہ محبوب المطابع پریس دلّی

پریم چالیسی

حصّہ دوم

فہرست مضامین

دو سکھیاں

(۱)

لکھنؤ یکم جولائی ۱۹۲۵ء

پیاری بہن ......!

جب سے یہاں آئی ہوں تمھاری یاد ستاتی رہتی ہے۔ کاش تم کچھ دنوں کے لئے یہاں چلی آتیں تو کتنی بہار رہتی۔! میں تمھیں اپنے 'ونود' سے ملاتی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے؟ کیا تمھارے ماں باپ اتنی آزادی بھی نہ دینگے؟ مجھے تو بہت بڑا تعجب ہے کہ بیڑیاں پہن کر تم کیوں کر رہ سکتی ہو؟ میں تو ایک گھنٹے بھر بھی اس طرح نہیں رہ سکتی۔ ایشور کا شکر کرتی ہوں۔ کہ میرے پتاجی پرانی لکیر کے فقیر نہیں۔ وہ اس نئی تہذیب کے حامی و دلدادہ ہیں۔ جس نے نسوانی زندگی کو سورگ بنا دیا ہے۔ ورنہ میں تو کہیں کی بھی نہ رہتی۔

ونود حال ہی میں انگلینڈ سے واپس آئے ہیں۔ اور زندگی کا سفر شروع کرنے سے پیشتر ایک بار دنیا کا سفر کرنا چاہتے ہیں۔ یورپ کا بیشتر حصّہ تو وہ دیکھ چکے ہیں۔ مگر امریکہ۔ آسٹریلیا اور ایشیا کی سیر کے بغیر

انھیں چین نہیں ۔ بالخصوص وسط ایشیا اور چین کی سیاحت کے تو نہایت دلدادہ ہیں۔ جن امور پر یورپین سیاح خاموش ہیں۔ انہیں پر روشنی ڈالنا ان کا خاص مقصد ہے۔ چندا میں سچ کہتی ہوں۔ ایسا ذی فہم اور جامع شخص اب تک میری نگاہوں سے نہیں گزرا۔ میں تو ان کی گفتگو سنکر دنگ رہ جاتی ہوں۔ کوئی ایسا موضوع نظر نہیں آتا جس پر انہیں عبور نہ حاصل ہو یا جس پر وہ اظہار خیال نہ فرما سکتے ہوں۔ وہ محض کتابی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تجربات کی وسعت، نوعیت، اور ندرت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کا خاصہ ہے۔ آزادی کے وہ پجاری ہیں۔ ایسے شخص کی بیوی بن کر ایسی کون عورت ہے جو اپنی خوش قسمتی پر نازاں نہ ہو۔

بہن! تم سے کیا کہوں کہ انھیں صبح اپنے بنگلہ کی طرف آتے دیکھ کر میرے دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔! یہ ان پر نثار ہونے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ میری آتما میں بس گئے ہیں۔ میں نے اپنے شوہر کا تصور جو دل میں کیا تھا۔ اس میں اور ان میں رتی بھر بھی فرق نہیں۔ مجھے دن رات یہی خوف دامنگیر رہتا ہے کہ کہیں مجھ میں ان کو کوئی کمی نہ نظر آ جائے۔ جن مضامین سے انہیں رغبت ہے۔ ان کا مطالعہ میں آدھی آدھی رات تک کیا کرتی ہوں۔ ایسی محنت میں نے کبھی نہ کی تھی کنگھی چوٹی کی جانب کبھی اس قدر میری توجہ نہ تھی۔ لطائف کا میں نے کبھی اس دلچسپی سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اگر اتنا سب کچھ کرنے پر بھی میں ان کا دل نہ پا سکی۔ تو بہن! میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ دل پھٹ جائے گا۔ اور دنیا میرے لئے سونی ہو جائے گی۔

کبھی کبھی محبت کے ساتھ ہی دل میں رقابت کا جذبہ بھی بیدار ہو اٹھتا

ہے ۔ انہیں میرے بنگلہ کی جانب آتے ہوئے دیکھ کر جب میری پڑوسن "کسُم"
اپنے برآمدے میں آکر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ تو میری طبیعت یہی چاہتی ہے ۔
کہ اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں ۔ کل تو ظلم ہی ہو گیا ۔ ونود نے اسے دیکھتے
ہی ہیٹ اُتار لی ۔ چہرے پر تبسم نمودار ہوا ۔ وہ نصیبوں جلی آوارہ مزاج کسُم
بھی دانت نکالنے لگی ۔ ایشور تمام باتیں دے مگر جھوٹا غرور نہ دے ۔ چڑیلوں
کی سی تو آپ کی صُورت ہے ۔ مگر اپنے کو اپسرا سمجھتی ہیں ۔ آپ شاعرہ ہیں ۔ اور
کئی اخبارات و رسائل میں آپ کا کلام بھی شائع ہوتا ہے ۔ بس آپ زمین پر
پاؤں نہیں رکھتیں ۔ میں سچ کہتی ہوں ۔ تھوڑی دیر کے لئے ونود پر سے
میری عقیدت اُٹھ گئی ۔ یہی جی چاہتا تھا کہ چل کر کسُم کا منہ نوچ لوں ۔ خیریت
یہ ہوئی کہ دونوں میں بات چیت نہ ہوئی ۔ مگر جب ونود آکر بیٹھے ۔ تو آدھ
گھنٹے تک میں ان سے نہ بول سکی جیسے اِن کے الفاظ میں وہ جادو ہی نہ
تھا ۔ بذلہ سنجیوں میں وہ رس ہی نہ تھا ۔ اس وقت سے اب تک میرے
دل کی بے چینی نہیں گئی ۔ تمام رات مجھے نیند نہیں آئی ۔ آنکھوں کے سامنے
بار بار وہی نظارہ آتا تھا ۔ کسُم کو شرمندہ کرنے کے لئے کتنے منصوبے
باندھ چکی ہوں ۔

چندا ! مجھے آج تک یہ نہ معلوم تھا کہ میرا دل اس قدر کمزور ہے ۔ اگر
یہ خوف نہ ہوتا ۔ کہ ونود مجھے کم ظرف اور پست خیال سمجھیں گے ۔ تو میں اُن
سے صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کر دیتی ۔ میں تمام تر ان کی ہو کر انہیں
ہر پہلو سے اپنا بنانا چاہتی ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ دُنیا کا سب سے حسین
نوجوان میرے سامنے آجائے تو میں آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گی ۔ پھر ونود
کے دل میں میرے متعلق یہ خیال اور جذبہ کیوں نہیں ۔ ؟

چندا! پیاری بہن!! ایک ہفتہ کے لئے آجا۔ تجھ سے ملنے کے لئے دل بے چین ہو رہا ہے۔ اس وقت مجھے تیری ہمدردی اور مشورہ کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ یہ میری زندگی کا سب سے نازک موقع ہے۔ انہیں دس پانچ دنوں میں یا تو پارس ہو جاؤں گی یا مٹی۔ لو سات بج گئے۔ اور ابھی بال تک نہیں بنائے۔ ونود کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ کہیں آج پھر بدنصیب کسم اپنے برآمدہ میں نہ کھڑی ہو۔ ابھی سے دل کانپ رہا ہے۔ کل تو یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا تھا۔ کہ یونہی ہنس دی ہوگی لیکن اگر آج بھی وہی نظارہ سامنے آیا۔ تو اتنی آسانی سے دل کو نہ سمجھا سکوں گی۔

(تمہاری پدما)

(۲)

گورکھپور۔ ۵ر جولائی ۱۹۲۵ء

پیاری پدما!

بھلا ایک عرصہ بعد تمہیں میری یاد تو آئی۔ میں نے تو سمجھا تھا۔ شاید تم نے پرلوک یاترا کر لی۔ یہ اسی بے دردی کی سزا ہے جو کسم تمہیں دے رہی ہے۔ ۱۵ اپریل کو کالج بند ہوا۔ اور یکم جولائی کو آپ خط لکھتی ہیں۔ پورے ڈھائی مہینے بعد! وہ بھی کسم کی مہربانی سے! جس کسم کو تم کوس رہی ہو۔ اسے میں دعا دے رہی ہوں۔ اگر وہ بلائے ناگہانی کی طرح تمہارے راستہ میں نہ آکھڑی ہوتی۔ تو تمہیں میری یاد کیوں آتی۔؟ ونود کی تم نے جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ نہایت دلکش ہے۔ اور میں ایشور سے دعا مانگ رہی ہوں۔ کہ وہ دن جلد لائے۔ جب میں ان سے بہنوئی کے رشتہ سے ملوں۔ مگر دیکھنا کہیں "سول میرج" نہ کر لینا۔ شادی ہندو احکامات

کے بموجب ہی ہو۔ ہاں تمہیں اختیار ہے کہ جو سینکڑوں بیہودہ لغویات اور بیہودگیاں ہیں۔ ان کو نکال ڈالو۔ ایک قابل اور تعلیم یافتہ۔ سنسکرت دان پنڈت کو ضرور بلانا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بات بات پر ٹکے نکلوائے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ دیکھتا رہے کہ سب کچھ شاستروں کے احکامات کے بموجب ہو رہا ہے۔ یا نہیں۔

اچھا۔ اب مجھ سے پوچھو کہ اتنے دنوں خاموش کیوں رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے خاندان میں ہی اس عرصہ میں پانچ شادیاں ہوئیں براتوں کا تانتا لگا رہا۔ ایسا شاید ہی کوئی دن گیا ہو۔ کہ سَو مہمانوں سے کم رہے ہوں اور جب برات آجاتی تھی۔ تب تو ان کی تعداد پانچ پانچ سو تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ پانچوں لڑکیاں مجھ سے چھوٹی ہیں۔ اور میرا بس چلتا۔ تو ابھی تین چار سال تک نہ بولتی۔ لیکن میری سنتا کون ہے؟ اور غور کرنے پر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماں باپ کا لڑکیوں کی شادی کے لئے جلدی کرنا نامناسب نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر والدین بے وقت ہی مر جائیں تو لڑکی کی شادی کون کرے۔ بھائیوں کا کیا بھروسہ؟ اگر باپ نے کافی دولت چھوڑی ہے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن جیسا عام طور پر ہوتا ہے۔ کہ باپ قرضہ چھوڑ گئے۔ تو بہن بھائیوں پر بار ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی دیگر کتنے ہی ہندو رسوم کی مانند ہے۔ جب تک ہماری مالی حالت نہ درست ہوگی۔ یہ رسم بھی نہ مٹے گی۔

اب میرے 'بلیدان' کی باری ہے۔ آج کے پندرھویں دن یہ گھر میرے لئے بدیس ہو جائے گا۔ دو چار مہینہ کے لئے آؤں گی۔ تو مہمان کی طرح۔ میرے 'دلوذ' بنارسی ہیں۔ ابھی قانون پڑھ رہے ہیں۔ ان کے والد

نامی وکیل ہیں۔ سُنتی ہوں کئی گاؤں ہیں۔ کئی مکان ہیں۔ اچھی عزت ہے۔ میں نے ابھی تک بَر کو نہیں دیکھا۔ پتاجی نے مجھ سے دریافت کرایا تھا۔ کہ اگر خواہش ہو تو بَر کو بُلا دوں۔ لیکن میں نے کہدیا۔ کوئی ضرورت نہیں۔ کون گھر میں بہو بنے۔ تقدیر ہی کا سودا ہے۔ نہ پتاجی ہی کسی کے دل میں گھس سکتے ہیں۔ نہ میں ہی۔ اگر وہ ایکبار دیکھ ہی لیتی۔ یا ملاقات ہی کر لیتی۔ تو کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو پرکھ لیتے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم ایک دوسرے کا رنگ روپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس بات کا مجھے پُورا پورا یقین ہے۔ کہ پتاجی مجھ سے کم محتاط اور اہل نظر نہیں ہیں۔ ممکن ہے میرے دونوں بڑے بہنوئی حُسن کے پتلے نہ ہوں۔ مگر کوئی نازنین ان سے نفرت نہیں کر سکتی۔ میری بہنیں ان کے ساتھ نہایت لُطف سے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ پھر پتاجی میرے ہی ساتھ کیوں بے انصافی کریں گے۔ یہ بھی مانتی ہوں۔ کہ ہمارے سماج میں کچھ لوگوں کی زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ لیکن دنیا میں ایسا کونسا سماج ہے۔ جس میں دُکھی خاندان نہ ہو۔ اور پھر ہمیشہ مردوں کا ہی قصور نہیں ہوتا۔ زیادہ تر عورتیں ہی زہر کی گانٹھ ہوتی ہیں۔ میں تو شادی کو خدمت اور ایثار کا برت سمجھتی ہوں۔ اور اسی نام سے اس کو موسوم کرتی ہوں۔ ہاں میں تمہیں دلو دسے چھیننا نہیں چاہتی۔ لیکن اگر ۲۰ / جولائی تک تم دو دن کے لئے آسکو۔ تو مجھے جلا لو۔ جُوں جُوں اس بَرت کا دن قریب آ رہا ہے۔ مجھے ایک نامعلوم خوف لاحق ہو رہا ہے۔ مگر تم خود بیمار ہو میری دوا کیا کرو گی............ بہن! ضرور آنا۔

(تمہاری چندا)

(۳)

منصوری ۵ راگست ۱۹۲۵ء

پیاری چندا -!

سینکڑوں باتیں لکھنی ہیں۔ کس تمہید سے شروع کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ سب سے پیشتر تمہاری شادی کے موقعہ پر نہ پہنچ سکنے کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ میں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں! اور پیاری چندا کی شادی پر نہ آؤں۔ مگر اس کے عین تین دن پیشتر دلو دنے اپنے آپ کو مجھ پر نثار کر کے مجھے ایسا مفتون کر دیا کہ پھر مجھے کسی بات کی یاد نہ رہی۔ آہ! وہ محبت کے بحر عمیق سے نکلے ہوئے جذبات ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میں کھڑی تھی۔ اور دلو د میرے سامنے گھٹنے ٹیکے عرض التجا اور شوق کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ ایسا موقعہ زندگی میں ایک ہی بار آتا ہے۔ صرف ایک بار۔ مگر اس کی دلکش اور پر لطف یاد کسی بہشتی نغمہ کی مانند زندگی کے تار تار میں گونجتی رہتی ہے۔ تم اس لازوال خوشی کا احساس نہ کر سکو گی۔ ہاں! میں رونے لگی۔ نہیں کہہ سکتی کہ دل میں کیا کیا خیالات آئے۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔ شاید یہی مسرت کی حد ہے۔ میں کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔ تین چار دن سے دلو د کو آتے جاتے کسم سے باتیں کرتے دیکھتی تھی۔ کسم روزانہ نئے نئے زیورات سے ملبوس و مرصع رہتی تھی۔ اور کیا کہوں۔ ایک دن دلو د نے کسم کی ایک نظم مجھے سنائی اور ایک ایک لفظ پر سر دھنتے رہے۔ میں بھی غرور سے خاموش رہی۔ سوچا جب یہ اس چڑیل پر بُری طرح لٹو ہو رہے ہیں۔ تو مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ کہ ان کے لئے اپنا سر کھپاؤں۔ دوسرے دن جب وہ صبح آئے تو میں نے کہلا دیا کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔

جب انھوں نے مجھ سے ملنے کے لئے اصرار کیا تو مجبوراً مجھے کمرے میں آنا پڑا۔ دل میں تہیہ کرکے آئی تھی کہ صاف کہدوں گی۔ اب آپ نہ آیا کیجئے۔ میں آپ کے ناقابل ہوں۔ میں شاعرہ نہیں۔ شیریں سخن نہیں...... ایک مطوّل تقریر کا مواد خیالات کی صورت میں جمع ہوگیا تھا۔ مگر جب کمرے میں پہنچی اور ونود کی تشنہ کام نگاہیں۔ جذبات آلود خدوخال دیکھے تو از خود رفتہ ہوگئی۔ اس حالت وکیفیت کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی۔ ونود نے مجھے بیٹھنے بھی نہ دیا۔ میرے سامنے دو زانو ہو کر فرش پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے نشاط انگیز الفاظ میرے دل میں ایک پُر لطف ترنم پیدا کرنے لگے۔

ایک ہفتہ تیاری میں کٹ گیا۔ پاپا اور ماما پھولے نہ سماتے تھے۔ اور سب سے زیادہ خوش تھی کسم۔ وہی کسم جس کی صورت سے مجھے نفرت تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس پر رشک کرکے اس کے ساتھ نہایت ہی بے انصافی کی۔ اس کا دل صاف ہے۔ اس میں نہ رشک ہے نہ حسد۔ خدمت ہی اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس کے بغیر یہ سات دن کیوں کر کٹتے؟ میں تو کچھ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ کسم پر میں نے اپنا تمام بار چھوڑ دیا تھا۔ زیورات کا انتخاب۔ لباس کے رنگ اور قطع وبُرید میں اس کو کمال ہے۔ آٹھویں دن جب اس نے مجھے دلہن بنایا تو میں اپنا حُسن دیکھ کر متحیر ہوگئی۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قدر حسین نہ سمجھا تھا۔ غرور سے میری آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

اسی دن شام کو ونود اور میں دو مختلف ندیوں کی مانند سنگم پر مل کر ایک ہوگئے۔ سیر و تفریح کی تیاریاں پیشتر سے ہی ہو چکی تھیں۔ علی الصباح ہم منصوری کو روانہ ہوگئے۔ کسم پہنچانے کے لئے اسٹیشن تک آئی۔ اور

رخصت ہوتے وقت بہت روئی۔ اسے ساتھ لے چلنا چاہتی تھی۔ مگر نہ معلوم کیوں وہ راضی نہ ہوئی۔

منصوری نہایت دلکش جگہ ہے۔ کالے کالے متوالے بادل پہاڑیوں پر محصور سے نظر آتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اُمید کی لہروں کی مانند دل کو طراوت پہنچا رہی ہے۔ مگر مجھے ایسا یقین ہے۔ کہ ونود کے ساتھ میں کسی سنسان جنگل میں اتنے ہی سُکھ سے رہتی۔ انہیں پاکر اب مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔ بہن! تم اس مسرت سے لبریز زندگی کا خیال بھی نہ کرسکوگی۔ صبح ہوئی ناشتہ آیا۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا۔ گھوڑے تیار ہیں۔ نو بجتے بجتے سیر کرنے نکل گئے۔ کسی چشمہ یا جھرنے کے کنارے جا بیٹھے۔ وہاں پانی کی روانی کا نغمہ سن رہے ہیں۔ یا کسی پتھر کی شِلا پر بیٹھے ہوئے بادلوں کی بھاگ دوڑ کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ گیارہ بجتے بجتے لوٹے۔ کھانا تیار ملا۔ کھاپی کر میں پیانو پر بیٹھی۔ ونود کو موسیقی سے محبت ہے۔ خود بہت اچھا گاتے ہیں۔ جب میں گانے لگتی ہوں۔ تو ان پر وہ وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کہ جھومنے لگ جاتے ہیں۔ تیسرے پہر ہم گھنٹہ بھر تک آرام کرنے کے بعد کھیلنے یا کوئی کھیل دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد تھیٹر دیکھتے ہیں۔ اور وہاں سے لوٹ کر سو جاتے ہیں۔ نہ ساس کی گھڑکیاں ہیں۔ نہ نند کی کانا پھوسی نہ جیٹھانی کے طعنے۔ پر اس سُکھ میں بھی مجھے کبھی کبھی ایک شک سا ہوتا ہے۔ پھول میں کوئی کانٹا تو نہیں چھپا ہوا ہے؟ روشنی کے بطن میں تاریکی تو نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا شک کیوں پیدا ہوتا ہے۔ یہ لو پانچ بج گئے۔ ونود تیار ہیں۔ آج ٹینس کا میچ دیکھنے جانا

ہے۔ میں بھی جلدی سے تیار ہو جاؤں ۔ باقی باتیں پھر لکھوں گی۔

ہاں ! ایک بات تو بھولی ہی جا رہی ہے۔ اپنی شادی کا حال لکھنا۔ پتی دیو کیسے ہیں ؟ رنگ روپ کیسا ہے ؟ سُسرال گئیں یا ابھی میکہ میں ہی ہو۔ اگر سُسرال گئی ہو تو وہاں کے تجربات ضرور لکھنا۔ تمھاری خوب نمائش ہوئی ہوگی۔ گھر خاندان اور محلہ کی عورتوں نے گھونگٹ اُٹھا اٹھا کر خوب منہ دیکھا ہوگا۔ خوب امتحانات ہوئے ہوں گے۔ تمام باتیں بالتفصیل لکھنا۔ دیکھوں پھر کب ملاقات ہوتی ہے۔

(تمھاری پدما)

(۴)

گورکھپور۔ یکم ستمبر ۱۹۲۵ء

پیاری پدما ۔!

تمھارا خط دیکھ کر دل کو بہت تسکین ہوئی۔ تمھارے نہ آنے سے ہی میں سمجھ گئی تھی۔ کہ ونود بابو تمھیں ہر لے گئے۔ مگر خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ تم منصوری پہنچ گئی ہوگی۔ اب اس عیش و عشرت میں تمھیں غریب چندا کی یاد کیوں آنے لگی۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔ کہ شادی کے نئے اور پرانے آدرش میں کیا فرق ہے۔ ؟ تم نے اپنی پسند سے کام لیا۔ سُکھی ہو۔ میں لوک لاج کی لونڈی بنی رہی۔ نصیبوں کو رو رہی ہوں ۔!

اچھا ! اب میری بپتی سنو :۔ جہیز کے بکھیڑے سے تو کچھ مطلب نہیں۔ والد صاحب نے نہایت فراخ طبیعت پائی ہے۔ خوب دل کھول کر دیا ہوگا۔ مگر دروازے پر برات آتے ہی میرا امتحان شروع ہو گیا

بر کو دیکھنے کی کیسی زبردست خواہش تھی۔ مگر کیونکر دیکھتی۔ خاندان کی ناک نہ کٹ جاتی۔ دروازہ پر برات آئی۔ تمام لوگ دولہا کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا چھت پر سے دیکھوں۔ چھت پر گئی۔ مگر وہاں بھی کچھ نہ دکھائی دیا۔ ہاں! اس قصور پر اماں جی کی گھڑکیاں سننی پڑیں۔ میری جو بات ان لوگوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا الزام میری تعلیم پر ہوتا ہے۔ بیچارے والد صاحب میرے ساتھ نہایت ہمدردی کا اظہار فرماتے ہیں۔ مگر کس کس کا منہ پکڑیں۔ دروازہ چار تو یوں گزرا۔ اب بھانوروں کی تیاری ہونے لگی۔ جنواسے سے کپڑے اور زیورات کا ڈال آیا۔ بہن! کیا لکھوں۔ گھر کے تمام لوگ، برادری اور رشتہ داروں کی عورتیں اس پر اس طرح ٹوٹیں جیسے ان لوگوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کنٹھا تو لائے ہی نہیں۔ کوئی ہار کے نام کو روتا ہے۔ اماں جی تو سچ مچ رونے لگیں۔ گویا میں کنوئیں میں ڈال دی گئی۔ دل کھول کر صلواتیں سنائی جانے لگیں۔ مگر میں نے زیورات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں! جب کوئی ور کے متعلق کوئی بات کرتا تھا۔ تو میں غور سے سننے لگ جاتی تھی۔ معلوم ہوا کہ دبلے پتلے آدمی ہیں۔ رنگ سانولا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ہنس مکھ ہیں۔ ان خبروں سے درشن کی خواہش اور بھی بڑھتی جاتی تھی۔ جوں جوں بھانوروں کی ساعت قریب آتی جاتی تھی۔ میرا دل بے چین ہوتا جاتا تھا۔ گو میں نے ان کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ مگر دل ان کی جانب کچھ اس قدر کھنچتا تھا۔ کہ کیا کہوں۔ دل میں ایک ایسے عجیب و غریب محبت کا جوار اٹھ رہا تھا۔ کہ اس لطف کا مزہ کچھ دل ہی جانتا ہے۔ اس وقت اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے دشمنوں

کو کچھ ہوگیا ہے۔ تو میں باولی ہو جاتی۔ ابھی تک میں ان سے متعارف نہیں ہوئی۔ ان کی آواز تک سے بھی یہ بدنصیب کان ناآشنا ہیں لیکن دُنیائے حُسن کے بہترین مجسمہ میں بھی میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ اب وہی میرے سب کچھ ہیں۔

آدھی رات کے بعد بھانوز رہوئی۔ سامنے ہَون کنڈ تھا۔ دونوں جانب برہمن بیٹھے ہوئے تھے۔ چراغ جل رہا تھا۔ کُل دیوتا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ وید منتروں کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ فی الحقیقت دیوتا براجمان ہیں۔ اگنی۔ وایو۔ دیپک۔ نکشتر سب کے سب مجھے اس وقت دیوتا کی نورانیت سے منور نظر آتے تھے۔ اس نورانیت کا احساس مجھے پہلی بار ہوا۔ جب میں نے اگنی دیوتا کے سامنے سر جھکایا۔ تو یہ محض رسم کی پابندی نہ تھی۔ بلکہ میں اگنی دیوتا کو مجسم اپنے روبرو بہشتی نورانیت سے منور دیکھ رہی تھی۔ آخر بھانوریں بھی ختم ہوگئیں۔ لیکن پتی دیو کے درشن نہ ہوئے۔

اب آخری اُمید یہ تھی کہ صبح جب وہ کلیوا کے لئے بلائے جائیں گے اس وقت دیکھوں گی۔ اس وقت ان کے سر پر سہرا نہ ہوگا۔ سکھیوں کے ساتھ میں بھی جا بیٹھوں گی۔ اور خوب جی بھر کر دیکھوں گی۔ مگر کیا معلوم تھا۔ کہ قسمت آڑ میں کھڑی ہنس رہی ہے۔ صبح دیکھتی ہوں کہ جنواسے کے خیمے اُکھڑ رہے ہیں۔ بات کچھ نہ تھی۔ براتیوں کے ناشتہ کے لئے جو سامان بھیجا گیا تھا۔ وہ کافی نہ تھا۔ شاید گھی بھی خراب تھا۔ میرے پتا جی کو تو تم جانتی ہی ہو۔ کبھی کسی سے دبے نہیں۔ جہاں رہے شیر بن کر رہے بولے! "جلتے ہیں تو جلنے دو۔ منانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لڑکی

والوں کا دھرم ہے۔ براتیوں کی خاطر تواضع کرنا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دھمکی اور رُعب سے کام لیا جائے۔ گویا کسی آفیسر کا پڑا ؤپڑا تھا۔ اگر وہ اپنے لڑکے کی شادی کر سکتے ہیں۔ تو میں بھی اپنی لڑکی کی شادی کر سکتا ہوں۔

برات چلی گئی۔ اور میں پتی دیو کے درشن نہ کر سکی۔ تمام شہر میں ہلچل مچ گئی۔ مخالفین کو مضحکہ آرائی کا موقعہ مل گیا۔ والد صاحب نے بہت سا سامان جمع کر لیا تھا۔ وہ سب خراب ہو گیا۔ گھر میں جسے دیکھو وہ میری سُسرال والوں کو لعنت ملامت کرتا ہے۔ اُجڈ ہیں، لالچی ہیں، بدمعاش ہیں۔ مجھے ذرا بھی بُرا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن شوہر کے خلاف میں ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتی۔ ایک دن اماں جی بولیں۔ لڑکا بھی بے سمجھ ہے۔ وہ دودھ پیتا بچہ نہیں۔ قانون پڑھتا ہے۔ ڈاڑھی مونچھیں آگئی ہیں۔ اسے اپنے باپ کو سمجھانا چاہیئے تھا۔ کہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ مگر وہ بھیگی بلّی بنا رہا۔ میں دل ہی دل میں تلملا اُٹھی۔ کچھ بولی تو نہیں۔ پر اماں جی کو معلوم ضرور ہو گیا۔ کہ اس معاملہ میں ان سے متفق نہیں ہوں۔

بہن! میں تمہیں سے دریافت کرتی ہوں۔ جو حالت درپیش تھی ایسی حالت میں ان کا کیا دھرم تھا۔؟ اگر وہ اپنے والد اور دیگر لواحقین کا کہنا نہ مانتے۔ تو ان کی کتنی بڑی بے عزتی ہوتی۔ اس وقت انھوں نے وہی کیا جو ان کو کرنا چاہیئے تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کسی قدر معاملہ ٹھنڈا پڑنے پر وہ ضرور آئیں گے۔ میں ابھی سے ان کا راستہ دیکھنے لگی ہوں۔ چٹھی رساں خطوط لاتا ہے تو دل میں دھڑکن ہونے لگتی ہے۔ شاید ان خطوط میں اُن کا بھی کوئی خط ہو۔ بار بار سوچتی ہوں۔ کیوں نہ میں ہی ایک خط لکھوں۔ مگر شرم وحجاب مانع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر دس پانچ دن ان کا خط نہ آیا۔

یاد نہ آئے۔ تو حجاب غرور کی شکل اختیار کرے گا۔ کیا تم انھیں ایک خط نہیں لکھ سکتیں۔ سب کھیل بن جائے۔ کیا میری اتنی خاطر بھی نہ کروگی۔ مگر ایشور کے لئے کہیں اس خط میں یہ نہ لکھ دینا۔ کہ چندا نے یہ درخواست کی ہے۔ معاف کرنا۔ ایسی فاش غلطی کی تمھاری جانب سے اُمید کرکے میں تمھارے ساتھ بے انصافی کر رہی ہوں۔ مگر میں سمجھدار تھی ہی کب۔ ؟

(تمھاری چندا)

(۵)

منصوری۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء

پیاری چندا!

جس دن تمھارا خط ملا تھا۔ اس کے دوسرے دن ہی میں نے بنارس خط لکھ دیا تھا۔ اُس کا جواب بھی آگیا۔ شاید بابو جی نے تمہیں خط لکھا ہو۔ کچھ پُرانے خیال کے آدمی ہیں۔ میری تو اُن سے ایک دن بھی نہ نبھتی تم سے نبھ جائے گی۔ اگر میرے شوہر نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہوتا۔ بلا وجہ مجھ سے رُوٹھے ہوتے تو میں زندگی بھر ان کی صورت نہ دیکھتی۔ اگر کبھی آتے بھی تو کتوں کی مانند دھتکار دیتی مرد پر سب سے زیادہ حق اِس کی بیوی کا ہے۔ ماں باپ کو خوش کرنے کے لئے وہ بیوی کو ذلیل نہیں کرسکتا۔ تمھاری سُسرال والوں نے نہایت نفرت آمیز سلوک کیا۔ پُرانے خیال والوں کا غضب کا کلیجہ ہے۔ جو ایسی باتیں برداشت کرتے ہیں۔ اب اس رسم و رواج کے کرشمے دیکھو۔ جس کی تعریف میں تمھاری زبان نہیں تھکتی تھی۔ وہ دیوار بالکل کھوکھلی اور بوسیدہ ہو چکی ہے۔ ٹیپ ٹاپ سے کام نہ چلے گا۔ اس کی جگہ از سرِ نو دیوار بنانے کی ضرورت ہے۔

اچھا! اب میری کبھی رام کہانی سُن لو۔ مجھے ایسا شک ہو رہا ہے۔ کہ ونّو نے میرے ساتھ دغا کی۔ ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں جتنا میرا خیال تھا۔ صرف مجھے ٹھگنے کے لئے یہ سوانگ بھرا تھا۔ موٹر مانگے کی تھی۔ بنگلہ کا کرایہ ابھی تک نہیں دیا گیا۔ فرنیچر کرایہ کا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے فی الواقعہ مجھے دھوکا نہیں دیا۔ کبھی اپنی دولت کی ڈینگ نہیں ماری۔ لیکن طرزِ معاشرت کو ایسا بنا لینا کہ دوسروں کو خواہ تموّل کا دھوکا ہو۔ ایک قسم کا دھوکا ہی ہے۔ یہ سانگ اس لئے بنایا گیا تھا کہ کوئی شکار پھنس جائے۔ اب دیکھتی ہوں کہ ونّو مجھ سے اپنی اصلی حالت چھپانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ اور اپنے خطوط مجھے نہیں دیکھنے دیتے۔ کوئی ملنے آتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں بیرا سے پوچھتے ہیں کہ "کون ہے"؟ تم جانتی ہو۔ میں دولت کی لونڈی نہیں۔ میں تو صرف صاف دل چاہتی ہوں جس میں کام کرنے کا مادہ استقلال اور عزم صادق ہے۔ وہ آج نہیں تو کل ضرور دولتمند ہو گا۔ میں اس فریب سے جلتی ہوں۔ اگر ونّو مجھ سے اپنی دقتوں کا اظہار کر دیں۔ تو میں اُن کے ساتھ ہمدردی کروں گی۔ اُن کی مشکلات دور کرنے میں اُن کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ مجھ سے اس طرح پردہ کر کے یہ میری ہمدردی اور یکجہتی سے ہی ہاتھ نہیں دھوتے بلکہ میرے دل میں بدگمانی کا بیج بوتے ہیں۔ یہ فکر میرے لئے سوہانِ روح ہے۔ اگر انھوں نے اپنی حالت کا صاف صاف مجھ سے ذکر کر دیا ہوتا۔ تو میں منصوری کیوں آتی۔؟ لکھنؤ میں ایسی گرمی نہیں پڑتی۔ کہ انسان پاگل ہو جائے ان ہزاروں روپوں پر کیوں پانی پڑتا۔؟ سب سے زیادہ اہم تر مسئلہ روزمرہ کے اخراجات کا ہے۔ کئی جگہ درخواستیں بھیج رکھی ہیں۔ انھیں کے

جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ غالباً اس ماہ کے آخر تک کوئی جگہ مل جائے۔
پہلے تین چار سو ملیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر کام چلے گا۔؟ ڈیڑھ سو
تو پاپا میرے کالج کا خرچ دیتے تھے۔ اگر دس پانچ مہینہ جگہ نہیں ملی۔ تو
یہ کیا کریں گے۔؟ یہ فکر اور کلیجہ چھلنی کئے دیتا ہے۔ مشکل یہی ہے۔ کہ دونوں
مجھ سے پردہ رکھتے ہیں۔ اگر ہم دونوں بیٹھ کر مشورہ کر لیتے تو تمام
گتھیاں سلجھ جاتیں۔ مگر شاید یہ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے۔ شاید ان کا خیال
ہے کہ میں محض ریشمی گڑیا ہوں۔ جسے گوناگوں لباس، زیورات و خوشبویات
سے مرصع کرنا ہی کافی ہے۔ تھیٹر میں کوئی نیا تماشہ ہونے والا ہوتا ہے۔ تو
دوڑے ہوئے آ کر خبر دیتے ہیں۔ کہیں کوئی جلسہ ہو۔ کھیل ہو۔ سیر کا موقع
ہو۔ اس کی اطلاع مجھے بلا تامل دی جاتی ہے۔ اور نہایت ہی خوشی
کے ساتھ۔ گویا میں دن رات کھیل کود اور عیش جلسہ میں محو اور خوش رہنا
چاہتی ہوں۔ گویا میرے دل میں متانت و سنجیدگی کا گزر نہیں۔ یہ سراسر
میری تذلیل ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے تمام
حقوق پا کر خوش ہو سکتی ہوں۔ بس اس وقت اسی قدر کافی ہے۔ باقی پھر
لکھوں گی۔ تم اپنے حالات سے مطلع کرنا۔ مجھے اپنے لئے جس قدر فکر ہے۔
اس سے کم تمہارے لئے نہیں ہے۔ دیکھیں ہم دونوں کی کشتی کس کنارے
لگتی ہے۔ تم اپنی ویسی پانچ ہزار برس کی بوسیدہ و قدیم کشتی پر بیٹھی ہو۔ میں
نئے تیز رفتار موٹر بوٹ پر۔ موقع کوشش اور سائنس۔ تمام میرے ساتھ
ہیں۔ لیکن اگر کوئی ناگہانی آفت آ جائے تو میں اسی موٹر بوٹ پر ڈوبوں
گی۔ سال میں لاکھوں آدمی ریل سے کٹ کر مر جاتے ہیں۔ مگر کوئی
بیل گاڑی پر سفر نہیں کرتا۔ ریلوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بس   تمہاری پدما

(۶)

گورکھپور - ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء

پیاری پدما - !

کل تمھارا خط ملا - آج جواب لکھ رہی ہوں - ایک تم ہو - کہ مہینوں خاموش رہتی ہو - اس معاملہ میں تمہیں مجھ سے سبق لینا چاہیئے - وِنّود بابو پر تم بلا وجہ تہمت لگاتی ہو - تم نے پہلے ہی کیوں نہ اُن کی مالی حالت کی تصدیق کی - ؟ صرف ایک خوبصورت - رنگین مزاج - اپٹوڈیٹ - شیریں بیان نوجوان دیکھا - اور پھول اُٹھیں - اب بھی تمھارا ہی قصور ہے - تم اپنے طرز عمل - طرز معاشرت سے ثابت کردو - کہ تم میں متانت ، اور سنجیدگی کا جوہر بھی ہے پھر دیکھوں کہ ونّود بابو کیونکر تم سے پردہ رکھتے ہیں - اور بہن ! یہ تو انسانی فطرت ہے - ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اسے بڑا سمجھیں - اس سوانگ کو آخیر تک نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے - اور جو اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے - اُسی کی زندگی مبارک و کامیاب سمجھی جاتی ہے - جس زمانہ میں دولت ہی سب کچھ ہو - عزت - شہرت - نیک نامی حتیٰ کہ علم بھی دولت سے خریدا جا سکے - اُس زمانہ میں سوانگ بھرنا لازمی بات ہو جاتی ہے - حقوق قابلیت کا مُنہ تکتے ہیں - یہی سمجھ لو کہ ان دونوں میں پھول پھل کا تعلق ہے قابلیت کا پھول لگا - اور حقوق کا پھل آیا -

اس گیان اُپدیش کے بعد اب تمھارا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں - تم نے پتی دیو کے نام جو خط لکھا تھا اس کا بہت اچھا اثر ہوا - اس کے پانچویں دن بعد ہی شوہر کا خط مجھے ملا - بہن اُس خط کو پاکر مجھے کس قدر خوشی ہوئی - اس کا اندازہ تم کر سکتی ہو - معلوم ہوتا تھا اندھے کو آنکھیں مل گئی ہیں -

کبھی کوٹھے پر جاتی تھی کبھی نیچے آتی تھی ۔ سارے گھر میں کھلبلی پڑ گئی۔ تمہیں وہ خط نہایت مایوس کن معلوم دیتا ۔ میرے لئے وہ سنجیون منتر تھا ۔ چراغ امید تھا ۔ پرمیشور نے براتیوں کی زیادتی پر اظہار افسوس کیا تھا ۔ مگر بزرگوں کے سامنے وہ کیوں کر زبان کھول سکتے تھے ۔ پھر ہمارے گھر والوں نے بھی تو براتیوں کی جیسی خاطر و تواضع کرنی چاہیئے تھی ویسی نہیں کی ۔ آخر میں لکھا تھا " پیاری ! تم سے ملنے کا میں کس قدر مشتاق ہوں ۔ الفاظ میں اُس کا خاکہ کھینچنا دشوار ہے ۔ تمہاری خیالی شکل ہر وقت نگاہوں کے رُو برو رہتی ہے ۔ مگر خاندانی وضعداری کا پاس میرا فرض اوّلین ہے ۔ جب تک ماں باپ کا رُخ نہ پاؤں آ نہیں سکتا ۔ تمہارے ہجر میں خواہ میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے ۔ مگر والدین کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا ۔ ہاں ایک بات کا مستحکم عہد کر چکا ہوں کہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے ۔ نالائق اور ناخلف کہلاؤں ۔ گھر چھوڑنا پڑے ۔ مگر اپنی دوسری شادی نہ کروں گا مگر جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے معاملہ اتنا طول نہ کھینچے گا ۔ یہ لوگ تھوڑے دنوں میں نرم پڑ جائیں گے ۔ اور اس وقت میں آؤں گا ۔ اور اپنی دل کی مالکہ کو سر آنکھوں پر بٹھا کر لاؤں گا ۔"

بس اب میں مطمئن ہوں ، بہن ! مجھے اور کچھ نہ چاہیئے ۔ شوہر کی مجھ پر اتنی مہربانی ہے ۔ اس سے زیادہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں ۔ پریتم تمہاری چندا ہمیشہ تمہاری رہے گی ۔ تمہیں خوش رکھنا ہی اس کا دھرم ہے ۔ وہ جب تک جلتی رہے گی ۔ تمہارے پاک چرنوں میں لپٹی رہے گی ۔ اُسے مت بھولنا ۔

بہن آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں ۔ اب نہیں لکھا جاتا ۔

جواب جلد دینا۔

"تمہاری چندا"

(۷)

دہلی ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۶ء

پیاری بہن!

تجھ سے بار بار معافی مانگتی ہوں۔ پیروں پڑتی ہوں۔ میرے خط نہ لکھنے کا باعث کوتاہ قلمی نہ تھی۔ نہ سیر سپاٹے کی دھن تھی۔ روز سوچتی تھی۔ کہ آج لکھوں گی مگر کوئی نہ کوئی ایسی مصروفیت لاحق ہو جاتی۔ اور کسی ایسی مشکل کا سامنا ہوتا کہ دل پریشان ہو اٹھتا تھا۔ اور منہ لپیٹ کر پڑ رہتی تھی۔ تم مجھے اب دیکھو تو شاید پہچان نہ سکو۔ منصوری سے دہلی آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا۔ یہاں ونود کو تین سو روپے کی ایک جگہ مل گئی ہے۔ پورا مہینہ بازاروں کی خاک چھاننے میں گیا۔ ونود نے مجھے بحال آزادی دے رکھی ہے۔ میں جو چاہوں کروں۔ اُن سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ گرہستی کا تمام بار مجھ پر ڈال کر وہ بے فکر ہو گئے ہیں۔ ایسا بے فکر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ نہ حاضری کا خیال نہ ڈنر کا۔ بلایا تو آ گئے ورنہ بیٹھے ہیں۔ نوکروں سے بات چیت کرنے کی تو انھوں نے قسم کھالی ہے۔ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کروں تو میں۔ نکالوں تو میں۔ اُن سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ وہ میرے انتظام پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ عیب نکالیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جب میں بازار سے کوئی چیز لاؤں تو وہ بتائیں۔ کہ میں ٹھگی گئی۔ یا سستا لائی۔ میں چاہتی ہوں مہینہ کے خرچ کا بجٹ

بنلاتے ہوئے میرے اُن کے درمیان خوب بحث ہو۔ مگران ارمانوں میں سے ایک بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں نہیں سمجھتی اس طرح کوئی عورت کہاں تک انتظام خانہ داری میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ وکوڈ کے اس ایثار نے میرے خرچ کی ضرورتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اپنے شوق کی چیز کو خرید کرلاتے ہوئے برا معلوم ہوتا ہے کم از کم مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں کہ میں اپنے لئے کوئی چیز لاؤں تو وہ ناراض نہ ہوں گے۔ بلکہ خوش ہوں گے۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے۔ میرے شوق اور زیب و زینت کی اشیاء وہ خود لا کر دیں۔ اُن سے لینے میں جو سکھ ہے وہ جا کر لانے میں نہیں۔ پتاجی اب بھی مجھے پچاس روپے ماہوار دیتے ہیں۔ اُن روپوں کو میں اپنی ضرورتوں پر خرچ کر سکتی ہوں۔ لیکن نہ معلوم کیوں مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں وکوڈ یہ نہ سمجھیں کہ میں اُنہی کے روپے خرچ کئے ڈالتی ہوں۔ جو شخص کسی بات پر ناراض نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی بات پر خوش بھی نہیں ہو سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کس بات سے خوش اور کس بات سے ناراض ہوتے ہیں۔ میری حالت تو اس شخص کی سی ہے۔ جو بغیر راستہ جانے ہوئے اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے۔ تمہیں یاد ہو گا۔ کہ ہم دونوں حساب کا کوئی سوال نکالنے کے بعد کتنی بے چینی سے اُس کا جواب دیکھتے تھے۔ جب ہمارا جواب کتاب کے جواب سے مل جاتا تھا۔ تو کتنی دلی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ سمجھتی تھیں کہ محنت سپھل ہوئی۔ جن حساب کی کتابوں میں سوالات کے جواب نہ درج ہوتے تھے۔ ان کے سوالات حل کرنے کی ہماری خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔ خیال آتا تھا کہ محنت برباد جائے گی۔ میں روزانہ سوالات

نکالتی ہوں پر نہیں جانتی کہ جواب صحیح نکلا ہے یا غلط ؟ ذرا غور تو کرو۔ کہ میرے دل کی کیا حالت ہوگی ۔؟

تقریباً ایک ہفتہ ہوا۔ لکھنؤ کی مس رگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ لکھنؤ میں لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ اور میرے گھر بہت آتی جاتی ہیں۔ جہاں کسی کے سر میں خفیف سی شکایت ہوئی۔ مس رگ بلائی گئیں۔ جب پاپا میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے تو انھوں نے مس رگ کو پڑھایا تھا۔ اس کا احسان وہ اب تک مانتی ہیں۔ یہاں انھیں دیکھ کر اُن کی دعوت نہ کرنا حد درجہ کی نامہمان نوازی ہوتی۔ مس رگ نے دعوت منظور کر لی۔ اُس دن مجھے جتنی دقت کا احساس ہوا اس کا تذکرہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے کبھی انگریزوں کے ساتھ میز پر نہیں کھایا۔ اُن کی کھانے پینے کی تہذیب سے قطعی ناواقف تھی۔ میرا یہ خیال تھا کہ ونود مجھے تمام باتیں بتلا دیں گے۔ وہ برسوں انگریزوں کے ساتھ انگلینڈ میں رہ چکے ہیں۔ میں نے انہیں مس رگ کے آنے کی اطلاع بھی دیدی۔ مگر جیسے ان ذات شریف نے سنا ہی نہیں۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ میں ان سے کچھ نہ پوچھوں گی۔ یہی نہ ہوگا کہ مس رگ ہنسیں گی۔ بلا سے۔ بار بار اپنے اوپر جھنجھلاتی تھی۔ کہ کیوں مس رگ کو بلا بیٹھی۔ پڑوس کے بنگلوں میں ہمارے جیسے کئی خاندان رہتے ہیں۔ اُن سے مشورہ لے سکتی تھی۔ مگر یہ خیال ہوتا تھا۔ کہ یہ لوگ مجھے غیر مہذب تصور کریں گے۔ اپنی اس بے چارگی پر کچھ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ بالآخر مایوس ہو کر عقل سے کام لینا شروع کیا۔ دوسرے دن مس رگ آئیں۔ دعوت شروع ہوئی۔ میں دیکھتی تھی کہ ونود بار بار جھینپتے تھے۔

اور مس رگ بار بار ناک سکوڑتی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آداب کی پابندی نہیں ہو رہی ہے۔ میں شرم کے مارے مری جاتی تھی۔ بارے کسی طرح مشکل آسان ہوئی۔ اور بلا سر سے ٹلی۔ میں نے کان پکڑے۔ کہ اب کسی انگریز کی دعوت نہ کروں گی۔ اُس دن سے دیکھ رہی ہوں۔ کہ وِنّو مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے ہوئے ہیں۔ میں بھی نہیں بول رہی ہوں۔ وہ شاید سمجھتے ہیں کہ میری وجہ سے اُن کا خاکہ اُڑا۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ سچ کہتی ہوں جنڈا! گرہست کے ان جھنجھٹوں میں پڑ کر مجھے اب کسی سے ہنسنے بولنے کا موقع بھی نہیں ملتا! اِدھر مہینوں سے کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ اُن کی بھی یہ حالت ہو گئی ہے۔ کہ اب سینما یا تھیٹر کا نام تک نہیں لیتے۔ ہاں! میں چلوں تو وہ تیار ہو جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجویز اُن کی جانب سے ہو۔ میں صرف تعمیل حکم کروں۔ شاید اب وہ پہلے کی عادتیں چھوڑ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اپنے آپ میں خانہ داری کے انتظام کی قابلیت نہ دیکھ کر انھوں نے تمام بار مجھ پر ڈال دیا ہے۔ منصوری میں گھر کا تمام انتظام وہی کرتے تھے۔ دو ڈھائی مہینہ میں پندرہ سو خرچ کئے۔ کہاں سے لائے یہ میں اب تک نہیں جانتی۔ پاس تو شاید ہی کچھ رہا ہو ممکن ہے کہ کسی دوست سے لے لیا ہو۔ تین سو روپیہ ماہوار کی آمدنی میں تھیٹر اور سینما کا ذکر ہی کیا۔ پچاس تو مکان ہی کے نکل جاتے ہیں۔ میں اس جنجال سے تنگ آ گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ وِنّو سے کہدوں کہ یہ کھیل میرے چلائے نہ چلے گا۔ آپ تو دو ڈھائی گھنٹے یونیورسٹی میں کام کر کے چلین کریں۔ خوب ٹینس کھیلیں۔ خوب ناول پڑھیں۔

خوب سوئیں۔ میں صبح سے آدھی رات تک گھر کے جھنجھٹوں میں اُلجھی رہوں۔ کئی بار جھگڑنے کا ارادہ کیا۔ دل میں ٹھان کر ان کے پاس گئی بھی۔ لیکن اُن کی قربت میری ساری کدورتوں کو دور کر دیتی ہے۔ اُن کا شگفتہ چہرۂ زیبا۔ اُن کی بادۂ شباب سے سرمست آنکھیں۔ اُن کی شیریں بیانی مجھ پر ایک جادو کر دیتی ہے۔ اور میں مسحور ہو جاتی ہوں۔ اُن کی ایک ہم آغوشی میری تمام کلفتوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ان میں اتنا حسن۔ اتنی شیریں گفتاری اور اتنا بانکپن نہ ہوتا۔ تو شاید میں اُن سے لڑ جھگڑ لیتی۔ اپنی مشکلات کا اظہار کر سکتی۔ اس حالت میں انھوں نے مجھے بھیڑ بنا لیا ہے۔ مگر اس مایا جال کو توڑنے کا موقع تلاش کر رہی ہوں۔ ایک طرح پر تو میں اپنی خودداری کھو چکی ہوں۔ میں کیوں ہر بات میں کسی کی ناراضگی سے ڈرتی رہتی ہوں۔ مجھ میں یہ جذبہ کیوں نہیں آتا۔ کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں وہ ٹھیک ہے۔ میں کسی کا منہ کیوں دیکھا کرتی ہوں۔؟ اپنی اس کمزوری پر مجھے اقتدار حاصل کرنا ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ اب اس وقت رخصت چاہتی ہوں۔ اپنے یہاں کے حالات لکھنا۔ جی لگا ہے۔؟

(تمہاری پدما)

(۸)

بنارس

پیاری پدما۔!

تمہارا خط پڑھ کر مجھے کچھ دُکھ ہوا۔ کچھ ہنسی آئی۔ کچھ غصہ آیا۔ تم کیا چاہتی ہو؟ یہ تمہیں خود معلوم نہیں۔ تم نے آئیڈیل شوہر پایا ہے۔

توہمات سے دل کو بے چین نہ کرو۔ تم آزادی کی خواستگار تھیں۔ وہ تمہیں مل گئی۔ دو آدمیوں کے لئے تین سو کم نہیں ہوتے۔ اس پر ابھی تمہارے پاپا بھی سو روپے دیئے جاتے ہیں۔ اب اور کیا چاہیئے؟ مجھے خوف ہے کہ تمہارا دل پریشان اور منتشر ہو گیا ہے۔ میرے پاس تمہارے لئے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں۔

میں ۱۵ تاریخ کو بنارس آگئی۔ پتی دیو خود ہی مجھے رخصت کرانے گئے تھے۔ گھر سے چلتے ہوئے بہت روئی۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ لڑکیاں جھوٹ موٹ رویا کرتی ہیں۔ پھر میرے لئے تو والدین کی جدائی کوئی نئی بات نہ تھی۔ گرمی، دسہرہ اور بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد چھ برس سے اس جدائی کو محسوس کر رہی تھی۔ کبھی آنکھوں میں آنسو نہ آئے تھے۔ سہیلیوں سے ملنے کی کی خوشی ہوتی تھی۔ مگر اس بار تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی اندر سے دل کو کھینچے لیتا ہے۔ اماں جی کے گلے سے لپٹ کر تو میں اس قدر روئی کہ مجھے غش آگیا۔ بابوجی کے پیروں پر لوٹ کر رونے کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ ہائے! وہ رونے کی خوشی! اس وقت بابوجی کے چرنوں سے لپٹ کر رونے کے لئے میں اپنی جان تک دے دیتی۔ یہی رونا آتا تھا۔ کہ میں نے ان کے لئے کچھ نہ کیا۔ میری پرورش اور پرداخت میں انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میں جنم کی مریضہ ہوں۔ روز ہی بیمار رہتی تھی۔ اماں جی رات رات بھر مجھے گود میں لئے ہی بیٹھی رہتی تھیں۔ بابوجی کے کندھوں پر چڑھ کر اُچھلنے کودنے کی یاد مجھے اب بھی آتی ہے۔ انھوں نے کبھی مجھے کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ جہاں کبھی میرے سر میں درد ہوا۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے

تھے۔ دس برس کی عمر تک تو یوں گئے۔ چھ سال ڈیرہ دُون میں گزرے۔ اور جب اس قابل ہوئی کہ ان کی کچھ خدمت کروں۔ تو اس طرح پر جھاڑ کر الگ ہو گئی۔ کل آٹھ مہینے تک ان کے چرنوں کی سیوا کر سکی۔ اور انہیں آٹھ مہینوں کو زندگی کا ما حصل سمجھتی ہوں۔ ایشور سے یہی دعا ہے۔ کہ میرا جنم پھر اسی گود میں ہو۔ اور پھر اُسی بے مثل پدری محبت کا لطف اُٹھاؤں۔

شام کے وقت گاڑی سٹیشن سے روانہ ہوئی۔ میں زنانہ درجہ میں تھی۔ اور لوگ دوسرے کمرے میں تھے۔ اس وقت یکایک مجھے پتی دیو کو دیکھنے کی زبردست خواہش ہوئی۔ تسکین، تشفی، ہمدردی اور پناہ کے لئے دل بیچین ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی قیدی کالے پانی جا رہا ہو۔

گھنٹہ بھر بعد ایک سٹیشن پر گاڑی رُکی۔ میں کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ اور کسی نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کمرے میں ایک عورت بھی نہ تھی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ تو ایک مرد۔ فوراً منہ چھپا لیا۔ اور بولی۔ آپ کون ہیں؟ یہ زنانہ کمرہ ہے۔ مردانے کمرے میں جا بیٹھے۔

مرد نے کھڑے کھڑے کہا۔ میں تو اسی کمرہ میں بیٹھوں گا۔ مردانہ کمرہ میں بھیڑ بہت ہے۔

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ نہیں آپ اس میں نہیں بیٹھ سکتے۔

"میں تو بیٹھوں گا۔"

"آپ کو نکلنا پڑے گا۔ فوراً چلے جایئے ورنہ میں زنجیر کھینچ

لوں گی ۔"

"آخر میں بھی آدمی ہوں جانور نہیں ہوں۔ اتنی جگہ پڑی ہے ۔ آپ کا اس میں کیا ہرج ہے ۔"؟

گاڑی نے سیٹی دیدی ۔ میں اور بھی گھبرا کر بولی ۔ آپ نکلتے ہیں ۔ یا میں زنجیر کھینچوں ۔ ؟

مرد نے مسکرا کر کہا ۔ آپ نہایت غصہ ور معلوم ہوتی ہیں ۔ ایک غریب شخص پر آپ کو ذرا بھی ترس نہیں آتا ۔

گاڑی چلدی ۔ فرط غصہ اور شرم سے مجھے پسینہ آگیا ۔ فوڑا دروازہ کھول کر بولی .... اچھی بات ہے ۔ آپ بیٹھئے میں جاتی ہوں ۔

بہن ! سچ کہتی ہوں ۔ مجھے اس وقت قطعی خوف نہ تھا ۔ جانتی تھی ۔ گرتے ہی مر جاؤں گی ۔ پر ایک اجنبی کے ساتھ تنہا بیٹھنے سے مر جانا اچھا تھا ۔ میں نے ایک پیر لٹکایا ہی تھا کہ اس شخص نے میری باہنہ پکڑ لی ۔ اور اندر کھینچتا ہوا بولا ۔

اب تک تو مجھے آپ نے کالے پانی بھیجنے کا سامان کر دیا تھا ۔ یہاں کوئی اور تو نہیں ہے ۔ ؟ پھر آپ اس قدر کیوں گھبراتی ہیں ؟ بیٹھئے ۔ ذرا ہنسئے بولئے ۔ اگلے سٹیشن پر اتر جاؤں گا ۔ اتنی دیر تک تو نظر عنایت سے محروم نہ کیجئے ۔ آپ کو دیکھ کر دل بے اختیار کھینچا جا رہا ہے ۔ کیوں ایک غریب کا خون سر پر لیجئے گا ۔

میں نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا ۔ تمام جسم کانپنے لگا ۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اس وقت اگر میرے پاس کوئی چھری یا کٹار ہوتی ۔ تو میں ضرور اسے نکال لیتی ۔ اور مرنے مارنے کے لیئے تیار ہو جاتی ۔ مگر اس

حالت میں غصہ سے ہونٹ چبانے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔؟ آخر جھلانا فضول سمجھ کر ضبط کرنے کی کوشش کرکے بولی۔ آپ کون ہیں۔؟

اس نے بیباکی سے کہا "تمھارے پریم کا بھکاری"

اگر آپ میرے عاشق ہیں۔ تو کم از کم اتنی بات مانیئے کہ اگلے سٹیشن پر اُتر جایئے۔ مجھے بدنام کرکے آپ کچھ نہ پائیں گے۔ اتنا کرم کیجئے۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر یہ بات کہی۔ میرا گلا بھر آیا تھا۔ اس شخص نے دروازہ کی طرف جاکر کہا۔ اگر آپ کا یہی حکم ہے۔ تو لیجیئے جاتا ہوں۔ یاد رکھیئے گا۔

اس نے دروازہ کھول کر ایک پاؤں آگے بڑھایا۔ مجھے معلوم ہوا۔ وہ کودنے جا رہا ہے۔ بہن! نہیں کہہ سکتی۔ کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگئی۔ میں نے بجلی کی طرح لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اپنی طرف زور سے کھینچ لیا۔

اس نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ کیوں کھینچ لیا۔ میں تو جا رہا تھا۔

"اگلا سٹیشن آنے دیجیے۔"

جب آپ بھگا ہی رہی ہیں۔ تو جس قدر جلد بھاگ سکوں اتنا ہی اچھا ہے۔

"میں یہ کب کہتی ہوں کہ آپ چلتی گاڑی سے کود پڑیئے۔"

"اگر مجھ پر نظر عنایت ہے۔ تو ذرا ایک بار اپنا دیدار دکھا دیجیئے۔"

"اگر آپ کی بیوی سے کوئی دوسرا شخص ایسی باتیں کرتا۔ تو آپ کو کیسا معلوم ہوتا۔"؟

مرد نے بھویں چڑھا کر غضبناک لہجہ میں کہا۔ میں اس کا خون پی جاتا۔

میں نے بلا جھجک کہا۔ تو پھر آپ کے ساتھ میرے شوہر کیا سلوک کریں گے۔ یہ بھی آپ سمجھتے ہوں گے۔

پیاری! تم اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہو۔ تمہیں شوہر کی مدد کی ضرورت ہی نہیں۔ اب آؤ۔ میرے گلے سے لگ جاؤ۔ میں ہی تمہارا خوش نصیب شوہر ہوں۔

میرا دل اُچھل پڑا۔ ایک بار منہ سے نکلا...... آ...... آپ......!!
اور میں دُور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ایک ساتھ لمبا گھونگٹ کھینچ لیا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

شوہر نے کہا! اب یہ شرم اور پردہ کیسا!؟

میں نے کہا۔ آپ بڑا چھل کرتے ہیں۔ اتنی دیر تک رُلانے میں کیا مزہ آیا۔؟

"اتنی دیر میں میں نے تمہیں جتنا پہچان لیا۔ اتنا گھر کے اندر شاید برسوں میں بھی نہ پہچان سکتا۔ کیا تم گاڑی سے سچ مچ کود پڑتیں!؟"

"ضرور"

"بڑی خیریت ہوئی۔ مگر یہ مذاق بہت دنوں یاد رہے گا۔"

میرے شوہر کا قد اوسط۔ رنگ سانولا۔ چہرہ پر چیچک کے داغ اور دُبلے پتلے آدمی ہیں۔ میں نے ان سے کہیں خوبصورت شخص دیکھے ہیں۔ پر میرا دل اندر ہی اندر کس قدر خوشی کا احساس کر رہا تھا۔ کتنی روحانی آسودگی معلوم ہوتی تھی، اس کا ذکر بیان سے باہر ہے۔

میں نے پوچھا "گاڑی کب تک پہنچے گی"؟

"شام کو پہنچ جائیں گے"

میں نے دیکھا۔ شوہر کا چہرہ کچھ اُداس ہو گیا ہے۔ وہ دس منٹ تک باہر کی طرف خاموش بیٹھے ہوئے تاکتے رہے۔ میں نے صرف باتوں میں لگانے کے لئے ہی یہ غیر ضروری سوال کیا تھا۔ لیکن جب وہ قطعی خاموش ہو رہے۔ تو میں نے پھر نہیں چھیڑا۔ پاندان کھول کر پان بنانے لگی۔

یکایک انھوں نے کہا "چندرا ایک بات کہوں"؟

میں نے کہا "ہاں! ہاں! شوق سے کہئے"

انھوں نے سر جھکا کر شرماتے ہوئے کہا۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ تم اس قدر حسین ہو۔ تو میں تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ اب تمہیں دیکھ کر مجھے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں نے تمہارے ساتھ بے انصافی کی ہے میں کسی طرح تمہارے قابل نہ تھا۔

میں نے پان کا بیڑا انہیں دیتے ہوئے کہا۔ ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آپ میرے سب کچھ ہیں۔ میں آپ کی داسی بن کر اپنے آپ کو دھنیہ سمجھتی ہوں۔

دوسرا اسٹیشن آگیا۔ گاڑی رُکی۔ شوہر چلے گئے۔ جب جب گاڑی رُکتی تھی۔ وہ آکر دو چار باتیں کر جاتے تھے۔ شام کو ہم لوگ بنارس پہنچ گئے۔ مکان ایک گلی میں ہے۔ اور میرے گھر سے بہت چھوٹا ہے۔ ان چند دنوں میں یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ساس جی کا مزاج کچھ خشک سا ہے۔ لیکن ابھی کسی کے بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ پھر لکھوں گی۔ مجھے اس کا فکر نہیں کہ گھر کیسا ہے؟ مالی حالت

کیسی ہے۔؟ ساس سُسر کیسے ہیں۔؟

میری خواہش ہے کہ یہاں سب کے سب مجھ سے خوش رہیں۔ پتی دیو کو مجھ سے محبت ہے۔ یہ میرے لئے کافی ہے۔ مجھے اور کسی بات کی پرواہ نہیں۔ تمہارے بہنوئی جی کا میرے پاس برابر آنا ساس جی کو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتی ہیں کہیں یہ سر نہ چڑھ جائے۔ یہ نامہربانی ان کی مجھ پر کیوں ہے۔ نہیں کہہ سکتی۔ پر اتنا جانتی ہوں۔ کہ اگر وہ اس بات سے ناراض ہوتی ہیں تو ہماری بھلائی کے لئے۔ وہ ایسی کوئی بات کیوں کریں گی۔ جس میں ہمارا فائدہ نہ ہو۔ اپنی اولاد کی بدخواہ کوئی ماں نہیں ہوسکتی۔ مجھ میں ہی کوئی بُرائی انہیں نظر آتی ہوگی۔ دو چار دن میں آپ ہی معلوم ہو جائے گی۔ اپنے یہاں کے حالات لکھنا۔ جواب کی امید ایک مہینہ سے پیشتر تو ہے نہیں۔ یوں تمہاری خوشی۔

(تمہاری چندا)

(۹)

دہلی یکم جنوری ۱۹۲۶ء

پیاری بہن!

تمہاری پہلی ملاقات کا حیرت انگیز بیان پڑھ کر دل کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ مجھے تمہارے اوپر حسد ہو رہا ہے۔ میں نے سمجھا تھا۔ تمہیں مجھ پر حسد ہوگا۔ لیکن پانسہ اُلٹا ہو گیا۔ تمہیں ہر چہار طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ میں جدھر نظر ڈالتی ہوں۔ خشک ریت اور اکھنڈ ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ خیر اب کچھ میرے حالات سنو۔!

دلو دکا یہ فلسفہ اب ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ کچھ عجیب و غریب

شخص ہیں۔ گھر میں آگ لگے۔ پتھر پڑے۔ ان کی بلا سے۔ انہیں مجھ پر ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ میں صبح سے شام تک گھر کے جھنجھٹوں میں کڑھا کروں۔ انھیں کچھ پرواہ نہیں۔ ایسا بے درد شخص کبھی نہیں دیکھا تھا انھیں تو کسی جنگل میں تپسیا کرنی چاہیئے تھی۔ ابھی تو خیر دو ہی آدمی ہیں۔ لیکن کہیں بال بچے ہو گئے۔ تب تو میں بے موت مر جاؤں گی۔ ایشور نہ کرے۔ کہ میں اس سخت مصیبت کا شکار ہوں۔

چندا! مجھے اب دل سے یہ لگن ہے۔ کہ کسی طرح ان کی یہ سمادھی توڑ دوں۔ مگر کوئی تدبیر ٹھیک نہیں پڑتی۔ ایک دن میں نے اُن کے کمرے کے لیمپ کا بلب توڑ دیا۔ کمرہ اندھیرا پڑا رہا۔ آپ سیر کرکے آئے تو کمرے میں اندھیرا دیکھا۔ مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہہ دیا کہ بلب ٹوٹ گیا ہے۔ آپ کھانا کھا کر سیدھے میرے کمرے میں آکر لیٹ گئے۔ اور ناولوں کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نہ معلوم وہ باقاعدگی کہاں چلی گئی۔ تمام دن گزر گیا۔ آپ کو بلب لگوانے کی کوئی فکر نہیں۔ آخر مجھ کو ہی بازار سے لانا پڑا۔

ایک دن میں نے جھنجھلا کر رسوئیے کو نکال دیا۔ سوچا جب لالہ جی رات بھر بھوکے سوئیں گے۔ تب آنکھیں کھلیں گی۔ مگر اس بھلے آدمی نے پوچھا تک نہیں۔ چائے نہ ملی۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ٹھیک دس بجے آپ نے کپڑے پہنے۔ ایک بار رسوئی خانہ کی جانب جاکر دیکھا۔ سناٹا تھا۔ بس چل دیئے۔ انہیں اتنا تو کہنا چاہیئے۔ مہاراج کہاں گئے۔ کیوں گئے۔؟ اب کیا انتظام ہوگا۔؟ کون کھانا پکائے گا۔ کم از کم اتنا تو مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ کہ اگر تم نہیں پکا سکتیں تو بازار ہی سے کچھ منگا لو۔

جب چلے گئے تو مجھے سخت رنج ہوا۔ رائل ہوٹل سے کھانا منگوایا۔
اور نوکر کے ہاتھ کالج بھیج دیا۔ پر خود بھوکی ہی رہی۔ دن بھر بھوک کے
مارے بُرا حال تھا۔ سر میں درد ہونے لگا۔ آپ کالج سے آئے۔ اور
مجھے پڑے دیکھا۔ تو ایسے پریشان ہوئے گویا میں سخت بیمار ہوں۔
اسی وقت ایک ڈاکٹر بھیجا۔ ڈاکٹر آئے۔ آنکھ دیکھی، زبان دیکھی۔ حرارت
دیکھی۔ لگانے کی دوا الگ دی۔ پینے کی الگ۔ آدمی دوا لینے گیا۔
لوٹا تو بارہ روپے کا بل بھی تھا۔ مجھے ان باتوں پر ایسا غصہ آرہا تھا۔
کہ کہاں بھاگ کر چلی جاؤں۔ اس پر طُرہ یہ کہ آپ کُرسی ڈال کر میری
چارپائی کے پاس بیٹھ گئے۔ اور دم دم بھر پر دریافت کرنے لگے۔
کیسی طبیعت ہے۔ درد کچھ کم ہوا۔ یہاں بھوک کی شدت سے
آنتیں شور مچا رہی تھیں۔ دوا ہاتھ سے چھوئی تک نہیں۔ آخر جھک
مار کر میں نے پھر نوکر سے کھانا منگایا۔ پھر چال اُلٹی پڑی۔ میں
ڈری۔ کہ کہیں صبح پھر یہ حضرت ڈاکٹر کو نہ بلا بیٹھیں۔ اس لئے صبح
ہوتے ہی ہار کر پھر گھر کے کام دھندے میں لگی۔ اسی وقت ایک
دوسرا مہاراج بلایا۔ اپنے پُرانے رسوئیے کو بے قصور نکال کر بطور
سزا ایک کاٹھ کے اُلّو کو رکھنا پڑا۔ جو معمولی روٹیاں بھی نہیں پکا سکتا
تھا۔ دونوں وقت دو دو گھنٹے اس رسوئیے کو سکھانے میں لگ جاتے
ہیں۔ اسے اپنے کھانا پکانے پر اس قدر غرور ہے کہ میں خواہ کتنا ہی
بک جھک کیوں نہ کروں۔ مگر وہ اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس پر طُرہ یہ
کہ بیچ بیچ میں مُسکرانے بھی لگتا ہے۔ گویا زبانِ حال سے کہتا ہے۔
کہ تم ان باتوں کو کیا جانو۔ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی جاؤ۔ جلانے چلی تھی

ونود کو اور خود جل گئی۔ روپے جو خرچ ہوئے۔ وہ تو ہوئے ہی۔ ایک اور جنجال میں پھنس گئی۔ میں خوب جانتی ہوں کہ ونود کا ڈاکٹر کو بلانا۔ یا میرے پاس بیٹھے رہنا صرف دکھاوا تھا۔ ان کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی۔ دل میں ذرا بھی بے چینی نہ تھی۔

چندرا! مجھے معاف کرنا۔ میں نہیں جانتی کہ ایسے شخص کے پالے پڑ کر تمہاری کیا حالت ہوتی؟ پر میرے لئے اس حالت میں رہنا ناقابل برداشت ہے۔ آگے جو حال میں سُنانے والی ہوں اسے سنکر تم ناک بھوؤیں سکوڑو گی۔ مجھے کوسوگی، کلنکنی کہو گی۔ جو چاہو کہو مجھے پرواہ نہیں آج چار دن ہوئے ہیں نے "تریا چرتر" کا ایک نیا تماشہ کیا۔ ہم دونوں سینما دیکھنے گئے تھے۔ وہاں میرے پاس ہی ایک بنگالی بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ ونود سینما میں اس طرح بیٹھتے ہیں۔ گویا عالم استغراق میں ہیں۔ نہ بولنا نہ چالنا۔ فلم اس قدر خوبصورت تھا۔ ایکٹنگ اتنا باکمال اور زندگی بخش۔ کہ میرے منہ سے بار بار آفرین و مرحبا کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ بنگالی بابو کو بھی بڑا لطف آرہا تھا۔ ہم دونوں اس فلم پر تنقید کرنے لگے۔ وہ فلم کے جذبات پر ایسی تنقید کرتا تھا کہ دل بیخود ہوا جاتا تھا۔ فلم سے زیادہ لطف مجھے اس کی گفتگو میں آرہا تھا۔

بہن! سچ کہتی ہوں شکل وصورت کے لحاظ سے وہ ونود کے تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر صرف ونود کے جلانے کے لئے میں اس سے مُسکرا مُسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے سمجھا کوئی شکار پھنس گیا۔ انٹرول میں جب وہ باہر جانے لگا۔ تو میں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر ونود اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔

میں نے کہا: باہر چلتے ہو۔ میری تو بیٹھے بیٹھے کمر دکھ گئی:
ولنوذ بولے: ہاں ہاں چلو، اِدھر اُدھر ٹہل آئیں!
میں نے لاپرواہی سے کہا۔ اگر تمہارا جی نہیں چاہتا۔ تو نہ چلو، میں مجبور نہیں کرتی،
ولنوذ پھر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولے "اچھی بات ہے۔"
میں باہر آئی تو بنگالی بابو نے پوچھا۔ کیا آپ یہیں کی رہنے والی ہیں ـــ ؟
"میرے شوہر یہاں یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں"
"اچھا یہ آپ کے شوہر ہیں۔ عجیب شخص ہیں۔"
"آپ کو تو شاید میں نے یہاں پہلی ہی دفعہ دیکھا ہے"
"ہاں میرا مکان تو بنگال میں ہے۔ کچن پور کے مہاراجہ کا پرائیویٹ سکریٹری ہوں۔ مہاراجہ صاحب وائسرائے سے ملنے آئے ہیں۔
"تو ابھی دو چار دن رہیئے گا" ؟
"جی ہاں! اُمید تو کرتا ہوں۔ رہوں تو سال بھر رہ جاؤں۔ جاؤں تو دوسری گاڑی سے چلا جاؤں۔ ہمارے مہاراجہ صاحب کا کچھ ٹھیک پتہ نہیں۔ یوں نہایت خلیق اور ملنسار شخص ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"
یہ باتیں کرتے کرتے ہم ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ بابو نے چائے اور ٹوسٹ لیا۔ اور میں نے صرف چائے لی۔
"تو اسی وقت آپ کا مہاراجہ صاحب سے تعارف کرا دوں۔

آپ کو تعجب ہو گا۔ کہ صاحب تاج و تخت میں بھی اتنی انکساری ہو سکتی ہے۔ ان کی باتیں سن کر آپ مسحور ہو جائیں گی۔"

میں نے آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر کہا۔ جی نہیں۔ پھر کسی دن پر رکھئے۔ آپ سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔ لیجئے اتنی باتیں ہو گئیں۔ اور آپ کا نام تک نہ پوچھا۔

بابو نے اپنا نام بھون موہن داس گپتا بتایا۔ میں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

میں نے شرارت کے انداز سے پوچھا۔ کیا آپ کی اہلیہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔؟

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ میں ابھی کنوارا ہی ہوں۔ اور شاید کنوارا ہی رہوں۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ اچھا تو آپ بھی عورتوں سے بھاگنے والے اشخاص میں سے ہیں۔

"جی ہاں! میں ان بدنصیبوں میں ہوں۔ جو ایک بار مایوس ہو کر پھر اس کا امتحان نہیں کرتے۔ حسن کی تو دنیا میں کمی نہیں۔ مگر حسن اور صفات کی یک جہتی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جس نازنین سے مجھ کو محبت تھی۔ وہ آج ایک نہایت دولت مند وکیل کی بیوی ہے۔ میں غریب تھا۔ اس کی سزا مجھے یہ ملی کہ تمام زندگی نہ بھولے گی۔ سال بھر تک جس کی اُپاسنا کی جب اس نے مجھے دولت پر قربان کر دیا۔ تو اب اور کیا امید رکھوں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ آپ بہت جلد ہمت ہار گئے۔

کھوسن نے سامنے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے آج تک کوئی ایسا دلاور شخص نہیں دیکھا۔ جسے عورتوں سے شکست فاش نہ ملی ہو۔ یہ دل پر چوٹ کرتی ہیں۔ اور دل ایک ہی گہری چوٹ برداشت کرسکتا ہے۔ جس نازنین نے میری محبت کو حقیر سمجھ کر ہیروں سے کچل دیا۔ اسے میں دکھانا چاہتا ہوں کہ میری آنکھوں میں دولت کتنی حقیر شے ہے۔ یہی میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ میں اپنی زندگی کو اسی دن مبارک اور کامیاب سمجھوں گا۔ جب بملا کے مکان کے سامنے میرا بلند و بالا....... عظیم الشان محل ہوگا۔ اور اس کا شوہر مجھ سے ملنے میں اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔

میں نے نہایت متانت و سنجیدگی سے کہا۔ یہ تو کوئی بہت بلند و بالا آدرش نہیں۔ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں۔ کہ بملا نے صرف دھن و دولت کے لئے آپ کو چھوڑا۔ ممکن ہے اس کے کچھ اور بھی اسباب ہوں۔ ماں باپ نے اس پر دباؤ ڈالا ہو۔ یا اپنے ہی میں اس کو کوئی نقص نظر آیا ہو۔ جس سے آپ کی زندگی دکھ سے بھر جاتی۔ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں۔ کہ عیش محبت سے محروم ہو کر آپ اس قدر دکھی ہوئے ہیں۔ اسی محبت سے محروم ہو کر وہ سکھی ہوئی ہوگی۔ ممکن تھا کوئی دولتمند بیوی پا کر آپ بھی پھسل جاتے۔

کھوسن نے زور دے کر کہا۔ یہ غیر ممکن ہے۔ ناممکن ہے۔ میں اس کے لئے دنیا کا تاج و تخت قربان کر دیتا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ہاں اس وقت آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایسے امتحان میں پڑ کر آپ کی کیا حالت ہوتی۔؟ اسے آپ یقین کے ساتھ

نہیں بتا سکتے۔ سپاہی کی بہادری کا ثبوت اس کی تلوار ہے۔ اس کی زبان نہیں۔ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھئے۔ کہ آپ کو اس امتحان میں نہیں پڑنا پڑا۔ وہ محبت محبت نہیں، جو انتقام کی آڑ لے۔ محبت کی ابتدا کشادہ دلی ہے اور انتہا بھی۔ ممکن ہے آپ کو اب بھی کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے۔ جو بملا کی طرف سے آپ کو نرم کردے۔

بھون خیال میں غوطہ زن ہو گئے۔ ایک منٹ کے بعد انھوں نے سر اُٹھایا اور بولے۔ مسز ونود! آپ نے مجھے آج ایسی بات سمجھادی۔ جو آج تک میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ میرے دل میں کبھی اس امر کا احساس بھی نہیں ہوا۔ میں اتنا لاپرواہ کیوں ہو گیا۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ اگر محبت کے بلند و بالا نصب العین کا کسی کو احساس ہے۔ اور کوئی اسے بخوبی نبھا سکتا ہے تو وہ صرف صنفِ نازک۔ مرد محبت کے واسطے کوئی قربانی نہیں کرسکتا۔ وہ محبت کو خود غرضی اور خواہشات سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اب میری زندگی راحت و اطمینان کا کاشانہ بن جائے گی۔ آپ نے مجھے جو سبق دیا ہے۔ اس کے عوض آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے بھون یک بیک چونک پڑے اور بولے "اُف میں کتنا بیوقوف ہوں۔ تمام نکات و رموز سمجھ میں آگئے۔ کوئی بات مخفی نہیں۔ آہ میں نے بملا کے ساتھ سخت بے انصافی کی۔ میری آنکھوں پر قطعی پردہ پڑ گیا تھا۔ بملا! مجھے معاف کردو۔

بھون دیر تک اسی طرح گریہ و زاری کرتے رہے۔ بار بار میرا شکریہ ادا کرتے تھے۔ اور اپنی بیوقوفی پر کفِ افسوس ملتے تھے۔ اس کشمکش

میں ہمیں معلوم تک نہ ہوا کہ کب گھنٹی بجی اور کب کھیل شروع ہو گیا۔
یکایک ونود کمرے میں داخل ہوئے۔ میں چونک پڑی۔ میں نے اُن کی
جانب دیکھا۔ کسی جذبہ کا پتہ نہ تھا۔ بولے پدما! اب تک تم یہاں ہی ہو۔
کھیل شروع ہوئے تو دیر ہوئی۔ میں چاروں طرف تمہیں تلاش کر رہا تھا۔
میں گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔ کھیل شروع ہو گیا؟ گھنٹی
کی آواز تو سُنائی ہی نہ دی۔

بھون بھی اُٹھے۔ ہم پھر آ کر تماشہ دیکھنے لگے۔ اگر ونود نے اس وقت
مجھے دو چار چُبھتی ہوئی باتیں کہدی ہوتیں۔ ان کی آنکھوں میں غصہ کی
جھلک دکھائی دیتی۔ تو میرا بے چین دل سنبھل جاتا۔ تسکین ہو جاتی۔ لیکن
ان کے سکون کامل نے مجھے اور بھی بے چین کر دیا۔ بہن! میں چاہتی ہوں
وہ مجھ پر حکومت کریں۔ میں ان کی سنگدلی۔ ان کے ظلم اور ان کے
اقتدار کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کی محبت، عیش و عشرت اور اعتقاد
کے لطف سے شاد کام ہو چکی۔ اس سے میری روح کو تسکین نہیں ہوتی۔
تم اس باپ کو کیا کہو گی۔ جو اپنے لڑکے کو اچھا کھلائے۔ اچھا پہنائے۔
لیکن اس کی تعلیم و تربیت کی کوئی فکر نہ کرے۔ وہ جس رستہ جائے، جانے
دے۔ جو کچھ کرے وہ کرنے دے۔ کبھی اسے سخت آنکھوں سے بھی نہ دیکھے
ایسا لڑکا یقیناً آوارہ ہو جائے گا۔ میرا بھی وہی حال ہوا جاتا ہے۔ یہ کمی
میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس بھلے آدمی نے یہاں تک نہ پوچھا کہ
بھون کون ہیں۔ بھون نے تو یہی سمجھا ہو گا کہ اس کا شوہر اس کی قطعی پرواہ
نہیں کرتا۔ ونود خود آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے بھی آزاد چھوڑ دینا
چاہتے ہیں۔ وہ میرے کسی کام میں مداخلت سے کام نہیں لیتے۔ اسی طرح

چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کے کسی کام میں دخل نہ دوں۔ میں اس آزادی کو دونوں کے لئے زہر سمجھتی ہوں۔ دنیا میں آزادی کی کچھ قیمت ہو۔ گھر میں تو بندش ہی بار آور ہوتی ہے۔ میں جس طرح اپنے ایک زیور کو اپنا سمجھتی ہوں۔ اسی طرح ونود کو بھی اپنا سمجھنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھ سے دریافت کئے بغیر ونود اسے کسی کو دیدیں۔ تو میں لڑ پڑوں گی۔ میں چاہتی ہوں۔ اسی طرح ان پر میرا قبضہ ہو اور اپنے اوپر بھی ان کو اسی طرح قابض دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہیں میری ایک ایک بات پر نظر رکھنی چاہیئے۔ میں کس سے ملتی ہوں۔ کہاں جاتی ہوں۔ کیا پڑھتی ہوں۔ کس طرح زندگی بسر کرتی ہوں۔ ان تمام باتوں پر ان کی سخت نظر ہونی چاہیئے۔ جب وہ میری پرواہ نہیں کرتے تو میں ان کی پروا کیوں کروں؟ اس کشمکش میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کیا کہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کہ وہ کن دوستوں کو روز خط لکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی مجھ سے کبھی نہیں پوچھا۔ خیر میں لکھ رہی تھی۔ کیا کہنے لگی۔

ونود نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں پھر بھون سے فلم کے متعلق گفتگو کرنے لگی۔

جب کھیل ختم ہو گیا۔ اور ہم لوگ باہر آئے۔ اور تانگہ طے کرنے لگے۔ تو بھون نے کہا۔ میں آپ کو اپنی کار میں پہنچا دوں گا۔

ہم نے کوئی عذر نہیں کیا۔ ہمارے مکان کا پتہ دریافت کر کے بھون نے کار چلا دی۔ راستہ میں میں نے بھون سے کہا "کل دوپہر کو میرے یہاں کھانا کھایئے گا" بھون نے قبول کر لیا۔

بھون تو ہمیں پہنچا کر چلے گئے۔ پر میرا دل بہت دیر تک انھیں میں لگا

رہا۔ ان دو تین گھنٹوں میں بھون کو میں جتنا سمجھی۔ اتنا ولود کو آج تک نہیں سمجھی۔ میں نے اپنے دل کی جتنی باتیں اس سے کہدیں۔ اتنی ولود سے آج تک نہیں کہیں۔ بھون ان لوگوں میں سے ہے جو کسی غیر مرد کو میری طرف بُری نگاہیں ڈالتے دیکھ کر اس کی جان کے در پے ہو جائے گا۔ اسی طرح مجھے کسی شخص سے ہنستے دیکھ کر میرا خون پی لے گا۔ اور ضرورت پڑنے پر میرے لئے آگ میں کود پڑے گا۔ ایسی مردانہ فطرت میرے دل کو تسخیر کر سکتی ہے۔ صرف میرے ہی دل پر نہیں۔ بلکہ تمام صنف نازک ایسے ہی شخص پر جان دیتی ہے۔ وہ کمزور ہے۔ اسی لئے طاقتور کی پناہ تلاش کرتی ہے۔

بہن! تم گھبرا گئی ہو گی۔ خط بہت طویل ہو گیا۔ مگر اس بات کو ختم کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ میں نے صبح سے ہی بھون کی دعوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رسوئیا تو نرا کاٹھ کا اُلّو ہے۔ تمام کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا۔ کھانا پکانے میں ایسا لطف اس سے پیشتر مجھے کبھی نہیں حاصل ہوا تھا۔!

ٹھیک وقت پر بھون کی کار آ پہنچی۔ وہ اُترے اور سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ دو چار باتیں ہوئیں ڈنر ٹیبل پر پہنچے۔ ولود بھی کھانا کھانے آ گئے۔ میں نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ مجھے ایسا احساس ہوا۔ جیسے ولود نے بھون کی جانب سے کچھ روکھا پن ظاہر کیا۔ انھیں رؤسا اور راجگان سے کچھ چڑ ہے۔ جب راجاؤں سے چڑ ہے تو ان کے پٹھوؤں سے کیوں نہ ہوتی؟ وہ سمجھتے ہیں۔ ان رؤسا کے دربار میں خوشامدی نکمے۔ بے اُصول اور انسانیت سے خالی لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ جن کا اس کے سوا اور کوئی کام نہیں کہ اپنے رئیس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کریں۔ اور رعایا کا

گلا کاٹ کر اپنا گھر بھریں۔ کھانا کھاتے وقت گفتگو کا سلسلہ رفتہ رفتہ شادی اور محبت جیسے اہم مسئلہ پر آ پہنچا۔

ولنود نے کہا۔ میں موجودہ طریق شادی کو پسند نہیں کرتا۔ یہ رواج اس وقت جاری ہوا تھا۔ جب انسان تہذیب کی ابتدائی حالت میں تھا۔ اب دُنیا اس سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ مگر شادی کی رسم و رواج میں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ طریق زمانہ موجودہ کے لئے موزوں نہیں۔

بھون نے کہا۔ آخر آپ کو اس میں کیا نقص دکھائی دیتا ہے۔؟

ولنود نے کسی قدر غور و خوض کے بعد کہا۔ اس میں سب سے بڑا ایک یہ عیب ہے۔ کہ یہ ایک مجلسی سوال کو دھرم کی صورت دے دیتا ہے۔

"اور دوسرا"؟

"دوسرا یہ کہ یہ لوگوں کی آزادی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ یہ ستری برت اور پتی برت کا سانگ بھر کر ہماری رُوح کو مقید کر دیتا ہے۔ ہماری عقلی نشو و نما میں جتنی رکاوٹ اس رواج نے ڈالی ہے۔ دُنیا کے کسی انقلاب سے نہیں ہوئی۔ اس نے کتنے ہی لایعنی نصب العین ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ اور آج تک ہم اسی بوسیدہ شرمناک، حیوانی لکیروں کو پیٹتے چلے آتے ہیں۔ برت صرف ایک بے معنی بندھن کا نام ہے۔ اتنا عظیم الشان نام دے کر ہم نے اس قید کو دھرم کی شکل دیدی ہے۔ مرد کیوں چاہتا ہے کہ عورت اس کو اپنا ایشور اور اپنا سب کچھ تصور کرے۔ صرف اس لئے کہ وہ اس کا کفیل ہے۔ کیا عورت کا فرض صرف مرد کی جائداد کے لئے وارث پیدا کرنا ہے۔ اس جائداد کے لئے جس پر ہندو نیتی، وید، شاستر، کے بموجب شوہر کی وفات کے بعد اس کا کوئی حق نہیں رہتا۔ سماج کا یہ سارا نظام جائداد کی حفاظت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اس نے دولت کو مقدم اور شخصیت کو

موخر کر دیا ہے۔ ہمارے ہی نطفہ سے پیدا شدہ اولاد ہماری جائداد سے گلچھرے اُڑائے۔ ان خیالات میں کتنی خود غرضی، غلامی مضمر ہے۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس قید میں جکڑی ہوئی سماج کی اولاد اگر آج گھر میں، ملک میں، دنیا میں اپنی خود غرضی کی خاطر خون کی ندیاں بہا رہی ہے تو تعجب کیا ہے۔ میں اس طریق شادی کو ہی تمام بُرائیوں کی جڑ سمجھتا ہوں۔

بھون متحیر ہو گیا۔ میں خود دنگ رہ گئی۔ ونود نے اس مضمون پر مجھ سے کبھی اتنی بالتفصیل گفتگو نہ کی تھی۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ مساوات کے حامی ہیں۔ وہ ایک بار اس مضمون پر ان سے بحث بھی کر چکی ہوں۔ پر موجودہ طریق شادی کے وہ اس قدر خلاف ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ بھون کے بشرہ سے ایسا ظاہر ہوتا تھا۔ کہ انھوں نے ایسے فلسفہ آمیز خیالات کی بُو کبھی نہیں پائی۔ ذرا دیر بعد بولے۔

"پروفیسر صاحب! آپ نے تو مجھے ایک بڑے چکر میں ڈال دیا۔ آخر آپ اس رواج کی جگہ کوئی اور رسم رکھنا چاہتے ہیں۔ یا شادی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ جس طرح حیوانات آپس میں ملتے ہیں۔ وہی ہمیں بھی کرنا چاہیئے"۔

ونود نے فوراً جواب دیا۔ بہت کچھ حیوانات میں سب کے دل یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے ہیں۔ جو جوڑے کے انتخاب میں کوئی خاص خیال نہیں رکھتے۔ کچھ ایسے ہیں۔ جو ایک بار بچے پیدا کرنے کے بعد علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں۔ جو زندگی بھر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کتنی ہی مختلف جماعتیں ہیں۔ میں اسی جماعت کو افضل سمجھتا ہوں۔ جو تمام زندگی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ مگر اپنی مرضی سے۔ ان کے یہاں کوئی قید نہیں۔ کوئی سزا نہیں۔ دونوں اپنے اپنے چارہ دانہ کا فکر کرتے ہیں۔ دونوں مل کر رہنے کی جگہ بناتے ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تیسرا نر یا مادہ

آ ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک مر جاتا ہے۔ تو دوسرا مرتے دم تک بالکل چٹیل رہتا ہے۔ یہ اندھیر انسانی قوم میں ہے۔ کہ جہاں عورت نے کسی دوسرے مرد سے ہنس کر بات کی۔ اور اس کے شوہر کے سینہ پر سانپ لوٹنے لگا۔ خون خرابہ کے منصوبے سوچے جانے لگے۔ اگر مرد نے کسی دوسری عورت کی طرف اشتیاق کی نگاہوں سے دیکھا۔ تو بیوی کے تیوروں پر فوراً بل آ گیا۔ شوہر کی جان لینے پر آمادہ ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ ایسا سماج کس منہ سے تہذیب کا دعویٰ کر سکتا ہے۔؟

بھون نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "لیکن یہ اتنا آسان کام نہ ہوگا۔ یا تو مرد ایسی بیوی کا خواستگار ہوگا۔ جو اولاد کی پرورش خود ہی کر سکتی ہو۔ یا اسے یکمشت تمام رقم ادا کرنا ہوگی۔

پھر ہنس کر کہا۔ آپ اپنے کو کس جماعت میں رکھیں گے۔؟

ونود اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ تھا بھی بے ڈھنگا سوال۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ میں عورت اور مرد دونوں کے لئے پوری آزادی کا حامی ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ میرا دل کسی نوخیز کی جانب مائل ہو اور وہ بھی مجھے چاہے۔ مگر سماج اور نیتی کے خوف سے اِس کی طرف دیکھ بھی نہ سکوں۔ میں اسے پاپ نہیں سمجھتا۔

بھون ابھی کچھ جواب نہ دینے پائے تھے کہ ونود اٹھ کھڑے ہوئے کالج کے لئے دیر ہو رہی تھی۔ فوراً کپڑے پہنے اور چل دیئے۔ ہم دونوں دیوان خانہ میں آ کر بیٹھے۔ اور باتیں کرنے لگے۔

بھون نے سگار جلاتے ہوئے کہا: "کچھ سنا۔ کہاں جا کر تان ٹوٹی۔"

میں نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا جواب دیتی۔ ونود کی آخری بات نے میرے دل پر سخت چوٹ پہنچائی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ ونود نے صرف مجھے سنانے کے لئے شادی پر یہ اعتراض گھڑا ہے۔ وہ مجھ سے اپنا دامن چھڑا لینا چاہتے ہیں۔ وہ کسی اور عورت کی تاک میں ہیں۔ مجھ سے ان کا جی بھر گیا ہے۔ اس خیال سے مجھے بڑا دکھ ہوا میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اگر میں تنہا ہوتی تو کبھی نہ روتی۔ مگر بھون کے سامنے اپنے آپ پر قابو نہ رہ سکی۔ بھون نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کہ آپ ناحق اس قدر غم کرتی ہیں۔ مسٹر ونود خواہ آپ کی قدر نہ کریں۔ مگر دنیا میں کم از کم ایک ایسی ہستی بھی ہے۔ جو آپ کے اشارہ پر جان تک نثار کر سکتی ہے۔ آپ جیسا گراں بہا رتن پا کر دنیا میں کون ایسا شخص ہے۔ جو اپنی قسمت پر نازاں نہ ہو گا۔ آپ قطعی اس کا فکر نہ کریں۔"

مجھے بھون کی یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ غصہ سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ مکار میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی بدقسمتی پر بار بار رونا آتا تھا۔ ابھی شادی ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا۔ اور میری یہ حالت ہو گئی کہ دوسروں کو مجھے بہکانے اور مجھ پر اپنا جادو چلانے کا حوصلہ ہو رہا ہے۔ جس وقت میں نے ونود کو دیکھا تھا۔ اس وقت مجھے کس قدر روحانی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے کس عقیدت سے اپنا مایۂ دل ان کے قدموں میں نذر کیا تھا۔ مگر کیا خبر تھی کہ اس قدر جلد میں ان کی نظروں سے گر جاؤں گی۔ اور مجھے خانہ خراب سمجھ کر یہ بدمعاش مجھ پر ڈورے ڈالیں گے۔

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میں آپ سے معافی کی خواستگار

ہوں - ذرا آرام کرنے دیجئے ۔"

"ہاں، ہاں! آپ آرام کریں۔میں بیٹھا رہوں گا۔"

"جی نہیں۔اب آپ مہربانی فرما کر تشریف لے جائیں۔اس طرح مجھے آرام نہ ملے گا۔"

بہت اچھا۔آپ آرام کریں۔میں شام کو آکر دیکھ جاؤں گا۔"

جی نہیں۔آپ کو تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔

اچھا تو میں کل آؤں گا۔شاید راجہ صاحب بھی تشریف لائیں۔

نہیں آپ لوگ میرے پیغام کا انتظار کریں۔بغیر بلائے نہ آئے گا۔

یہ کہہ کر میں اپنی خواب گاہ کی طرف چلی۔بھون دم بھر تک میری طرف دیکھتا رہا۔پھر چپ چاپ چلا گیا۔

بہن! اسے گئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔اس وقت سے میں کمرے سے باہر نہیں نکلی۔بھون دو تین بار آچکا ہے۔مگر میں نے اسے ملنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔اب شاید اسے پھر آنے کا حوصلہ نہ ہوگا۔ ایشور نے بڑے نازک موقعہ پر عقل بخشی۔ورنہ میں اب تک اپنا ستیاناس کر چکی ہوتی۔ولنوذ عام طور پر میرے پاس ہی بیٹھے رہتے ہیں۔لیکن ان سے بات چیت کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔جو مرد نفس پرستی کو شاستروں کے احکامات سے ثابت کر سکتا ہے۔جس کی نگاہوں میں شادی جیسے مقدس بندھن کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔جو نہ میرا ہو سکتا ہے۔اور نہ مجھے اپنا بنا سکتا ہے۔اس کے ساتھ مجھ جیسی خود پرور عورت کا کتنے دنوں تک نباہ ہوگا۔

بس اب رخصت ہوتی ہوں۔بہن! معاف کرنا۔میں نے تمھارا

قیمتی وقت لیا ہے۔ مگر اتنا سمجھ لو۔ کہ میں تمہارے رحم کی نہیں۔ بلکہ ہمدردی کی خواہاں ہوں۔

(تمہاری پدما)

(۱۰)

بنارس۔ ۵ رجنوری ۱۹۳۶ء

پیاری بہن!

تمہارا خط پڑھ کر مجھے احساس ہوا۔ جیسے کوئی ناول پڑھ کر اٹھی ہوں۔ اگر تم ناول لکھو۔ تو مجھے یقین ہے کہ اُس کی دھوم مچ جائے۔ تم آپ اس کی ہیروئن بن جانا۔ مجھے تو یہی تعجب ہے۔ کہ تم ایسی ایسی باتیں کہاں سے سیکھ گئیں۔ اُس بنگالی کے تنہا بیٹھی ہوئی تم کیونکر گفتگو کرتی رہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں تو کبھی نہ کرسکتی۔ تم ونود کو جلانا چاہتی ہو۔ اُن کے دل کو پریشان کرنا چاہتی ہو۔ ہائے! اُس غریب کے ساتھ تم کس قدر بے انصافی کر رہی ہو۔ تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ونود تم سے بے اعتنائی کر رہے ہیں؟ یہ کیوں نہیں سمجھتیں۔ کہ انھیں کوئی دلی تکلیف پریشان کئے رہتی ہے۔ انھیں کوئی ایسا فکر لاحق ہے کہ زندگی کے معمولی امور میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ممکن ہے اُن کا دماغ فلسفہ کے کسی مشکل مسئلہ کی عقدہ کشائی میں منہمک ہو۔ کوئی مضمون لکھ رہے ہوں۔ یا کسی کتاب کی تصنیف میں مصروف ہوں کون کہہ سکتا ہے۔؟ تم جیسی حسین بیوی پا کر بھی اگر کوئی شخص متفکر رہے تو سمجھ لو۔ اس کے دل پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہے۔ اُن کو تمھاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ تم اُن کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو۔ مگر تم تو اُنہیں کو قصوروار ٹھہراتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تم ونود سے ایک دن کیوں دل کھول کر

باتیں نہیں کرلیتیں ۔شک کو جس قدر جلد ممکن ہو۔ دل سے نکال دینا چاہیئے ۔شک وہ چوٹ ہے کہ اگر اُس کا علاج جلد نہ ہو۔ تو ناسور پڑ جاتا ہے ۔اور پھر اچھا نہیں ہوتا۔ دو چار دن کے لئے یہاں کیوں نہیں چلی آتیں ۔ممکن ہے تم یہ کہو۔کہ تُو خود کیوں نہیں آجاتی۔ اس لئے ایک بات بتا دیتی ہوں کہ میں آزاد نہیں ہوں۔ساس سُسر کی اجازت کے بغیر میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ مگر تم آزاد ہو۔ اور تمہارے لئے کوئی بندھن نہیں ہے۔

بہن! آج کل میری زندگی میں خوشی ورنج دونوں عجیب طور پر رل رہے ہیں ۔اکیلے ہوتی ہوں۔ تو روتی ہوں ۔آنند آجاتے ہیں تو ہنستی ہوں ۔ جی چاہتا ہے وہ ہر وقت میرے نگاہوں کے سامنے بیٹھے رہیں۔ لیکن رات کے بارہ بجے سے پیشتر اُن کے درشن نہیں ہوتے ۔ایک دن دوپہر کو آگئے تھے ۔اُس پر ساس جی نے اس بُری طرح خبر لی کہ کوئی بچے کو کیا ڈانٹے گا۔ مجھے ایسا خوف ہو رہا ہے کہ ساس جی کو مجھ سے کچھ چڑ سی ہے ۔بہن! میں انہیں حتی المقدور خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں ۔جو کام کبھی نہ کئے تھے۔ اُن کے لئے کرتی ہوں ۔اُن کے نہانے کے لئے پانی گرم کرتی ہوں ۔اُن کی پُوجا کے لئے چوکی بچھاتی ہوں ۔جب نہا لیتی ہیں ۔تو اُن کی دھوتی صاف کرتی ہوں ۔لیٹتی ہیں تو پیر دباتی ہوں ۔سو جاتی ہیں تو پنکھا جھلتی ہوں۔ وہ میری ماتا ہیں ۔ میں اُن کی کچھ خدمت کر سکوں ۔اس سے زیادہ میری خوش قسمتی اور کیا ہوگی؟ میں صرف اس قدر چاہتی ہوں ۔کہ وہ مجھ سے ہنس کر بولیں۔ مگر نہ معلوم کیوں وہ مجھے بات بات پر کوسا کرتی ہیں؟ میں جانتی ہوں ۔قصور میرا ہی ہے ۔ ہاں! مجھے معلوم نہیں وہ کیا ہے ۔اگر میرا ہی قصور ہے کہ اپنی دونوں نندوں سے خوبصورت کیوں ہوں۔ پڑھی لکھی کیوں ہوں

آنند مجھے اتنا کیوں چاہتے ہیں ؟ تو بہن! یہ میرے بس کی بات نہیں ۔ شاید ساس جی کا میرے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر آنند ماتا جی سے کچھ کھنچے رہتے ہیں۔ نہ ساس جی کو یہ دھوکا ہوتا ہوگا۔ کہ میں ہی آنند کو سکھاتی پڑھاتی ہوں۔ شاید وہ پچھتاتی ہیں کہ کیوں مجھے بہو بنایا۔ انہیں خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں میں اُن کے بیٹے کو اُن سے چھین نہ لوں۔ وہ ایک بار مجھے جادوگرنی کہہ چکی ہیں۔ دونوں نندیں بھی بلا وجہ ہی مجھ سے جلتی رہتی ہیں۔ بڑی نند جی تو بیوہ ہو گئی ہیں۔ اُن کا جلنا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن چھوٹی نند جی تو ابھی نو خیز ہیں۔ اُن کا جلنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اُن کی جگہ ہوتی۔ تو اپنی بھاوج سے کچھ سیکھنے پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اور اُن کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ مگر اس چھوکری کو میری بے حرمتی ہی کرنے میں مزہ آتا ہے۔ میں جانتی ہوں تھوڑے دنوں میں دونوں نندیں شرمسار ہوں گی۔ ہاں! ابھی وہ مجھ سے بھڑکتی ہیں۔ میں خود تو اپنی طرف سے انہیں ناخوش ہونے کا کوئی موقعہ نہیں دیتی۔

مگر حُسن کو کیا کروں۔ کیا خبر تھی۔ کہ ایک دن اُس حُسن کی بدولت میں قصوروار ٹھہرائی جاؤں گی بہن! میں سچ کہتی ہوں۔ کہ جب سے یہاں آئی ہوں۔ ایک طرح سے سنگار کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میلی کچیلی ہی بیٹھی رہتی ہوں۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں کوئی میرے پڑھنے لکھنے پر ناک بھوں نہ سکیڑے۔ کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ گھر سے کتابوں کا ایک انبار ساتھ لائی تھی۔ اُن میں کتنی ہی کتابیں نہایت اچھی ہیں۔ انہیں پڑھنے کے لئے بار بار جی چاہتا ہے۔ مگر ڈرتی ہوں۔ کہ کہیں کوئی طعنہ نہ دے بیٹھے۔ دونوں نندیں مجھے دیکھتی رہتی ہیں۔ کہ یہ کیا کرتی ہے۔ کیسے بیٹھتی ہے۔ کیسے

بولتی ہے۔ گویا دو، دو جاسوس میرے پیچھے لگا دیئے ہیں۔ اُن دونوں عورتوں کو میری بدگوئی میں کیوں اتنا مزہ آتا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتی۔ شاید آج کل انہیں اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ غصہ تو ایسا آتا ہے کہ ایک بار جھڑک دوں۔ لیکن دل کو سمجھا کر روک لیتی ہوں۔ یہ حالت بہت دنوں نہیں رہے گی۔ کسی نئے آدمی سے جھجکنا فطرتی ہے۔ بالخصوص جب وہ نیا شخص تعلیم اور معاشرت میں ہم سے اختلاف رکھتا ہو۔ اگر مجھ کو ہی کسی فرانسیسی لیڈی کے ساتھ رہنا پڑے تو شاید میں بھی اُس کی ہر ایک بات پر تبصرہ کرتی رہوں۔ یہ کاشی باسی پُوجا پاٹ کے بڑے پابند ہیں۔ ساس جی تو روز گنگا نہانے جاتی ہیں۔ بڑی نند جی بھی اُن کے ساتھ جاتی ہیں۔ میں نے کبھی پُوجا نہیں کی۔ یاد ہے کہ ہم تم دونوں پوجا کرنے والوں کو کتنا بنایا کرتی تھیں۔ اگر میں بھی اُن کی تقلید کا دم بھرتی تو شاید وہ خوش ہوتیں۔ مگر مجھے تو کوئی ایسا احساس نہیں ہوا۔ پوجا کرنے والیاں بھی اُسی طرح دوسروں کی غیبت کرتی ہیں۔ اُسی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ پھر کسی پجارن اور غیر پجارن میں کیا فرق ہے۔ مگر اب مجھے پُوجا سے کچھ کچھ رغبت ہوتی جا رہی ہے۔ میرے سُسر جی کے والد نے ایک چھوٹا سا ٹھاکر دوارہ بنوا دیا تھا۔ وہ میرے مکان کے عین سامنے ہے۔ اکثر ساس جی کے ساتھ میں وہاں جاتی ہوں۔ اور اب یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔ کہ ان عظیم الشان مورتیوں کے درشن سے مجھے اپنے دل کے اندرونی حصہ میں نورانیت کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن حسین ہونے کی سزا کا خاتمہ یہیں تک نہیں ہے۔ نندیں اگر میرے حُسن کو دیکھ کر جلتی ہیں۔ تو یہ فطرتی ہے۔ دُکھ تو اس بات کا ہے کہ یہ سزا مجھے اُس طرف سے بھی مل رہی ہے۔ جس طرف سے اس کا قطعی امکان

نہ ہونا چاہیئے ۔ میرے آنند بابو بھی اِس کی سزا دے رہے ہیں۔ ہاں اُن کا قانونِ سزا کچھ الوکھا ہے ۔ وہ میرے پاس بلاناغہ کوئی نہ کوئی سوغات لاتے رہتے ہیں۔ جتنی دیر میرے پاس رہتے ہیں ۔ اُن کے دل میں یہ شک ہوتا رہتا ہے ۔ کہ مجھے اُن کا رہنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ سمجھتے ہیں ۔ کہ میں اُن سے جو پریم کرتی ہوں ۔ وہ صرف دکھاوا ہے ۔ وہ میرے سامنے کچھ اس طرح دبے دبائے اور سمٹے سمٹائے رہتے ہیں کہ میں شرم کے مارے مرجاتی ہوں ۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں ۔ کہ کسی حسین عورت کو بدصورت مرد سے محبّت ہو ہی نہیں سکتی ۔ شاید وہ دل میں پچھتاتے ہیں کہ کیوں مجھ سے شادی کی ۔ شاید وہ اپنے آپ سے نفرت کرتے ہیں ۔ اگر وہ مجھے کبھی روتے دیکھ لیتے ہیں ۔ تو سمجھتے ہیں ۔ میں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں ۔ کوئی خط لکھتے دیکھتے ہیں ۔ تو یہی سمجھتے ہیں ۔ کہ میں اُن کی بدصورتی کا رونا رو رہی ہوں ۔

بہن ! کیا کہوں ۔ یہ حُسن میری جان کا عذاب ہو گیا ۔ آنند کے دل سے یہ شک اور خوف نکالنے اور انہیں اپنی جانب سے اطمینان دلانے کے لئے مجھے ایسی ایسی باتیں کرنی پڑتی ہیں ۔ جن پر مجھے نفرت ہوتی ہے ۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو برہما سے کہتی ۔ مجھے بدصورت ہی بنانا ۔ بڑی مشکل میں پڑی ہوں ۔ اگر ساس جی کی خدمت نہیں کرتی ۔ بڑی نند کی دلجوئی نہیں کرتی ۔ تو اُن کی نظروں سے گرتی ہوں ۔ اگر آنند بابو کو نااُمید کرتی ہوں ۔ تو یہ خوف ہے کہ کہیں میری جانب سے مایوس نہ ہو جائیں ۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں ۔ بہن ! تم سے کیا پردہ رکھنا ہے ۔ مجھے آنند بابو سے اتنی ہی محبت ہے ۔ جو کسی عورت کو مرد سے ہو سکتی ہے ۔ اُن کی جگہ اگر اب اندر دیوتا بھی سامنے آجائیں تو میں اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں ۔ مگر انھیں کیوں کر یقین دلاؤں ۔

میں دیکھتی ہوں۔ وہ کسی نہ کسی حیلہ سے بار بار گھر آتے ہیں۔ اور دبی ہوئی، للچائی ہوئی نظروں سے میرے کمرے کے دروازہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ جا کر اُن کا ہاتھ پکڑ لوں اور اپنے کمرے میں کھینچ لاؤں۔ مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ اگر کسی نے دیکھ لیا۔ تو چھاتی پیٹنے لگے گی۔ اور سب سے بڑا خوف یہ غالب رہتا ہے۔ کہ کہیں آنند اسے کبھی تریا چرتر ہی نہ سمجھ بیٹھیں۔ ابھی اُن کی آمدنی بہت کم ہے۔ لیکن تحفہ تحائف میں روز دو چار روپے اُڑا دیتے ہیں۔ اگر محبت کے تحفہ کے طور پر وہ ایک پائی کی بھی چیز دیں۔ تو میں اُسے سر آنکھوں سے قبول کروں۔ مگر وہ ٹیکس کی طرح پر دیتے ہیں۔ گویا انہیں ایشور نے ڈنڈ دیا ہے۔ اب مجھے بھی محبت کا سانگ بھرنا پڑے گا۔ حالانکہ میں محبت کا دکھاوا پسند نہیں کرتی۔ اور مجھے اس سے چڑ ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے ایکبار کہا تھا کہ محبت یا تو اندر ہی رہے گی یا باہر ہی رہے گی۔ یکساں طور پر وہ اندر و باہر دونوں جگہ نہیں رہ سکتی۔ سانگ آوارہ مزاج عورتوں کے لئے ہے۔ گھریلو عورتیں تو محبت کا خزانہ اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہیں۔

بہن! خط بہت طویل ہو گیا۔ پڑھتے پڑھتے اُکتا گئی ہوگی۔ میں بھی لکھتے لکھتے تھک گئی۔ اب باقی باتیں کل لکھوں گی۔ پرسوں اس خط کو تمہارے پاس بھیجوں گی۔

بہن! معاف کرنا۔ کل خط لکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ رات کو ایک ایسی بات ہو گئی۔ جس سے دل بے چین ہو اُٹھا۔ بڑی مشکلوں سے یہ تھوڑا سا وقت نکال سکی ہوں۔ میں نے ابھی تک آنند سے گھر کے کسی شخص کی شکایت نہیں کی تھی۔ اگر ساس جی نے کوئی بات کہدی۔ یا نند جی نے کوئی طعنہ دیدیا۔ تو

تو اسے اِن کے کانوں تک کیوں پہنچاؤں۔ سوا اس کے اور کیا ہوگا۔ کہ گھر میں فساد برپا ہو جائے گا۔ انہیں ذرا ذرا سی باتوں کے پیٹ میں نہ رکھنے سے گھر بگڑتے ہیں۔ آپس میں کدورت بڑھتی ہے۔ مگر اتفاق کی بات۔ کل بلا وجہ ہی میرے مُنہ سے ایک بات نکل گئی۔ جس کے لئے میں اب بھی اپنے آپ کو کوس رہی ہوں۔ اور ایشور سے منّاتی ہوں کہ وہ آگے نہ بڑھے۔ بات یہ ہوئی۔ کہ کل آنند بابو بہت دیر کر کے میرے پاس آئے۔ میں اُن کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ یکایک ساس جی نے آ کر پوچھا۔۔۔۔۔۔۔ ابھی تک بجلی جل رہی ہے؟ اگر وہ رات بھر نہ آئیں۔ تو تم رات بھر بجلی جلاتی رہو گی۔؟

میں نے اُسی وقت بتی بجھا دی۔ آنند بابو تھوڑی دیر میں ہی آ گئے تو کمرہ اندھیرا پڑا تھا۔ نہ معلوم اُس وقت میری عقل پر کہاں کے پتھر پڑ گئے تھے۔ اگر میں نے اُن کی آہٹ پاتے ہی بتی جلا دی ہوتی۔ تو کچھ نہ ہوتا مگر میں اندھیرے میں پڑی رہی۔ انھوں نے پوچھا۔ کیا سو گئیں؟ یہ اندھیرا کیوں پڑا ہوا ہے۔؟

ہائے! اگر اس وقت بھی میں نے کہہ دیا ہوتا۔ کہ میں نے ابھی بتی بجھائی ہے۔ تو بات بن جاتی۔ مگر میرے منہ سے نکل گیا۔ کہ ساس جی کا حکم ہے بتی بجھا دو۔ میں نے بجھا دی۔ تم رات بھر نہ آؤ۔ تو کیا رات بھر بتی جلتی رہے۔

"تو اب جلا دو۔ اندھیرے میں کچھ نہیں سجھائی دیتا"!

"میں نے تو بٹن کو ہاتھ سے چھونے کی قسم کھالی ہے۔ جب ضرورت پڑے گی۔ موم بتی جلا لیا کروں گی۔ کون مفت میں گھڑ کہاں برداشت کرے گا"

آنند نے بجلی کا بٹن دباتے ہوئے کہا "میں نے قسم کھائی ہے کہ رات بھر بجلی جلے گی۔ خواہ کسی کو بُرا معلوم ہو یا بھلا۔ سب کچھ دیکھتا ہوں۔ اندھا نہیں ہوں۔ دوسری بہو آکر اتنی خدمت کرے گی۔ تو دیکھوں گا۔ تم قسمت کی کھوٹی ہو۔ کہ ایسے آدمیوں کے پالے پڑی ہو۔ اگر کسی دُوسری ساس کی تم اتنی خدمت کرتیں۔ تو وہ تمہیں پان کی طرح پھیرا کرتی۔ ہاتھوں پر لئے رہتی۔ مگر یہاں تو چاہے۔ کوئی کسی کے لئے جان ہی کیوں نہ دیدے۔ کسی کے منہ سے سیدھی بات بھی نکلے گی"۔

مجھے اپنی غلطی صاف معلوم ہوگئی۔ اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے خیال سے بولی۔ غلطی تو میری ہی تھی۔ کہ بے فائدہ آدھی رات تک بتی جلائے بیٹھی رہی۔ اماں جی نے گل کرنے کے لئے کہا۔ تو کیا بُرا کیا۔ مجھے سمجھانا اور اچھی نصیحت دینا اُن کا دھرم ہے۔ میرا دھرم یہی ہے۔ کہ حتی المقدور اُن کی خدمت کروں۔ اور اُن کی بات کو گرہ باندھوں۔

آنند دم بھر تک دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ زاں بعد بولے " مجھے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اب اس گھر میں میرا گذر نہ ہوگا۔ تم نہیں کہتیں۔ مگر میں سب کچھ سنتا رہتا ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ تمہیں میرے پاپوں کا پرائیچت کرنا پڑ رہا ہے۔ میں کل ہی اماں جی سے صاف صاف کہدوں گا۔ کہ اگر یہی سلوک ہے۔ تو اپنا گھر لو۔ میں اپنے لئے کوئی دوسرا رستہ نکال لوں۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ میرے منہ میں آگ لگے۔ کہ کہاں سے کہاں بتی کا ذکر لے بیٹھی۔ میں تمہارے پاؤں چھو کر کہتی ہوں۔ مجھے نہ ساس جی سے کوئی

شکایت ہے۔ نہ نندجی سے۔ دونوں مجھ سے بڑی ہیں۔ میری ماں کے برابر ہیں۔ اگر کوئی سخت بات بھی کہدیں۔ تو مجھے صبر کرنا چاہیئے۔ تم اُن سے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ مجھے بڑا دکھ ہوگا۔

آنند نے روندھی ہوئی آواز سے کہا۔ تمہاری جیسی بہو پاکر بھی اماں جی کا کلیجہ نہیں پسیجا۔ اب کیا کوئی سورگ کی دیوی گھر میں آتی۔ تم ڈرو مت۔ میں خواہ مخواہ نہ لڑوں گا۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ ذرا اپنے مزاج کو قابو میں رکھیں۔ آج اگر میں دو چار سو روپے گھر میں لاتا ہوتا۔ تو کوئی چوں تک نہ کرتا۔ کچھ کما کر نہیں لاتا۔ یہ اسی کی سزا ہے۔ سچ پوچھو۔ تو مجھے شادی کرنے کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ مجھ جیسا کم عقل شخص جو ایک کوڑی بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنے ساتھ کسی نازنین کو بحر مصیبت میں غرق کرنے کا کیا حق تھا؟ بہن جی کو نہ معلوم کیا سوجھی ہے۔ کہ تمھارے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ سسرال کا صفایا کر دیا۔ اب یہاں بھی آگ لگانے پر تلی ہوئی ہے۔ صرف والد صاحب کا لحاظ کرتا ہوں۔ ورنہ ایک دن میں ٹھیک کر دیتا۔

بہن! اُس وقت تو میں نے اُنہیں کسی طرح ٹھیک کیا۔ مگر نہیں کہہ سکتی۔ کہ وہ کب اُبل پڑیں۔ میرے لئے وہ تمام دنیا سے لڑائی مول لے لیں گے۔ میں جن حالات میں ہوں۔ اُن کا تم اندازہ کر سکتی ہو۔ مجھ پر کتنی ہی مار پڑے۔ مجھے رونا نہ چاہیئے۔ زبان تک کو جنبش نہ ہونی چاہیئے۔ میں روئی اور گھر تباہ ہوا۔ آنند پھر کبھی نہ سنیں گے۔ کچھ نہ دیکھیں گے۔ شاید اس تدبیر سے وہ اپنے خیال میں میرے دل میں اپنے پریم کا اثر پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ آج مجھے علم ہوا۔ کہ یہ کس قدر غصہ ور

ہیں۔ اگر میں نے ذرا سا بھی اشتعال دے دیا ہوتا۔ تو رات ہی کو وہ ساس جی کے سر پر جا پہنچتے۔ کتنی ہی عورتیں اسی غرور میں اپنے آپ کو بھول جاتی ہیں۔ بہن! اگر ایشور نے چاہا۔ تو میں کبھی نہ بھولوں گی۔ مجھے اس بات کا خوف نہیں ہے۔ کہ آنند الگ گھر بنا لیں گے۔ تو کیوں کر گذارہ ہوگا۔ میں اُن کے ساتھ سب کچھ جھیل سکتی ہوں۔ مگر گھر تو تباہ ہو جائیگا۔

بس پیاری پدما! آج صرف اسی قدر۔ خط کا جواب جلد دینا۔

(تمہاری چندا)

(۱۱)

دہلی ۵ رفروری ۱۹۲۶ء

پیاری چندا!

کیا لکھوں...... مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہائے!...... وہ چلے گئے۔ میرے ونود کا تین دن سے پتہ نہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ بغیر کچھ کہے سُنے چلے گئے۔ ابھی تک روئی نہیں۔ جو لوگ پوچھنے آتے ہیں۔ ان سے بہانہ کر دیتی ہوں۔ کہ دو چار دن میں آجائیں گے۔ ایک کام سے بنارس گئے ہیں۔ مگر جب روؤں گی۔ تو یہ جسم آنسوؤں میں ڈوب جائے گا۔ اسی غم میں جان گھُل گھُل کر بہہ جائے گی۔ ہائے! اِس چھلیئے نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ حسب معمول اُٹھا۔ کھانا کھایا۔ کالج گیا۔ وقت مقررہ پر لوٹا۔ مجھ سے ہنسا بولا۔ دونوں نے ناشتہ کیا۔ پھر وہ روزانہ اخبار پڑھنے لگے۔ میں ٹینس کھیلنے چلی گئی۔ اِدھر کچھ دنوں سے انہیں ٹینس کھیلنے کا شوق کم ہو گیا تھا۔ میں تنہا ہی جاتی تھی۔ لوٹی۔ تو روز کی طرح انھیں برآمدے میں ٹہلتے اور سگار پیتے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ حسب معمول

میرا اوور کوٹ لائے۔ اور میرے اوپر ڈال دیا۔ برآمدے سے نیچے اُتر کر کھلے میدان میں ہم ٹہلنے گئے۔ مگر وہ زیادہ بولے نہیں۔ کسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ جب زیادہ شبنم پڑنے لگی۔ توہم دونوں پھر اندر چلے آئے۔ اُسی وقت وہ بنگالی لیڈی آگئیں۔ جن سے میں نے بین سیکھنی شروع کی ہے۔ دلو دبھی میرے ساتھ ہی بیٹھے رہے۔ انہیں فن نغمہ سے کس قدر اُنس ہے۔ یہ میں تمہیں پہلے ہی لکھ چکی ہوں۔ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ اُن کے چلے جانے کے بعد ہم نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔ پھر میں اپنے کمرے میں لیٹنے کے لئے آئی۔ روز کی طرح وہ اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے چلے گئے۔ میں جلد ہی سو گئی۔ لیکن جب وہ میرے میں آئے۔ تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نیند میں کتنی ہی بے خبر کیوں نہ ہوں۔ اُن کی آہٹ پاتے ہی چونک پڑتی ہوں۔ میں نے دیکھا۔ وہ اپنا ہرا شال اوڑھے کھڑے ہیں۔ ہاتھ بڑھا کر بولی آؤ کھڑے کیوں ہو؟ اور پھر سو گئی۔ بس پیاری بہن! وہی دلو د کے آخری درشن تھے یہ نہیں کہہ سکتی۔ وہ پلنگ پر لیٹے یا نہیں۔ نہ معلوم اِن آنکھوں میں کونسی قیامت کی نیند سمائی ہوئی تھی۔ صبح اُٹھی۔ تو دلو د کو نہ پایا۔ میں اُن سے پہلے اُٹھتی ہوں۔ وہ پڑے رہتے ہیں۔ آج وہ پلنگ پر نہ تھے۔ شال بھی نہ تھا۔ میں نے سمجھا۔ شاید اپنے کمرے میں چلے گئے ہوں۔ غسل خانہ میں چلی گئی۔ آدھ گھنٹے میں باہر آئی۔ پھر بھی وہ نہ دکھائی۔ اُن کے کمرے میں گئی۔ وہاں بھی نہ تھے تعجب ہوا۔ اتنے سویرے کہاں چلے گئے۔ ناگہاں کھونٹی پر نظر گئی۔ کپڑے نہ تھے۔ کسی سے ملنے چلے گئے۔ یا نہانے سے پیشتر ہی سیر کرنے گئے ہیں۔ کم از کم مجھ سے کہہ تو دیتے۔ جان تو عذاب میں نہ پڑتی۔ غصہ آیا یہ حضرت مجھے لونڈی

سمجھتے ہیں.........

حاضری کا وقت آیا۔ بیرا میز پہ چائے رکھ گیا۔ ونود کے انتظار میں چائے ٹھنڈی ہوگئی۔ میں بار بار جھنجھلاتی تھی۔ کبھی اندر جاتی۔ کبھی باہر آتی۔ ٹھان لی تھی۔ کہ آج آتے ہی اس بُری طرح لتاڑوں گی۔ کہ وہ بھی یاد کریں گے۔ کہدوں گی۔ آپ اپنا گھر لیجیئے۔ آپ کو اپنا گھر مبارک رہے۔ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ اس طرح تو روٹیاں وہاں بھی مل جائیں گی یسروی کے دنوں میں نو بجتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔؟ جھلّائی ہوئی اُن کے کمرے میں گئی۔ کہ ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دوں۔ صاف صاف لکھ دوں۔ کہ اگر اس طرح رہنا ہے تو آپ رہیئے۔ میں نہیں رہ سکتی۔ جتنا میں طرح دیتی جاتی ہوں۔ اتنا ہی تم چڑھاتے ہو۔ بہن! اُس غصہ میں جذبات کی ندی سی اندر ہی اندر موجزن تھی۔ اگر لکھنے بیٹھتی تو صفحے کے صفحے لکھ ڈالتی۔ لیکن آہ۔! میں تو بھاگ جانے کی دھمکی ہی دے رہی تھی۔ وہ پہلے ہی بھاگ چکے تھے۔ جُوں ہی میز پر بیٹھی۔ مجھے پیڈ میں اُن کا ایک خط ملا۔ فوراً اُسے نکال کر سرسری نگاہیں ڈالیں۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا۔ جیسے تمام کمرہ حرکت میں ہے۔ ایک جگر دوز آہ کھینچ کر کوچ پر گر پڑی۔ خط یہ تھا۔

"پیاری۔! نو مہینے ہوئے۔ جب مجھے پہلی بار تمہارے درشنوں کا فخر حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو مبارک سمجھا تھا۔ آج تم سے جُدا ہو رہا ہوں۔ تاہم میں اپنے کو مبارک سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے جانے کا ذرا بھی دُکھ نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ تم خوش ہو گی۔ جب تم میرے ساتھ سکھی نہیں رہ سکتیں۔ تو میں زبردستی کیوں پڑا رہوں اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اور تم علیحدہ ہو جائیں۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی رہونگا۔ تم بھی

(پریم چالیسی)

جیسی ہو۔ ویسی ہی رہو گی۔ پھر سکھ کی زندگی کا امکان کیا ہے؟ میں شادی کو رُوحانی خوشی کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ عورت و مرد کے تعلقات کا اگر کوئی مطلب ہے۔ تو یہی ہے۔ انسان کی اولاد بغیر شادی کے بھی زندہ رہے گی۔ اور شاید اس سے بہتر شکل میں۔ خواہشات بھی بغیر شادی کے پوری ہو سکتی ہیں۔ انتظام خانہ داری کے لئے شادی کی ضرورت نہیں۔ ضروریات زندگی ایک اہم مسئلہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر جسے ایشور نے دو ہاتھ دیئے ہیں۔ وہ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ شادی کا مقصد صرف یہی ہے۔ کہ شوہر و بیوی ایک دوسرے کی رُوحانی ترقی میں مددگار ہوں۔ جہاں محبت ہو۔ وہی شادی ہے۔ اور محبت ہی رُوحانی ترقی کا اصلی ذریعہ ہے۔ جب محبت نہ رہی۔ تو شادی بھی بیکار ہے۔ بغیر محبت کے شادی کرنا بے معنی ہے۔

جس وقت میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ تو تم مجھے محبت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئی تھیں۔ تم میں حسن تھا۔ سلیقہ تھا۔ علم تھا۔ پریم تھا۔ چستی و چالاکی تھی۔ اُمنگ تھی۔ میں لٹّو ہو گیا۔ اس وقت میری اندھی آنکھوں کو یہ نہ سُوجھا کہ جہاں تم میں اس قدر ہنر ہے۔ وہاں شوخی بھی ہے۔ جو ان تمام ہُنروں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ تم شوخ ہو۔ غضب کی شوخ۔ اس وقت مجھے یہ نہ سُوجھا تھا۔ تم بعینہٖ اُسی طرح ہو جیسی تمہاری دوسری بہنیں ہوتی ہیں۔ نہ کم۔ نہ زیادہ۔ میں نے تم کو آزاد بنانا چاہا تھا۔ کیونکہ میری سمجھ میں اپنی پُوری بلندی تک پہنچنے کے لئے انسان کو اسی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ تمام دنیا میں مردوں کے خلاف کیوں ایک شورِ عظیم برپا ہے؟ اسی لئے کہ ہم نے عورتوں کی آزادی چھین لی ہے۔ اور انہیں اپنی خواہشات کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہیں آزاد کر دیا۔ میں تمہارے اوپر اپنا کوئی

حق نہیں مانتا۔ تم خود مختار ہو۔ جب تک میں سمجھتا تھا۔ کہ میرے ساتھ اپنی خوشی سے رہتی ہو۔ مجھے کوئی فکر نہ تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔ تم اپنی مرضی سے نہیں۔ بلکہ فرض کے بندھن کی وجہ سے رہتی ہو۔ دو چار دن پیشتر ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے۔ اس لئے اب میں تمہارے سُکھ کے راستہ میں کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں کہیں بھاگ کر نہیں جا رہا ہوں۔ صرف تمہارے راستہ سے ہٹا جا رہا ہوں۔ اور اتنی دُور جا رہا ہوں کہ تمہیں میری طرف سے پوری بے فکری ہو جائے۔ اگر میرے بغیر تمہاری زندگی زیادہ خوبصورت اور شاندار ہو سکتی ہے تو میں تمہیں جبراً نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر میں سمجھتا۔ کہ تم میرے سکھ کے راستہ میں رُکاوٹ ہو رہی ہو۔ تو میں نے تم سے صاف صاف کہدیا ہوتا۔ میں دھرم اور اصول کا ڈھونگ نہیں مانتا۔ صرف رُوحانی تسکین چاہتا ہوں۔ اپنے لئے بھی۔ تمہارے لئے بھی۔ زندگی کا مقصد یہی ہے قیمت یہی ہے میں نے ڈلیسک میں اپنے صیغہ کے آفیسر کے نام ایک خط لکھ کر رکھ دیا ہے۔ وہ اُس کے پاس بھیجدینا۔ روپے کا فکر نہ کرنا۔ میرے حساب میں ابھی روپے ہیں۔ جو کئی مہینے تک تمہارے اخراجات کے لئے کافی ہوں گے۔ اور اس وقت تک ملتے رہیں گے۔ جب تک تم لینا چاہو گی۔ یہ میں سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنے جذبات کا صاف صاف اظہار کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ صاف صاف کچھ کہنا میں نہیں چاہتا۔ جس وقت تمہاری خواہش مجھ سے ملنے کی ہو۔ بینک سے میرا پتہ دریافت کر لینا۔ مگر دو چار مہینے، دو چار سال بعد تمہیں میری یاد آئے۔ تم سمجھو۔ کہ میرے ساتھ سُکھی رہ سکتی ہو۔ تو مجھے صرف دو لفظ لکھ کر ڈال دینا۔ میں فوراً آجاؤں گا۔ کیونکہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کے جتنے دن گذرے ہیں۔ وہ میرے لئے فردوس خواب

کے دن ہوں گے۔ جب تک زندہ رہوں گا۔ زندگی کی اِن تمام خوشیوں کو یاد رکھوں گا۔ آہ اتنی دیر تک دل کو روک رکھنے کے باوجود بھی آنکھوں سے ایک بُوند آنسو گرہی پڑا۔ معاف کرنا۔ میں نے تمہیں "شوخ" کہا ہے۔ مگر وہ کون ہے جس میں شوخی نہیں۔ جانتا ہوں۔ کہ تم نے مجھے اپنے دل سے نکال کر پھینک دیا ہے۔ تاہم اس ایک گھنٹہ کے درمیان کتنی ہی بار تمہیں دیکھ آیا ہوں۔ لیکن ان باتوں کا تذکرہ کر کے میں تمہارے جذبہ رحم کو فزوں تر کرنا نہیں چاہتا۔ تم نے وہی کیا جس کا تمہیں حق حاصل تھا۔ اور رہے گا۔ شوہر اور بیوی میں وہی محبّت چاہتا ہوں۔ جو دو آزاد اشخاص میں ہوتی ہے۔ وہ محبت نہیں۔ جس کی بنیاد غلامی اور پابندی ہے۔

بس اب اور کچھ نہ لکھوں گا۔ تم کو ایک چتاؤنی دینے کی خواہش ہو رہی ہے۔ پر دوں گا نہیں کیونکہ تم اپنا بُرا بھلا خود سمجھ سکتی ہو۔ تم نے مشورہ دینے کا حق مجھ سے چھین لیا ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کہ دُنیا میں محبت کا سانگ بھرنے والے شہدوں کی کمی نہیں ہے۔ اُن سے بچ کر رہنا۔ ایشور سے یہی پرارتھنا کرتا ہوں۔ کہ تم جہاں رہو خوش رہو۔ اگر کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے۔ تو یاد کرنا۔ تمہاری ایک تصویر لئے جاتا ہوں۔ معاف کرنا۔ کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں۔ ہائے! جی چاہتا ہے۔ ایک بار پھر دیکھ آؤں۔ مگر نہیں جاؤں گا۔

تمہارا ٹھکرایا ہوا

ونود

بہن! یہ خط پڑھ کر میرے دل کی جو حالت ہوئی۔ اس کا اندازہ تم کرسکتی ہو۔ روئی تو نہیں۔ پر دل بیٹھا جاتا تھا۔ بار بار جی چاہتا تھا۔ کہ

(دوم

زہر کھا کر سو رہوں۔ وس بجنے میں اب تھوڑی ہی دیر تھی۔ میں فوراً کالج گئی۔ اور ونود کا خط دیا۔ یہ ایک مدراسی شخص ہیں۔ مجھے نہایت احترام سے بٹھایا۔ اور خط پڑھ کر بولے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گئے۔ اور کب تک آئیں گے۔ اس میں صرف ایک مہینہ کی رخصت طلب کی ہے۔ میں نے بہانہ کیا......... کہ وہ ایک ضروری کام سے بنارس گئے ہیں۔ اور مایوس واپس آئی۔ میری رُوح اپنی ہزاروں زبان سے مجھے لعنت ملامت کر رہی تھی۔ کمرے میں اُن کی تصویر کے سامنے گھٹنے ٹیک کر میں نے جتنے پُر تاسف الفاظ میں معافی مانگی ہے۔ اگر یہ کسی طرح اُن کے گوش گزار ہوتے۔ تو انہیں معلوم ہوتا۔ کہ ان کو میری جانب سے کس قدر غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس وقت سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا۔ اور نہ ایک منٹ سوئی۔ ونود میرا خواب و خور بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اور اگر اس طرح دس پانچ دنوں تک اُن کی خبر نہ ملی۔ تو جان بھی چلی جائے گی۔ آج میں بینک تک گئی تھی۔ پر یہ دریافت کرنے کی ہمت نہ پڑی کہ ونود کا کوئی خط آیا یا نہیں۔ وہ لوگ کیا سوچتے۔ کہ یہ اُن کی بیوی ہو کر ہم سے دریافت کرنے آئی ہے۔

بہن! اگر ونود نہ آئے۔ تو کیا ہوگا۔؟ میں سمجھتی تھی۔ وہ میری جانب سے لاپرواہیں۔ میری پرواہ نہیں کرتے۔ مجھ سے اپنے دل کی باتیں چھپاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا۔ میں کیسی خوفناک غلطی کا شکار ہو رہی تھی۔ اگر میں یہ جانتی۔ کہ اُن کا دل اس قدر نازک ہے۔ تو اس دن کیوں بھون کو منہ لگاتی۔ میں اُس بدنصیب کا منہ تک نہ دیکھتی۔ اس وقت اگر دیکھ پاؤں۔ تو شاید گولی مار دوں۔ ذرا تم ونود کا خط بھی پڑھو۔ بہن! خود ہی مجھے آزاد بناتے تھے۔ اگر میں نے ذرا دیر تک بھون سے بات چیت کر لی تو وہ اس قدر ناراض کیوں ہوئے۔؟

مجھے اُن کے اس عارفانہ سکون سے چڑھ ہوتی تھی۔ مگر فی الحقیقت اُن کے دل میں اس ذراسی بات نے جتنی بے اطمینانی پیدا کردی۔ شاید مجھ میں نہ کرسکتی۔ اگر میں کسی نازنین کی جانب اُن کی توجہ کا رُخ دیکھتی۔ تو شاید مُنہ پھلا لیتی۔ طعنہ دیتی۔ خود روتی۔ انہیں رُلاتی۔ پر اس قدر جلد بھاگ نہ جاتی۔ مردوں کا گھر چھوڑ کر بھاگنا۔ تو آج تک نہیں سُنا۔ عورتیں ہی گھر چھوڑ کر میکے بھاگتی ہیں۔ یا کہیں ڈوبنے جاتی ہیں یا خودکشی کرتی ہیں۔ مرد بے فکری سے بیٹھے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ مرد ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ اس حسرت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ محبت کی اس گہرائی کو کون پہنچ سکتا ہے۔ اگر میں اس وقت ونود کے چرنوں پر پڑے پڑے مرجاؤں۔ تو سمجھوں۔ کہ مجھے سورگ مل گیا۔ بس اس کے سوا مجھے اور کوئی خواہش نہیں ہے۔ اس لاانتہا محبت نے مجھے آسُودہ کر دیا۔ ونود مجھ سے بھاگے تو مگر بھاگ نہ سکے۔ وہ میرے دل سے، خیال سے اتنے کبھی قریب نہ تھے۔ میں تو اب بھی اُنہیں اپنے سامنے بیٹھا دیکھ رہی ہوں۔ میرے سامنے فلاسفر بننے چلے تھے! اب وہ فلسفہ کی گہرائیاں کہاں گئیں؟ یوں اپنے کو دھوکا دیتے ہو۔ یوں اپنی آتما کو کچلتے ہو۔ اس دفعہ تو بھاگ گئے۔ لیکن پھر بھاگو گے تو دیکھوں گی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ایسے ہوشیار بہروپئے ہو۔ اب میں نے سمجھا اور شاید تمہاری عمیق فلسفہ پسند طبیعت کی سمجھ میں بھی آگیا ہوگا۔ کہ محبت جس قدر سچی اور جس قدر دلی ہوتی ہے۔ اُسی قدر نازک بھی ہوتی ہے۔ وہ آفات و مصائب کے بحر بیکراں میں تھپیڑے کھا سکتی ہے۔ پر لاپروائی کا ایک وار بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ بہن! بات عجیب ہے۔ لیکن سچی ہے۔ میں اس وقت اپنے دل کے اندرونی حصوں میں جتنی اُمنگوں اور جتنی خوشیوں کا

احساس کر رہی ہوں۔ یاد نہیں آتا۔ کہ ونود کے سینہ سے لپٹ کر بھی کبھی ایسی خوشی نصیب ہوئی ہو۔ اُس وقت درمیان میں ایک پردہ تھا۔ اب کوئی پردہ نہیں رہا۔ میں اُن کو موجودہ طریق محبت کی کسوٹی پر کسنا چاہتی تھی۔ آج کل یہ فیشن ہو گیا ہے۔ کہ جب شوہر گھر آئے۔ تو بیوی کے لئے کوئی تحفہ بھی ضرور لائے۔ مرد رات دن بیوی کے لئے زیور بنوانے۔ کپڑے سلوانے، بیل فیتے، لیس وغیرہ خریدنے میں مست رہے۔ پھر بیوی کو اُس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ آئیڈیل شوہر ہے۔ اس کی محبت میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس عورت کی موت کے تیسرے مہینے وہ نئی شادی رچاتا ہے۔ بیوی کے ساتھ اپنی محبت کو بھی چتا میں جلا آتا ہے۔ پھر وہی تماشے اس نئے کھلونے کے ساتھ ہونے لگتے ہیں۔ اور وہی لیلا شروع ہے۔ میں نے یہی محبت دیکھی تھی۔ اور اسی کسوٹی پر ونود کو کس رہی تھی۔ کتنی بے عقل ہوں! چھچھورے پن کو محبت سمجھ بیٹھی تھی۔ کتنی عورتیں واقف ہیں۔ کہ زیادہ تر ایسے ہی زیور، کپڑے اور ہنسنے بولنے میں مست رہنے والے لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ اپنی نااہلیت کو چھپانے کی خاطر یہ سانگ بھرتے رہتے ہیں۔ کتنے کو خاموش رکھنے کے لئے اُس کے سامنے ہڈی کے ٹکڑے پھینک دیتے ہیں۔ بیچاری عورتیں اپنا سب کچھ دے کر کھلونے پاتی ہیں۔ اور انہیں میں سرمست رہتی ہیں۔ میں ونود کو اُسی کانٹے پر تول رہی تھی۔ ہیرے کو ساگ کے ترازو پر رکھے دیتی تھی۔ میں جانتی ہوں۔ یقین کُلّی ہے۔ اور وہ اٹل ہے۔ کہ ونود کی نظر کبھی دوسری عورت پر نہیں پڑ سکتی۔ اُن کے لئے میں ہوں۔ بہن! فرط غرور اور محبت سے میرا سینہ پھول اٹھا ہے۔ اتنی بڑی عظمت اتنی بڑی محفوظ سلطنت اور کس عورت کے مقدر میں ہے۔ ؟ مجھے تو شک ہے۔ اور اس پر بھی میں غیر مطمئن تھی۔ یہ نہ جانتی تھی۔ کہ

بالائے سطح پر بلبلے تیرتے ہیں۔ موتی سمندر کے عمق میں ہی ہوتے ہیں۔ ہائے! میری اس جہالت کے باعث میرے پیارے ونود کو کتنی روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ میری زندگی کے دیوتا اور سرمایۂ حیات نہ معلوم کہاں مارے مارے پھرتے ہوں گے۔! میری نسبت اُن کے دل میں نہ معلوم کیسے کیسے شکوک پیدا ہوتے ہوں گے۔ پیارے! تم نے میرے ساتھ کچھ کم بے انصافی نہیں کی۔ اگر میں نے تمہیں بے درد سمجھا۔ تو تم نے تو اُس سے مجھے کہیں بدتر سمجھا...... کیا اب بھی پیٹ نہیں بھرا۔ تم نے مجھے اس قدر گئی گزری سمجھ لیا۔ کہ اس بدنصیب پھُول...... میں ایسے ایسے ایک لاکھ پھولوں کو تمہارے قدموں پر بھینٹ کر سکتی ہوں۔ مجھے تو دنیا میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ جس پر میری نظر اُٹھ سکے۔ شاید وہ نوبت آتی۔ تو تم اور میں دو میں سے ایک بھی اس دُنیا میں نہ ہوتے۔

بہن! میں نے ونود کو بُلانے "کھینچ لانے" اور پکڑ لانے کی ایک ترکیب سوچی ہے۔ کیا کہوں۔ پہلے ہی دن یہ ترکیب کیوں نہ سُوجھی۔ ونود کو روزانہ اخبارات کا مطالعہ کئے بغیر چین نہیں آتا۔ اور وہ کون سے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ میں جانتی ہوں۔ کل کے اخبار میں یہ خبر شائع ہوگی :" پدما مر رہی ہے" ! اور پرسوں ونود یہاں پہنچ جائیں گے۔ کسی طرح رُک ہی نہیں سکتے۔ پھر خوب نوک جھونک ہوگی۔

اب کچھ تمہارے متعلق۔ کیا تمہاری بڑھیا سچ مچ تم سے اس لئے جلتی ہے۔ کہ تم خوبصورت ہو۔ اور پڑھی لکھی ہو۔ خوب! اور تمہارے آنند بھی عجیب وغریب شخص معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تو سُنا ہے۔ کہ مرد کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ مگر اُس کی نگاہ ہمیشہ حوروں پر جا کر ہی ٹھہرتی ہے

پھر آنند بابو تم سے کیوں بھڑکتے ہیں؟ ذرا غور سے دیکھنا۔ کہیں رادھا اور کرشن کے درمیان کوئی کُبجا تو نہیں ہے۔ اگر ساس جی یُوں ہی ناک میں دم کرتی رہیں۔ تو میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ اپنی جھونپڑی الگ بنالو۔ مگر جانتی ہوں۔ تم میری یہ صلاح نہ مانو گی۔ کسی طرح نہ مانو گی۔ اس صبر آزما طبیعت پر میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں۔ خط جلد لکھنا۔ مگر شاید تمہارا خط آنے سے قبل ہی میرا دوسرا خط بھی مل جائے۔

(تمہاری پدما)

(۱۲)

بنارس ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء

پیاری پدما!

کئی دن تک تمہارے خط کا انتظار کرنے کے بعد آج یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اُمید ہے ونود بابو گھر آگئے ہوں گے۔ اگر وہ ابھی تک نہ آئے ہوں۔ اور تم رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی ہو۔ تو یقیناً مجھے ذرا بھی کوفت نہ ہو گا۔ تم نے ان کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے۔ اس کی سزا یہی ہونی چاہیئے۔ مجھے تم سے قطعی ہمدردی نہیں۔ تم گرہستی ہو کر جو نامعقول کھیل کھیلنے چلی تھیں۔ وہ محبت فروش عورتوں کو زیب دیتا ہے۔ مجھے تو خوشی اس وقت حاصل ہوتی۔ جب ونود تمہارا گلا دبا کر ان خیالات کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیتے۔ تم خواہ مجھ سے خفا ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ لیکن میں یہ کہنے سے کبھی دریغ نہ کروں گی۔ کہ تم ونود کے قابل ہو ہی نہیں۔ میرے خیال میں شاید تم اس شوہر سے خوش ہو سکتی ہو جو آئے دن محبت کے نئے نئے مشاغل تلاش کر کے تمہیں جلایا کرتا۔ غالباً تم نے انگریزی کتابوں میں پڑھا ہو گا۔ کہ

صنفِ نازک رنگین مزاج شخص پر بھی جان دیتی ہیں۔ اور اسی مطالعہ سے تمہارا دماغ پھر گیا ہے۔ تمہیں نت نیا مشغلہ درکار ہے۔ جس کے بغیر تم اپنی زندگی کو بے مصرف سمجھتی ہو۔ تم دراصل بھارت ورش کی شوہر پرست دیوی نہیں۔ بلکہ یورپ کی عیش پسند نازنین ہو۔ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ تم نے اب تک حُسن کو ہی کشش کا باعث تصور کر رکھا ہے۔ حُسن میں کشش ہے۔ یہ تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن ایسی کشش کا نام موہ ہے۔ ٹھہرنے والی نہیں۔ صرف دھوکے کی ٹٹی ہے۔ محبت کا ایک ہی اصلی گُر ہے۔ اور وہ خدمت ہے۔ یہ مت سمجھ لو کہ جو شخص تمہارے گرد و پیش بھونرے کے مانند منڈلایا کرتا ہے اس کی یہ حُسن پرستی بہت دنوں تک قائم رہ سکتی ہے۔ محبت کا بیج حُسن پر مبنی ہے۔ لیکن اُس کو بار آور بنانا خدمت کا کام ہے۔ مجھ کو قطعی یقین نہیں آتا۔ کہ تھکے ہوئے ونود کو باہر سے آنے پر پسینہ سے تر بتر دیکھ کر تم نے کبھی پنکھا بھی جھلا ہوگا۔ شاید ٹیبل فین لگانے کی بات بھی تمہیں نہ سُوجھی ہوگی...... سچ کہنا میری پیشین گوئی درست ہے یا نہیں۔ بتاؤ تم نے کبھی اُن کے پاؤں بھی دبائے ہیں۔ کبھی ان کے سر میں تیل بھی ڈالا ہے۔ تم کہو گی یہ خدمتگاروں کا کام ہے۔ لیڈیاں یہ مرض نہیں پالتیں۔ دراصل تم نے اس اتھاہ مسرت کو محسوس کیا ہی نہیں۔ تم دلونو کو اپنا بنا لینا تو چاہتی ہو۔ لیکن اس کا عمل نہیں کرتیں۔ نفس پرست عورت مایۂ تفریح ہو سکتی ہے۔ دل کی مالکہ نہیں بن سکتی۔ انسان کے گلے سے لپٹی ہوئی بھی وہ اس سے کوسوں دُور رہتی ہے۔ میں یہ تسلیم کرتی ہوں۔ کہ حُسن پرستی انسان کی فطرت ہے۔ لیکن حُسن سے دل کی پیاس نہیں بجھتی۔ حُسن سے رُوحانی تسکین نہیں ہوتی۔ مگر میں تو تمہیں اپدیش کرنے بیٹھ گئی۔ حالانکہ تم مجھ سے دو چار مہینے بڑی ہوگی۔ بہن! معاف کرنا یہ

نصیحت نہیں ہے - یہ باتیں ہم تم سبھی جانتی ہیں - صرف کبھی کبھی بھول جاتی ہیں - میں نے محض تمہیں یاد دلایا ہے -

اچھا اب میری رام کہانی سنو - ! اس ایک مہینے میں یہاں بڑے بڑے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں - یہ تو میں پیشتر ہی ذکر کر چکی ہوں - کہ اماں جی اور آنند بابو میں کچھ کھٹ پٹ ہونے لگی تھی - وہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہتی تھی - دن میں دو ایک بار ماں بیٹے میں دو دو چونچیں ہو جاتی تھیں - ایک دن میری چھوٹی نند جی میرے کمرے سے ایک کتاب اُٹھا کر لے گئیں - انہیں مطالعہ کا مرض ہے - میں نے کمرے میں کتاب نہ دیکھی - تو ان سے پوچھا - اس ذرا سی بات پر وہ بھلی مانس بگڑ گئیں - اور کہنے لگیں - تم تو مجھے چوری لگاتی ہو - اماں نے بھی ان کی ہی حمایت کی اور مجھے خوب سُنائیں - اتفاق کی بات اماں جی ابھی مجھے کوس ہی رہی تھیں کہ آنند بابو مکان میں آ گئے - اماں جی انہیں دیکھتے ہی زور زور سے چلانے لگیں - بہو کی اس قدر جرأت ! اُسے تو نے سر چڑھا رکھا ہے - اور کوئی بات نہیں - کتاب کیا اس کے باوا کی تھی - لڑکی اٹھا لائی - تو اس نے کونسا گناہ کر دیا - ذرا بھی صبر نہ ہو سکا - دوڑی ہوئی اس کے سر پر جا پہنچی اور اس کے ہاتھوں سے کتاب چھیننے لگی - بہن میں خود یہ اقبال کرتی ہوں - کہ مجھے محض کتاب کے لئے اس قدر جلد بازی نہ کرنی چاہیئے تھی - نند جی پڑھ لینے پر خود ہی دے جاتیں - نہ بھی دیتیں تو اس کتاب کے نہ پڑھنے سے میرا ہرج ہی کونسا ہو جاتا - لیکن شامت اعمال اُن کے ہاتھوں سے کتاب چھیننے لگی - اگر اسی سلسلہ میں آنند آنند بابو مجھے ڈانٹ بتاتے تو مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوتا - مگر انھوں نے اس کے برعکس میری ہی حمایت کی اور تیوریاں چڑھا کر بولے - کسی کی چیز کوئی

بلا پوچھے لائے ہی کیوں۔

اتنا سُنا ہی تھا کہ اماں جی کے سر پر بھوت سا سوار ہو گیا۔ آنند بابو بھی بیچ بیچ میں پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے۔ اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی روتی روتی رہی کہ کہاں سے کہاں میں نے کتاب مانگی۔ نہ اماں جی نے ہی کھانا کھایا نہ آنند بابو نے ہی اور میرا تو بار بار یہی جی چاہتا تھا۔ کہ زہر کھا لوں۔ رات کو جب اماں جی لیٹیں تو میں حسب معمول اُن کے پاؤں دبانے گئی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے دھتکار دیا۔ لیکن میں نے اُن کے پاؤں پکڑ لئے۔ پتیانے کی جانب تو تھی ہی اماں جی نے جو پاؤں سے ڈھکیلا تو میں چارپائی سے نیچے گر پڑی۔ زمین پر کئی کٹوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں ان ہی کٹوریوں پر گری تو پیٹھ اور کمر میں چوٹ آ گئی۔ میں چلّانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن نہ معلوم کس طرح میری زبان سے چیخ نکل گئی۔ آنند بابو اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ میری چیخ سُن کر دوڑ پڑے۔ اور اماں جی کے دروازہ پر آ کر بولے۔ اماں کیا اسے مار ہی ڈالتی ہو۔ قصوروار تو میں ہوں۔ اس کی جان کیوں لے رہی ہو۔ یہ کہتے ہوئے وہ کمرہ میں داخل ہو گئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچ کر لے گئے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اپنا ہاتھ چھڑا لوں۔ لیکن آنند نے نہ چھوڑا۔ دراصل ان کا اس طرح ہم لوگوں کے بیچ میں کودپڑنا مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ نہ آجاتے تو میں نے رو دھو کر اماں جی کو منا ہی لیا ہوتا۔ میرے گر پڑنے پر ان کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو چلا تھا۔ آنند کا آجانا غضب ہو گیا۔ اماں جی کمرے کے باہر نکل آئیں۔ اور منہ چڑھا کر بولیں۔ ہاں دیکھو مرہم پٹی کر دو۔ کہیں کچھ ٹوٹ پھوٹ نہ گیا ہو۔

آنند نے صحن میں رُک کر کہا "کیا تم چاہتی ہی ہو کہ تم کسی کو مار ڈالو اور میں نہ بولوں "

"ہاں میں تو ڈائن ہوں۔ آدمیوں کو مار ڈالنا ہی تو میرا کام ہے تعجب ہے کہ میں نے تمہیں بھی کیوں نہ مار ڈالا "

"تو اب کیوں پچھتا رہی ہو۔ دھیلے کی سنکھیا میں تو کام چل سکتا ہے "

" اگر تمہیں اس طرح عورت کو سر چڑھا رکھنا ہے تو کہیں اور لے جا کر رکھو۔ اِس گھر میں تمہارا گزارہ اب نہ ہو سکے گا "

"میں خود اسی فکر میں ہوں۔ تمہارے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں "

" میں بھی سمجھ لوں گی کہ میں نے لڑکا ہی نہیں جنا "

" میں بھی سمجھ لوں گا۔ کہ میری ماتا مر گئی "

میں آنند کا ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچ رہی تھی۔ کہ انہیں وہاں سے ہٹا لے جاؤں۔ لیکن وہ بار بار میرا ہاتھ جھٹک دیتے تھے۔ آخر کار جب اماں جی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ بھی اپنے کمرے میں چلے آئے۔ اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا " تمہیں یہ کیا سوجھی "؟

آنند نے زمین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا " اماں جی نے آج نوٹس دے دیا "

" تم خود ہی اُلجھ پڑے وہ بیچاری تو بولی ہی نہیں "

" میں ہی اُلجھ پڑا "؟

"اور کیا۔ میں نے تو تم سے شکایت نہ کی تھی ۔"

آنند "پکڑ نہ لیتا تو اماں نے تمہیں ادھ مرا کر دیا ہوتا۔ تم اُن کے غصے سے واقف نہیں ہو۔"

"یہ تمہارا محض وہم ہے۔ انھوں نے مجھے قطعی نہیں مارا۔ وہ اپنا پاؤں چھڑا رہی تھیں۔ میں پٹی پر بیٹھی تھی۔ ذرا سا دھکا کھا کر گر پڑی۔ اماں جی مجھے اٹھانے ہی جا رہی تھی۔ کہ تم پہنچ گئے ۔"

"تائی کے آگے ننہال کی تعریف نہ کرو۔ میں اماں کو خوب جانتا ہوں۔ میں کل ہی مکان تبدیل کر لوں گا۔ کہیں نہ کہیں ملازمت مل ہی جائے گی۔ یہ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ کہ میں اُن کی روٹیوں پر پڑا ہوں۔ اسی وجہ سے یہ دماغ ہے ۔" میں جس قدر انہیں سمجھاتی تھی۔ وہ اسی قدر تیز ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار میں نے جھنجھلا کر کہہ دیا تو تم تن تنہا جا کر دوسرے مکان میں رہو میں نہ جاؤں گی۔ مجھے یہیں پڑے رہنے دو۔

آنند نے میری جانب سخت نگاہوں سے دیکھ کر کہا "یہیں لاتیں کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں مجھے تو یہیں اچھا معلوم ہوتا ہے ۔"

" تو تم ہی کھاؤ میں نہیں کھانا چاہتا یہی فائدہ کیا تھوڑا ہے۔ کہ تمہاری بے عزتی آنکھوں سے نہ دیکھوں گا۔ نہ دیکھوں گا نہ تکلیف ہو گی ۔"

"جُدا رہنے لگو گے دنیا کیا کہے گی ۔"؟

"اس کی پرواہ نہیں دُنیا اندھی ہے ۔"

"لوگ یہی کہیں گے کہ عورت نے یہ کرشمہ دکھایا ہے۔"

"اس کی بھی پرواہ نہیں محض اس خوف سے اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لئے تباہ نہیں کرنا چاہتا۔"

میں نے رو کر کہا "تم مجھے چھوڑ دوگے۔ تمہیں میری ذرا بھی محبت نہیں ہے۔"

بہن! اور کوئی وقت ہوتا تو ان محبت سے بھرپور الفاظ نے نہ معلوم کیا کر دیا ہوتا۔ ایسے ہی، شتیاق انگیز الفاظ پر دیاتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ صنف نازک کے پاس اس سے بڑھ کر دوسرا اور کوئی پیکان نہیں۔ میں نے آنند کے گلے میں اپنی دونوں باہیں ڈال دی تھیں۔ اور اُن کے شانے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ لیکن اس وقت آنند بابو اس قدر سنگدل بن گئے۔ کہ یہ جادو بھی ان پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ جس ماتا نے جنم دیا۔ اس کے متعلق اس قدر غصہ! ہم اپنی ماتا کی ایک کڑی بات نہیں سہہ سکتے! اِس غرور اور خودداری کا کہیں ٹھکانا بھی ہے۔ یہی وہ آرزوئیں ہیں۔ جن پر ماتا نے اپنی زندگی کے سارے آرام قربان کر دیئے تھے۔ دن کا چین اور رات کی نیند اپنے اُوپر حرام کر دی تھی۔ بیٹے پر ماں کا اس قدر استحقاق بھی نہیں۔!

آنند نے اسی طرح کرخت لہجہ میں کہا۔ اگر محبت کے یہی معنی ہیں۔ کہ اس گھر میں تمہاری اہانت کراؤں۔ تو میں ایسی محبت سے بے بہرہ ہوں۔

علی الصباح وہ بیدار ہو کر باہر جاتے ہوئے مجھ سے بولے "میں جا کر مکان کا انتظام کئے آتا ہوں ٹانگہ بھی لیتا آؤں گا۔ تیار رہنا۔" میں نے دروازہ روک کر کہا۔ کیا ابھی تک غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔

"غصہ کی بات نہیں۔ صرف دوسروں کے سر سے اپنا بار ہٹا لینے میں ہی بہتری ہے۔"

"یہ کام اچھا نہیں کر رہے ہو۔ سوچ تو لو کہ ماتا جی کو کتنی تکلیف ہوگی۔ سسر جی سے کبھی تم نے کچھ پوچھا"؟

"ان سے پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کرتا دھرتا جو کچھ ہیں۔ وہ اماں ہیں۔ دادا جی تو نرے مٹی کے کھلونے ہیں۔"

"گھر کے مالک تو ہیں"

"تمہیں چلنا ہے یا نہیں صاف کہو"

"میں تو ابھی نہ جاؤں گی"

"اچھی بات ہے لات کھاؤ"

میں کچھ نہیں بولی آنند نے لمحہ بھر کے بعد پھر کہا۔ "تمہارے پاس کچھ روپے ہوں۔ تو مجھے دیدو۔ میرے پاس روپے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے سمجھا شاید اسی کشمکش میں پڑ کر وہ نہ جائیں۔ لیکن انھوں نے تو مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ جھنجھلا کر بولے "اچھی بات ہے۔ تمہارے روپوں کے بغیر بھی میرا کام چل جائے گا۔ تمہیں یہ عالی شان محل یہ عشرت کدہ یہ نوکر چاکر یہ ٹھاٹھ باٹھ مبارک ہو۔ میرے ساتھ کیوں فاقہ کشی کرو گی۔ وہاں یہ راحت و آرام کہاں۔ میری محبت کی قیمت ہی کیا" یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔ بہن کیا کہوں۔ اس وقت اپنی بے بسی پر کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ جا کر اماں جی کے قدموں پر گر پڑی۔ اور رو رو کر آنند بابو کے چلے جانے کا ذکر کیا۔ لیکن ماتا جی کا دل ذرا بھی نہ پسیجا۔ مجھے آج معلوم ہوا۔ کہ ماتا بھی اس قدر سنگ دل ہو سکتی ہے پھر آنند بابو کا دل کیوں نہ سخت ہو۔ آخر اپنی ماتا ہی کے بیٹے تو ہیں۔ ماتا جی نے بے رحمی سے کہا۔ "تم اس کے ساتھ کیوں نہ چلی گئیں۔ جب وہ کہتا تھا تو چلا جانا تھا کیا معلوم ہیں تمہیں کسی روز زہر دیدوں"۔ میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "ماتا جی! انہیں بلوا لیجئے۔

آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ ورنہ کہیں چلے جائیں گے۔" اماں جی اسی طرح بے رحمی سے بولیں۔ جائے چاہے رہے۔ یہ میرا کون ہے؟ اب تو جو کچھ ہو۔ تم ہو۔ میں کس شمار میں ہوں۔ آج ذراسی بات پر وہ اس قدر جھلا رہا ہے۔ اور میری اماں جی نے مجھے سینکڑوں ہی بار پیٹا ہوگا۔ میں بھی چھوکری نہ تھی تمہاری ہی عمر کی تھی۔ پر مجال نہ تھی۔ کہ تمہارے دادا جی سے کسی کے سامنے بول سکتی۔ کھا ہی کھا جاتیں۔ مار کھا کر رات بھر روتی رہتی تھی۔ لیکن اس طرح گھر چھوڑ کر کوئی نہ بھاگتا تھا۔ آج کل کے لونڈے ہی محبت کرنا نہیں جانتے۔ ہم بھی محبت کرتے تھے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ ماں باپ، چھوٹے بڑے کسی کو بھی کچھ نہ سمجھیں۔"

یہ کہتی ہوئی ماتا جی پوجا کرنے چلی گئیں۔ میں اپنے کمرے میں آکر اپنی حسرماں نصیبوں پر رونے لگی۔ رہ رہ کر یہی فکر دامنگیر ہو رہا تھا۔ کہ آنند کسی طرف کی راہ نہ لے لیں۔ بار بار دل سوسا سا جا رہا تھا۔ کہ روپے دے کیوں نہ دیئے۔ بچارے ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہوں گے۔ ابھی تک منہ بھی نہیں دھویا ناشتہ بھی نہیں کیا۔ وقت پر ناشتہ نہ کریں گے۔ تو انہیں نزلہ ہو جائے گا۔ اور انہیں زکام ہو جاتا ہے۔ تو حرارت بھی ہو جاتی ہے، کہاری سے کہا۔" ذرا جا کر دیکھ تو بابو جی کمرے میں ہیں۔" اس نے آکر دیکھا تو کہا کہ کمرے میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کھونٹی پر کپڑے بھی نہیں۔

میں نے پوچھا۔ کیا اور کبھی کبھی اس طرح اماں جی پر ناراض ہوئے تھے کہاری بولی۔" بہو! کبھی نہیں۔ ایسا سیدھا لڑکا دیکھا ہی نہیں۔ یہ اماں کے سامنے کبھی سر ہی نہیں اٹھاتے تھے۔ آج پھر کیوں چلے گئے۔"

مجھے یقین واثق تھا۔ کہ دوپہر کو کھانے کے وقت وہ ضرور آجائیں گے۔ لیکن دوپہر تو درکنار، شام بھی آگئی اور ان کا پتہ تک نہیں۔ تمام رات

پریم چالیسی حصہ

جاگتی رہی ۔ دروازے کی جانب کان لگے ہوئے تھے ۔لیکن رات بھی بدستور گزر گئی ۔ بہو! تین دن گزر گئے ۔اس وقت تم مجھے دیکھتیں ۔ تو پہچان نہ سکتیں ۔ روتے روتے آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں ۔ان تین دنوں میں پل بھر کے لئے بھی آنکھ نہ جھپکی ۔ بھوک پیاس کا تو ذکر ہی کیا ۔ پانی تک نہ پیا ۔ پیاس ہی نہ لگتی تھی ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے قالب میں جان ہی نہیں ۔ تمام گھر ماتم کدہ سا بنا ہوا تھا ۔ اماں جی دونوں وقت کھانا کھانے جاتی تھیں ۔لیکن منہ جھوٹا کر کے چلی آتی تھیں ۔ دونوں نندوں کے ہنسی مذاق سب کچھ عنقا ہو گئے تھے ۔ چھوٹی نند جی تو مجھ سے اپنا قصور معاف کرانے آئیں ۔ چوتھے روز صبح رسوئیے نے آکر مجھ سے کہا ۔ بابو جی تو مجھے وشاسو میدھ گھاٹ پر ملے تھے ۔ میں انہیں دیکھتے ہی لپک کر اُن کے پاس جا پہنچا ۔ اور بولا ” بھیا گھر کیوں نہیں چلتے ۔سب لوگ گھبرائے ہوئے ہیں ۔ بہو جی نے تین دن سے پانی تک نہیں پیا ۔ ان کی حالت بہت خراب ہے “ یہ سنکر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے ۔ پھر بولے ” بہو جی نے دانہ پانی کیوں چھوڑ رکھا ہے ۔ جا کر کہدینا جب آرام کے لئے اس گھر کو نہ چھوڑ سکیں ۔ اس سے اس قدر جلد جی بھر گیا “

اماں جی اسی وقت صحن میں آگئیں ۔ مہاراج کی باتوں کی بھنک اُن کے کان میں پڑ گئی ۔ بولیں کیا ہے ۔؟ الگو کیا آنند ملا تھا ۔؟

مہاراج :۔ ” ہاں بڑی بہو ابھی گھاٹ پر ملے تھے ۔میں نے کہا گھر کیوں نہیں چلتے ۔ تو بولے اس گھر میں میرا کون بیٹھا ہوا ہے “

اماں :۔ ” کہا نہیں ۔ اور کوئی نہیں ہے تو ۔ بیوی تو ہے ۔ اس کی جان کے دشمن کیوں بنے ہو ۔“؟

مہاراج :۔ ” بڑی بہو میں نے بہت سمجھایا ۔لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے ۔“

اماں ۔" کرتا کیا ہے "؟

مہاراج ۔" یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔ لیکن چہرہ بہت اُترا ہوا تھا۔"

اماں ۔" جوں جوں تم بُوڑھے ہوتے جاتے ہو۔ شاید سٹھیائے جاتے ہو۔ اِس قدر تو پوچھ لیا ہوتا کہاں رہتے ہو۔ کہاں کھاتے پیتے ہو۔ تمہیں چاہیئے تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ۔ اور کھینچ کر لے آتے۔ مگر تم نمک حراموں کو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ۔ چاہے کوئی مرے یا جیئے ۔ دونوں وقت بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتے ہو۔ اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہو۔ تمہیں اس کی کیا پرواہ ہے۔ کہ گھر میں دوسرا کوئی کھاتا ہے یا نہیں۔ میں تو پرواہ کرتی ۔ میرا دھرم پالنا پوسنا تھا۔ پال پوس دیا ۔ جہاں جی چاہے جائے۔ آئے یا نہ آئے لیکن اس بہو کو کیا کروں۔ جورو رد کر جان دیئے ڈالتی ہے۔ تمہیں ایشور نے آنکھیں دی ہیں۔ اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ کیا زبان سے اتنا بھی نہ پھوٹا کہ بہو دانہ پانی سب کچھ چھوڑے بیٹھی ہے ۔"

مہاراج ۔" بہو جی! نارائن جانتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ تو جیسے بھاگے جا رہے تھے ۔ میں کیا کرتا ۔"

ماں۔ سمجھایا ہے اپنا سر! تم سمجھاتے اور وہ یونہی چلے جاتے ۔ کیا تمام جھگڑے دار باتیں مجھ ہی سے کرنے کو ہیں ۔ اس بہو کو کیا کہوں ۔ میرے شوہر نے مجھ سے اس قدر بے التفاتی کی ہوتی ۔ تو میں اس کی صورت نہ دیکھتی ۔ پر اس پر اس نے نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ ایسے اُداسیوں کو تو آوارہ مزاج عورتیں چاہیئے۔ جو انہیں ٹھگنی کا ناچ نچائے۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد کہار نے آ کر کہا ۔" بابو جی آئے ہیں۔ اور کمرے میں بیٹھے ہیں ۔" میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ جا کر پکڑ لاؤں لیکن اماں جی کا دل سچ مچ پتھر ہے ۔ بولیں

جاکر کہدے۔ وہاں اُن کا کون بیٹھا ہوا ہے۔ جو وہاں بیٹھنے ہیں۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا اماں جی انہیں اندر بُلوا لیجئے۔ کہیں پھر نہ چلے جائیں۔

اماں ۔"یہاں اس کا کون بیٹھا ہوا ہے جو آئے گا۔ میں تو اندر قدم نہ رکھنے دوں گی۔"

اماں جی تو بگڑ رہی تھیں۔ اِدھر چھوٹی نندجی جاکر آنند بابو کو بلا لائیں۔ سچ مچ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ جیسے مہینوں کا مریض ہو۔ نندجی انہیں اس طرح کھینچے لائی تھی جیسے کوئی لڑکی سسرال جا رہی ہو۔ اماں جی نے مسکرا کر کہا۔"اسے یہاں کیوں لائی ہو۔ اس کا یہاں کون بیٹھا ہوا ہے۔" آنند سر جھکائے مجرم کی مانند کھڑے تھے۔ زبان نہ کھلتی تھی۔

اماں نے پوچھا۔"چار دن کہاں تھے۔"؟

"کہیں نہیں۔ یہیں تو تھا۔"

"خوب چین سے رہے ہو گے۔"

"جی ہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔"

"وہ تو صورت سے ہی ظاہر ہے۔"

نندجی ناشتہ کے لئے مٹھائی لائیں۔ آنند بابو مٹھائی کھاتے اس طرح جھینپ رہے تھے۔ جیسے سسرال آئے ہوں۔ پھر ماتا جی انہیں لئے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں نصف گھنٹے تک ماں بیٹے میں باتیں ہوتی رہیں۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔ لیکن صاف کچھ نہ سُنائی دیتا تھا۔ ہاں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کبھی ماتاجی رو رہی تھیں۔ اور کبھی آنند۔ ماتا جی جب پوجا کرنے کو نکلیں۔ تو ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ آنند وہاں سے نکلے تو سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ میں اٹھیں آتے دیکھ جھٹ پٹ

منہ ڈھانپ چارپائی پر پڑی رہی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے مجھے چارپائی پر لیٹے دیکھا۔ میرے قریب آکر ایک مرتبہ آہستہ سے پکارا۔ اور لوٹ پڑے۔ مجھے جگانے تک کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے جو تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کا باعث وہ اپنے آپ کو تصوّر کر کے دل ہی دل میں از حد بے چین ہو رہے تھے۔ میں نے خیال کیا تھا۔ وہ مجھے اٹھائیں گے۔ میں غمزہ وعشوہ کرونگی۔ وہ منائینگے۔ لیکن تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ انہیں لوٹتے دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں یکا یک اٹھ بیٹھی اور چارپائی سے نیچے اترنے لگی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے پاؤں لڑکھڑائے ایسا معلوم ہوا گویا میں گری جا رہی ہوں۔ یکایک آنند نے پیچھے پھر کر مجھے سنبھال لیا اور بولے۔ لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ میں کرسی پر بیٹھا جاتا ہوں۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "میں تو بہت اچھی طرح ہوں۔ آپ نے کیسے تکلیف کی!"

"پہلے تم کچھ کھا لو۔ پھر میں باتیں کروں گا!"

"میرے کھانے کی آپ کو فکر کیا ہے۔ آپ تو سیر سپاٹے کیجئے!"

"جیسے سیر سپاٹے میں نے کئے ہیں۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر باتیں پیچھے کروں گا۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔ چار دن سے پانی تک منہ میں نہیں ڈالا.......رام رے!"

"یہ آپ سے کس نے کہا۔ کہ چار روز سے میں نے پانی تک منہ میں نہیں ڈالا۔ جب آپ کو میری پرواہ نہ تھی۔ تو میں دانہ پانی کیوں چھوڑتی۔"

"یہ تو صورت ہی کہے دیتی ہے کچھ ایسی سے مرجھا گئی ہو!"

"ذرا جا کر آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھئے۔"

"میں پہلے ہی کونسا بہت خوبصورت تھا۔ ٹھونٹھ کو پانی ملے تو کیا۔ اور نہ ملے تو کیا؟ میں نہ جانتا تھا۔ کہ تم برت رکھنا شروع کر دو گی۔ ورنہ ایشور جانتا ہے۔ اماں مار مار کر جگاتیں تو بھی نہ جاتا۔"

میں نے شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تو کیا تم سچ مچ یہی سمجھتے تھے۔ کہ میں یہاں صرف آرام کے خیال سے رہ گئی۔"

آنند نے جلدی سے اپنی غلطی محسوس کر لی۔ بولے نہیں نہیں پیاری میں اتنا خرد ماغ نہیں ہوں۔ لیکن یہ میں مطلق نہ سمجھا تھا کہ تم بالکل ہی دانہ پانی چھوڑ دو گی۔ بڑی خیریت ہوئی کہ مجھے مہاراج مل گیا۔ ورنہ تم جان ہی دے دیتیں۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کروں گا۔ کان پکڑتا ہوں۔ اماں جی تمہاری تعریف کر کے رو رہی تھیں۔

میں نے خوش ہو کر کہا "تب تو میری ریاضت بار آور ہوئی۔"

"کٹورا سا دودھ پی لو تو بات چیت کروں۔ جانے کتنی ہی باتیں کرنی ہیں۔"

"پی لوں گی ایسی جلدی کیا ہے۔"

"جب تک تم کچھ نہ کھا لو گی میں یہی سمجھوں گا۔ کہ تم نے میرا قصور معاف نہیں کیا۔"

"میں کھانا دیر میں کھاؤں گی۔ پہلے تم عہد کرو کہ آئندہ اس طرح نہ جاؤ گے۔"

"میں صدق دل سے یہ عہد کرتا ہوں۔"

بہن! تین دن یہ تکلیف گوارا کرنی پڑی۔ لیکن مجھے اس کا مطلق غم نہیں۔ ان تین دنوں کے برت نے دلوں میں جو صفائی کر دی۔ وہ کسی دیگر طریق سے

کبھی نہ ہوتی۔ اب مجھے کامل یقین ہے۔ کہ ہماری زندگی نہایت اطمینان سے بسر ہو گی۔

اپنے حالات جلد اور بہت جلد تحریر کرنا۔

(تمہاری چندا)

(۱۳)

دلی ۲ر فروری ۱۹۲۶ء

پیاری بہن!

تمہارا خط پڑھ کر مجھے تمہارے اوپر رحم آگیا تم خواہ مجھے کتنا ہی بُرا کہو۔ لیکن میں اپنی یہ بے عزتی وخرابی کسی طرح نہ برداشت کر سکتی۔ یا تو میں اپنی جان دے دیتی۔ یا اُس ساس کا منہ نہ دیکھتی۔ تمہاری سادہ لوحی، تمہاری متانت وسنجیدگی۔ تمہاری ساس پرستی تمہیں مبارک ہو۔ میں تو فوراً آنند کے ساتھ چلی جاتی۔ اور خواہ بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑتی۔ پر اس گھر میں قدم نہ رکھتی۔ مجھے تمہارے اوپر رحم نہیں آتا غصہ آتا ہے۔ اس لئے کہ تم میں خودداری نہیں ہے۔ تم جیسی عورتوں نے ہی ساس اور شوہروں کا دماغ آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ جہنم میں جائے ایسا گھر۔ جہاں اپنی عزت نہیں۔ میں تو ان دا موں پتی پریم بھی لینے کے لئے تیار نہیں۔ تمہیں انیسویں صدی میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ اس وقت تمہارے اوصاف کی قدر ہوتی۔ اس آزادی اور عورتوں کے راج میں تم صرف عہد گذشتہ کی تاریخ ہو۔ یہ سیتا اور دمینتی کا زمانہ نہیں۔ مردوں نے بہت دنوں راج کیا۔ اب عورتوں کا راج ہو گا۔ مگر لو زیادہ نہ کوسوں گی۔

اب میرا حال سُنو! میں نے سوچا تھا۔ اخبارات میں اپنی بیماری کا تذکرہ

شائع کرادوں گی۔ لیکن پھر خیال آیا۔ کہ یہ خبر شائع ہوتے ہی احباب کا تانتا لگ جائے گا۔ کوئی مزاج پرسی کے لئے آئے گا۔ کوئی دیکھنے آئے گا۔ پھر میں کوئی رانی تو ہوں نہیں۔ کہ جس کی بیماری کا بلیٹن شائع کیا جائے۔ نہ معلوم لوگوں کے دل میں کیسے کیسے خیالات پیدا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ دن بھر میرے دل کی کیا حالت رہی۔ نہیں لکھ سکتی۔ کبھی جی میں آتا زہر کھالوں۔ کبھی سوچتی۔ کہیں بھاگ جاؤں۔ ونود کے متعلق طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اب مجھے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آنے لگیں۔ جب میں نے ونود کے ساتھ لاپروائی کا اظہار کیا تھا۔ میں اُن سے سب کچھ لینا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ آٹھ پہر بھونرے کی طرح میرے گرد و پیش منڈلاتے رہیں۔ پروانہ کی مانند مجھ پر فدا ہوتے رہیں۔ انہیں کتابوں اور اخبارات کے مطالعہ میں محو دیکھ کر میں جھنجھلا اٹھتی تھی۔ میرے وقت کا زیادہ حصہ اپنے ہی بناؤ سنگار میں صرف ہوتا تھا۔ اُن کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ خدمت کی عظمت حُسن سے کہیں زیادہ ہے۔ حسن دل کو کھینچ سکتا ہے۔ مگر رُوح کو مسرت دینے والی کوئی دوسری ہی شے ہے۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں صبح کے وقت میکے جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ یہ گھر کاٹے کھاتا تھا۔ یکایک چٹھی رساں نے مجھے ایک خط لا کر دیا میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لیا۔ پر لفافہ پر ونود کی چشم آشنا تحریر نہ تھی۔ کسی عورت کا خط معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں قطعی اس خط سے ناآشنا تھی۔ فوراً کھولا۔ اور نیچے کی طرف دیکھا۔ تو چونک پڑی۔ یہ کسم کا خط تھا۔ ایک ہی سانس میں تمام خط پڑھ لیا۔ لکھا تھا۔

"بہن! ونود بابو تین دن یہاں رہ کر بمبئی چلے گئے۔ شاید ولایت

جانا چاہتے ہیں ۔ تین چار دن بمبئی رہیں گے۔ میں نے ہر چند کوشش کی ۔ کہ دلّی واپس کردوں۔ لیکن وہ کسی طرح نہ راضی ہوئے ۔ تم انھیں مندرجہ ذیل پتہ سے تار دیدو۔ میں نے ان سے یہ پتہ پوچھ لیا تھا ۔ انہوں نے مجھے تاکید کردی تھی ۔ کہ اس پتہ کو پوشیدہ رکھنا۔ لیکن تم سے کیا پردہ ؟ تم فوراً تار دیدو۔ شاید رُک جائیں ۔ یہ بات کیا ہوئی ۔ مجھ سے تو ہر چند دریافت کرنے کے باوجود ونود نے کچھ نہیں بتایا ۔ ہاں وہ بہت دکھی تھے ۔ ایسے شخص کو کبھی تم اپنا نہ بنا سکیں مجھے سب سے زیادہ تعجب اس بات کا ہے ۔ لیکن مجھے پہلے ہی سے یہ خوف تھا ۔ حُسن اور غرور میں چراغ اور روشنی کا تعلق ہے ۔ غرور حُسن کا نور ہے ۔ ....!

میں نے خط رکھ دیا ۔ اور اسی وقت ونود کے نام تار بھیجدیا ۔ کہ سخت بیمار ہوں ۔ فوراً آؤ ۔ مجھے اُمید تھی کہ ونود بذریعہ تار مطلع کریں گے ۔ لیکن تمام دن گزر گیا ۔ اور کوئی جواب نہ آیا ۔ بنگلے کے سامنے سے کوئی سائیکل نکلتی تو میں فوراً اس کی طرف تاکنے لگ جاتی تھی ۔ کہ شاید تار کا چپراسی ہو ۔ رات کو بھی میں تار کا انتظار کرتی رہی ۔ پھر میں نے اپنے دل کو اس طرح سمجھایا ۔ کہ ونود آرہے ہیں ۔ اس لئے انھوں نے تار بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھی ۔

اب میرے دل میں پھر بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں ۔ ونود کُسم کے پاس کیوں گئے ؟ کہیں کُسم سے انھیں محبت تو نہیں ہے ۔ کہیں اسی محبت کی وجہ سے تو وہ مجھ سے بدگمان نہیں ہوگئے ۔ کسم مجھ سے کوئی چال تو نہیں کر رہی ہے ۔ اُسے ونود کو اپنے گھر ٹھہرانے کا حق ہی کیا تھا ۔ اس خیال سے میرا دل کھنچ اٹھا ۔ کُسم پر غصہ آنے لگا ۔ ضرور دونوں میں بہت دنوں سے خط وکتابت ہورہی ہوگی ۔ میں نے پھر کُسم کا خط پڑھا ۔ اور اس بار اس کے ہر لفظ

میں میرے لئے کچھ سوچنے کا سامان موجود تھا۔ میں نے تہیہ کیا۔ کہ کُسم کو خط لکھوں اور خوب کوسوں۔ آدھا خط لکھ بھی ڈالا لیکن اُسے چاک کر دیا۔ اُسی وقت ونود کو ایک خط لکھا۔ تم سے کبھی ملاقات ہو گی۔ تو وہ خط دکھاؤں گی۔ جو کچھ منہ میں آیا۔ بک ڈالا۔ لیکن اس خط کی بھی وہی حالت ہوئی۔ جو کُسم کے خط کی ہوئی تھی۔ لکھنے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ یہ کسی سودا زدہ دل کی بکواس ہے۔ میرے دل میں یہی بات گھر کرتی جاتی ہے۔ کہ وہ کُسم کے پاس ہیں۔ وہی ساحرہ اُن پر جادو چلا رہی ہے۔ یہ دن بھی گزر گیا۔ چٹھی رساں کئی بار آیا۔ لیکن میں نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چندا میں نہیں کہہ سکتی میرا دل کس قدر تلملا رہا تھا۔ اگر اس وقت مجھے کُسم مل جاتی۔ تو نہ معلوم میں کیا کر ڈالتی۔

رات کو لیٹے لیٹے خیال آیا۔ کہیں وہ یورپ نہ چلے گئے ہوں۔ دل بےچین ہو اُٹھا۔ سر میں ایسا چکر آنے لگا۔ گویا پانی میں ڈوبی جاتی ہوں۔ اگر وہ یورپ چلے گئے۔ تو پھر کوئی امید نہیں۔ اسی وقت اُٹھی۔ اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بجے تھے۔ نوکر کو جگایا۔ اور تار گھر جا پہنچی۔ بابو جی کرسی پر لیٹے لیٹے سو رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اُن کی نیند کھلی۔ میں نے رسیدی تار دیا۔ جب بابو جی تار دے چکے۔ تو میں نے پوچھا۔ اِس کا جواب کب تک آئے گا۔

بابو جی نے کہا...... یہ سوال کسی جوتشی سے کیجئے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ وہ کب جواب دیں۔ تار کا چپراسی زبردستی تو اُن سے جواب نہیں لکھا سکتا۔ اگر کوئی اور سبب نہ ہو۔ تو ۸۔ ۹ بجے تک جواب آ جانا چاہیئے۔

پریشانی اور گھبراہٹ میں انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ اس بیہودہ سوال کے بعد مجھے خود بھی ندامت کا احساس ہوا۔ بابو جی نے اپنے دل میں مجھے کس قدر جاہل خیال کیا ہو گا۔ خیر! میں وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ اور تمہیں یقین

نہ آئے گا۔ نو بجے تک وہیں بیٹھی رہی۔ سوچو۔ کتنے گھنٹے ہوئے۔ پورے، گھنٹے..... سینکڑوں شخص آئے اور گئے۔ لیکن میں وہیں جمی بیٹھی رہی۔ جب تار کی ڈیمی کھڑکتی، میرے دل میں دھڑکن ہونے لگتی۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں بابو جی جھلا نہ اٹھیں۔ کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ جب دفتر کی گھڑی میں نو بجے۔ تو میں نے ڈرتے ڈرتے بابو سے پوچھا "کیا ابھی تک جواب نہیں آیا"؟

بابو نے کہا "آپ تو یہیں بیٹھی ہیں۔ جواب آتا۔ تو کیا ہمیں کھا جاتا"

میں نے بیچیائی سے پوچھا۔ تو کیا اب نہ آئے گا۔؟ بابو نے منہ پھیر کر کہا...... اور دو چار گھنٹے بیٹھی رہیئے"

بہن! یہ فقرے تیر کی مانند چبھے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن پھر بھی میں وہاں سے نہ ٹلی۔ اب تک بھی امید باقی تھی۔ کہ شاید جواب آتا ہو۔ جب دو گھنٹے اور گزر گئے۔ تو میں مایوس ہو گئی۔ ہائے! تو دو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں گھر چلی۔ تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ راستہ نہ سوجھتا تھا۔

یکایک پیچھے سے موٹر کی آواز کانوں میں آئی۔ میں راستہ سے ہٹ گئی۔ اس وقت دل میں بڑی خواہش ہو رہی تھی۔ کہ اس کے نیچے لیٹ کر اپنے تمام دکھوں کا خاتمہ کر دوں۔ آنکھیں پونچھ کر موٹر کی طرف دیکھا۔ بھون بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کی بغل میں کسُم تھی۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا آگ کے شعلے تمام بدن میں سرایت کر گئے۔ میں ان دونوں کی نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی۔ لیکن موٹر رک گئی۔ اور کسُم اُتر کر میرے گلے سے لپٹ گئی۔ بھون اس طرح چُپ چاپ موٹر میں بیٹھا رہا۔ گویا مجھے جانتا ہی نہیں۔ بےرحم۔ مکار۔!! کسم نے پوچھا "بہن! میں تو تمہارے پاس جا رہی تھی۔ کیا وہاں

سے کوئی خبر آئی۔؟

میں نے بات ٹالنے کی خاطر کہا" تم کب آئیں"؟

بھون کے سامنے میں اپنی مصیبت کی داستان نہ کہنا چاہتی تھی۔

کسم نے کہا۔" آؤ کار میں بیٹھ جاؤ"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ اگر موقع ملے۔ تو ذرا آ جانا۔"

کسم نے مجھ سے کوئی اصرار نہیں کیا۔ کار میں بیٹھ کر چلدی۔ میں کھڑی تاکتی رہ گئی۔ یہ وہی کسم ہے۔ یا کوئی اور؟ کتنا زبردست فرق ہو گیا ہے۔ میں گھر چلی۔ تو سوچنے لگی۔ بھون سے اس کی جان پہچان کیونکر ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ونود نے اسے میرا پتہ لینے کے لئے بھیجا ہو۔ کہیں بھون سے کچھ میرے متعلق تو دریافت کرنے نہیں آئی۔

میں گھر پہنچ کر بیٹھی ہی تھی کہ کسم آ پہنچی۔ اس بار وہ موٹر میں تنہا نہ تھی۔ ونود بیٹھے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ میں دوڑ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اور موٹر سے اُتار لاتی۔ لیکن میں جگہ سے ہلی تک نہیں۔ مورتی کی طرح اچل بیٹھی رہی۔ میری خود دار طبیعت اپنی فطرت کے اظہار میں بے چین ہو اٹھی۔ کسم نے ونود کو اتارا۔ اُن کا ہاتھ پکڑے ہوئے لے آئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ونود کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ اور وہ اس قدر کمزور ہو گئے ہیں۔ کہ اپنے سہارے کھڑے بھی نہیں رہ سکتے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیوں تمہارا کیا حال ہے"؟

کسم نے کہا" حال بعد میں دریافت کرنا۔ ذرا جلدی سے پلنگ بچھا دو۔ اور تھوڑا سا دودھ منگا لو۔"

میں نے فوراً چارپائی بچھائی۔ اور ونود کو اس پر لٹا دیا۔ دودھ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس وقت کسم میری مالکہ بنی ہوئی تھی۔

بہن چندا! میں اس وقت اُس کے اشارے پر ناچ رہی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کسم پر ونود کا جتنا وشواس ہے۔ وہ مجھ پر نہیں۔ میں اس وقت اس قابل ہوں ہی نہیں۔ میرا دل سینکڑوں سوالات کرنے کے لئے بے چین تھا۔ لیکن کسم دم بھر کے لئے بھی ونود کے پاس سے نہ ٹلتی تھی۔ میں اتنی جاہل ہوں۔ کہ موقعہ ملنے پر اس حالت میں بھی ونود سے سوالات کا تانتا باندھ دیتی۔

ونود کو جب نیند آ گئی۔ تو میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کسم سے پوچھا:۔ بہن! انہیں کیا شکایت ہے۔؟ میں نے تار بھیجا۔ اس کا جواب نہیں آیا۔ رات کے دو بجے ایک ضروری اور جوابی تار بھیجا۔ دس بجے تک تار گھر میں بیٹھی ہوئی جواب کا راستہ دیکھتی رہی۔ وہیں سے واپس آ رہی تھی۔ جب تم راستہ میں ملیں۔ یہ تمہیں کہاں مل گئے۔؟

کسم میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اور بولی۔ پہلے تم یہ بتاؤ۔ کہ بھون کا کیا معاملہ تھا۔ دیکھو صاف کہنا۔

میں نے رک کر کہا...... کسم! تم یہ سوال کر کے میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو۔ تمہیں خود سمجھ لینا چاہیئے تھا۔ کہ اس میں سوائے لغویت کے اور کوئی بات نہیں ہے۔ ونود کو صرف شک ہو گیا ہے۔

"بلا کسی سبب کے"؟

"ہاں! میری سمجھ میں تو کوئی سبب نہ تھا"

"میں اسے نہیں مانتی۔ یہ کیوں نہیں کہتیں۔ کہ ونود کو جلانے۔ چڑھانے اور جگانے کے لئے تم نے یہ سانگ رچا تھا"

کسم کی اُپج پر متحیر ہوکر میں نے کہا۔" وہ محض مذاق تھا۔"

"تمہارے لئے مذاق تھا۔ ونود کے لئے موت کا سامان ہے۔ تم نے اتنے دنوں تک اُن کے ساتھ رہ کر بھی انہیں نہیں سمجھا۔ تمہیں اپنے بناؤ سنگار کے آگے انہیں سمجھنے کی فرصت کہاں ؟ شاید تم یہ سمجھتی ہو۔ کہ تمہاری یہ موہنی صورت ہی سب کچھ ہے۔ میں کہتی ہوں۔ اس کی قیمت دو چار مہینوں کے لئے ہی ہوسکتی ہے۔ دائم و قائم شے کچھ اور ہی ہے۔

میں نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔" ونود کو مجھ سے کچھ پوچھنا تو چاہیئے تھا۔"

کُسم نے مسکرا کر کہا۔" یہی تو وہ نہیں کر سکتے۔ تم سے ایسی باتیں دریافت کرنا اُن کے لئے ناممکن ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں۔ جو عورت کی نگاہوں سے گر کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ عورت ہو یا مرد۔ کسی کے لئے بھی وہ کسی قسم کا کوئی بندھن نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر شخص کے لئے پوری آزادی کے حامی ہیں۔ دل اور خواہش کے سوا اور کوئی بندھن قبول نہیں کرتے۔ اس مضمون پر مجھ سے اُن سے خوب بات چیت ہوئی ہے۔ خیر میرا پتہ انہیں معلوم تھا ہی۔ وہ یہاں سے سیدھے میرے پاس پہنچے۔ میں تاڑ گئی۔ کہ آپس میں کھٹ پٹ ہوئی ہے۔ مجھے تمہیں پر شک ہوا۔

میں نے پوچھا۔" کیوں ؟ مجھ پر تمہیں کیوں شک ہوا۔" ؟

اس لئے کہ میں تمہیں پہلے دیکھ چکی تھی۔"

"اب تو تمہیں مجھ پر شک نہیں ہے۔"

"نہیں۔ مگر اس کی وجہ تمہاری جدوجہد نہیں۔ میں اس وقت نہایت صاف گوئی سے کام لے رہی ہوں۔ اس کے لئے معاف کرنا۔"

"تم سمجھتی ہو۔ کہ مجھے ونود سے محبت نہیں ہے۔"

نہیں۔ ونود سے تمہیں جتنی محبت ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ تم اپنے آپ کو پیار کرتی ہو۔ کم از کم دس دن پیشتر یہی بات تھی۔ ورنہ یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ونود یہاں سے سیدھے میرے پاس گئے۔ اور دو تین دن تک رہ کر بمبئی چلے گئے۔ میں نے ہر چند دریافت کیا۔ مگر انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔

وہاں انھوں نے ایک دن زہر کھا لیا۔"

میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

بمبئی پہنچتے ہی انھوں نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ اس میں یہاں کے تفصیلی حالات درج تھے۔ اور آخیر میں لکھا تھا۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب میرے لئے موت کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

میں نے ایک ٹھنڈا اسانس لیا۔

"میں یہ خط پا کر گھبرا گئی۔ اور اسی وقت بمبئی روانہ ہو گئی۔ جب وہاں پہنچی۔ تو ونود کو قریب المرگ پایا۔ زندگی کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ میرے ایک رشتہ دار وہاں ڈاکٹر ہیں۔ انھیں بلا کر دکھایا۔ تو بولے۔ کہ انھوں نے زہر کھا لیا ہے۔ فوراً دوائی دی گئی۔ تین دن تک ڈاکٹر صاحب نے نہ دن کو دن سمجھا۔ اور نہ رات کو رات۔ اور میں تو دم بھر کے لئے بھی ونود کے پاس سے نہیں ہٹی۔ بارے تیسرے دن اُن کی آنکھیں کھلیں۔ تمہارا پہلا تار مجھے ملا تھا۔ اُس کا جواب دینے کی کسے فرصت تھی۔ تین دن اور بمبئی رہنا پڑا۔ ونود اس قدر کمزور ہو گئے تھے۔ کہ اتنا لمبا سفر کرنا اُن کے لئے ناممکن تھا۔ چوتھے دن جب میں نے اُن سے یہاں آنے کے لئے کہا۔ تو بولے۔ میں اب وہاں نہ جاؤں گا۔ جب میں نے بہت سمجھایا۔ تو

اس شرط پر راضی ہوئے کہ میں پہلے آ کر یہاں کی حالت دیکھ جاؤں ۔
میرے منہ سے نکلا "ہائے رام! میں اس قدر بدنصیب ہوں"۔
"بہن! بدنصیب نہیں ہو۔ صرف اتنی بات ہے۔ کہ تم نے ونود کو نہ سمجھا تھا۔ وہ تو چاہتے تھے۔ کہ میں تنہا آؤں۔ پر میں نے اس نازک حالت میں انھیں وہاں چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پرسوں ہم دونوں وہاں سے چلے یہاں پہنچ کر ونود تو ویٹنگ روم میں ٹھہر گئے۔ میں پوچھتی ہوئی۔ بھون کے پاس پہنچی۔ بھون کو میں نے اس قدر پھٹکارا۔ کہ وہ رو دیا۔ اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ ڈالا۔ کہ تم نے اُسے بُری طرح دھتکار دیا ہے۔
آنکھوں کا بُرا آدمی ہے۔ پر دل کا بُرا نہیں۔ جب اُدھر سے اطمینان ہو گیا۔ اور راستہ میں تم سے ملاقات ہو نے پر جب ہر طور میرا شک رفع ہو گیا۔ تو میں ونود کو تمہارے پاس لائی۔ اب تمہاری شے تمہیں سونپتی ہوں مجھے امید ہے کہ اس وحشتناک واقعہ نے تمہیں اس قدر ہوشیار کر دیا ہوگا۔ کہ پھر ایسی نوبت نہ آئے گی۔ ایثار و قربانی سیکھو۔ بھول جاؤ کہ تم حسین ہو۔ مسرت سے زندگی بسر کرنے کا یہی اصلی گُر ہے۔ میں ڈینگ نہیں مارتی۔ لیکن اگر چاہوں تو آج تم سے ونود کو چھین سکتی ہوں۔ گو حُسن میں میں تمہارے تلوؤں کے برابر نہیں۔ حُسن کے ساتھ اگر تم اپنے آپ میں خدمت گذاری کا مادہ کبھی پیدا کر سکو۔ تو تم دیوی ہو جاؤ گی۔ اور دُنیا کی کوئی طاقت تمہیں پسپا نہ کر سکے گی۔
میں کُسم کے پیروں پر گر پڑی اور روتی ہوئی بولی۔ بہن! تم نے میرے ساتھ جو احسان کیا ہے۔ اس کے لئے مرتے دم تک تمہاری ممنون رہوں گی۔ اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی۔ تو آج نہ معلوم کیا حالت ہوتی۔؟
بہن! کُسم کل چلی جائے گی۔ مجھے تو اب وہ دیوی معلوم ہوتی ہے

جی چاہتا ہے ۔ اُس کے پاؤں دھو دھو کر پیوں ۔ اُس کے ہاتھوں مجھے دنیا ہی نہیں ملے ہیں ۔ خدمت گذاری کا حقیقی نصب العین اور صنف نازک کے حقیقی فرائض کا علم بھی حاصل ہوا ہے ۔ آج سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس میں عیش و عشرت کی نہیں بلکہ خلوص و خدمت کی کثرت ہو گی ۔

(نہاری پدما)

حرزِ جاں

(۱)

بہت دنوں کی بات ہے۔ میں ایک بڑی ریاست کا معتمد ملازم تھا۔ حسبِ عادت مرنجان مرنج، صلح کل، ریاست کی فرقہ بندیوں سے محترز، نہ ادھر نہ اُدھر اپنے کام سے کام۔ محل میں آئے دن نئے نئے شگوفے کھلتے رہتے تھے نئے نئے تماشے ہوتے رہتے تھے۔ نئی نئی سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ مجھے کسی فریق سے سروکار نہ تھا۔ شاید اسی لئے راجہ صاحب کی مجھ پر عنایت رہتی تھی۔ راجہ صاحب غیور۔ باحمیت۔ آزادا رو اور کسی قدر خود پرور فرمانروا تھے۔ رزیڈنٹ کی خوشامد بھی کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔ جن اخباروں سے دوسری ریاستیں بدظن تھیں۔ اور اپنے حدود میں ان کے داخلہ کی ممانعت کردی تھی۔ وہ سب ہماری ریاست میں بے تکلف آتے تھے۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ ایک دو بار رزیڈنٹ کی جانب سے اس کی تحریک ضرور ہوئی تھی۔ پر راجہ صاحب نے مطلق پرواہ نہ کی۔ اپنے اندرونی انتظامات میں وہ کسی غیر کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے رزیڈنٹ بھی ان سے بدظن تھا۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ راجہ صاحب دُور اندیش، کفایت شعار

خوش انتظام، بیدار مغز آدمی تھے۔ یہ بات نہ تھی۔ وہ نہایت عیش پسند، رنگین مزاج بلکہ شہوت پرور تھے۔ رنواس میں درجنوں ہی رانیاں تھیں۔ پھر بھی آئے دن نئی چڑیاں آتی رہتی تھیں۔ اس مد میں مطلق کفایت یا کنجوسی نہ کی جاتی تھی۔ حُسن پروری اُن کی طبیعت ثانی ہوگئی تھی۔ اس کے لئے وہ دین ایمان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ مطلق العنان رہنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ یوروپین حکام انہیں قیود کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں چڑانے کے لئے ایسے معاملوں میں غیر معمولی جُرات کر بیٹھتے تھے۔ جن میں انہیں رعایا کی رعایت وحمایت کا پورا اعتماد ہوتا تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے ایک پنجابی عورت رنواس میں داخل ہوئی تھی۔ اُس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا۔ بازاری طوائف ہے۔ کوئی ایکٹرلیس بتلاتا تھا۔ کوئی بھلے گھر کی لڑکی۔ حُسن کے اعتبار سے اُسے لاثانی نہ کہا جاسکتا تھا۔ مگر راجہ صاحب اس پر دل وجان سے فدا تھے۔ انتظامی معاملات میں یُوں بھی انہیں دلچسپی نہ تھی۔ مگر اب تو وہ فنا فی العشق ہوگئے تھے۔ اس کے لئے علیحدہ محل تعمیر ہو رہا تھا۔ روزانہ نئے نئے تحائف آتے رہتے تھے۔ اس کی آرائش کے لئے یورپ سے تصویریں اور ظروف منگوائے گئے تھے۔ اُسے گانا اور ناچنا سکھانے کے لئے اٹلی اور فرانس اور جرمنی کے اُستاد بلُائے گئے تھے۔ ساری ریاست میں اسی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ کہ آخر اس حسینہ میں ایسی کیا صفت ہے۔ جس نے راجہ صاحب کو اس قدر از خود رفتہ بنا رکھا ہے۔

ایک دن رات کو میں کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ راجہ صاحب نے یاد فرمایا۔ تعجب ہوا۔ کہ اس وقت خلاف معمول کیوں طلبی ہوئی؟ میں راجہ صاحب

کے خاص معتمدوں میں نہ تھا۔ اس وجہ سے دہشت بھی ہوئی۔ کہ کہیں کوئی آفت تو آنے والی نہیں ہے۔ ریاستوں میں ایسے اتفاقات کم نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کسی بداندیش نے میری شکایت کردی ہو۔ فوراً تیار ہوا۔ اور با دلِ ناخواستہ ترساں لرزاں راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن پہلی نگاہ ہی میں میرے اندیشے مٹ گئے۔ راجہ صاحب کے چہرہ پر غصہ کی جگہ حسرت اور غم چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور بولے۔

کیوں جی سردار صاحب! تم نے کبھی محبت کی ہے؟ کسی کی محبت میں اپنے آپ کو فراموش کیا ہے۔؟

میں نے یہ بے تکلفانہ گفتگو سنی۔ تو سمجھ گیا۔ کہ اس وقت ادب و لحاظ کی ضرورت نہیں۔ راجہ صاحب کسی ذاتی معاملہ میں مجھ سے بے تکلف مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بولا۔ حضور ایسا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

راجہ صاحب نے میری طرف خاصدان بڑھا کر کہا۔ سچ! تم بڑے خوش نصیب ہو۔ اچھا ہوا۔ کہ تم اس جال میں نہیں پھنسے۔ یہ خوش رنگ سنہرا جال ہے۔ یہ میٹھا مگر قاتل زہر ہے۔ یہ دلفریب مگر نگاہ سوز نظارہ ہے یہ وہ نغمہ شیریں ہے۔ جو انسان کو ہمیشہ کے لئے جہنم کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔۔۔۔۔!

انھوں نے گلاس شراب سے بھرا اور ایک چسکی لے کر بولے:۔

جانتے ہو! میں نے اس سرفراز کے لئے کتنی ذلتیں اٹھائیں۔ میں اُس کے ابرو کے اشارہ پر اپنا یہ سر قلم کر کے اُس کے پیروں پر رکھ سکتا تھا یہ ساری ریاست اُس کے قدموں پر نثار کر سکتا تھا۔ انہیں ہاتھوں سے

میں نے اُس کا پلنگ بچھایا ہی۔ اُسے حقہ بھر بھر کر پلایا ہے۔ اس کے کمرہ کی خاکروبی کی ہے۔ وہ پلنگ سے اُترتی تھی۔ تو میں اُس کی زیر پائی سیدھی کرتا تھا۔ اِن خدمتوں میں مجھے کتنا لُطف حاصل ہوتا تھا۔ کتنی خوشی ہوتی تھی۔ تم سے بیان نہیں کرسکتا۔ اس کے سامنے جاکر میں اس کی رضا کا غلام ہو جاتا تھا۔ امارت اور ریاست کا غرور میرے دل سے کافور ہو جاتا تھا۔ اس انکسار میں مجھے کائنات کی دولت مل جاتی تھی۔ مگر اس ظالم نے مجھ سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ شاید وہ مجھے اپنے قابل ہی نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے یہ تمنا ہی رہ گئی۔ کہ وہ ایکبار اپنی اُن مستانہ رسیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی۔ ایکبار ان شنگرفی ہونٹوں سے میری طرف مُسکرانی۔ میں نے سمجھا تھا۔ شائد وہ پرستش ہی کی چیز ہے۔ شائد اس کی فطرت ہی اس طرح بے نیاز واقع ہوئی ہے۔ شاید اس میں درد و محبت کا احساس ہی نہیں ہے۔ شائد وہ ان رموز سے ناآشنا ہے۔ ہاں میں نے سمجھا تھا۔ شائد ابھی الھڑپن اُسے اظہار میں مانع ہے۔ میں اس اُمید سے اپنے دل محزوں کو تسکین دیتا تھا۔ کہ کبھی تو میری جاں نثاریاں سُپھل ہوں گی۔ کبھی تو اس کے جذبات خفتہ بیدار ہوں گے۔

راجہ صاحب یکایک خاموش ہو گئے۔ پھر قد آدم شیشے کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز سے بولے۔ میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں کہ کوئی حسینہ مجھ سے اس قدر احتراز کرے۔

راجہ صاحب نہایت وجیہہ آدمی تھے۔ اونچا قد۔ فراخ سینہ۔ سیب کا سا رنگ۔ مردانہ حُسن کی تصویر۔

میں نے دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ اس معاملہ میں تو فطرت نے حضور کے لئے غیر معمولی فیاضی سے کام لیا ہے۔

راجہ صاحب کے چہرہ پر ایک ہلکا سا مایوسانہ تبسم نظر آیا۔ مگر پھر وہی حسرت طاری ہوگئی۔ بولے سردار صاحب! میں نے اس بازارِ حُسن کی خوب سیر کی ہے۔ تسخیر اور روشنی کرن کے جتنے نسخے ہیں۔ ایک ایک سے واقف ہوں۔ مگر جن نسخوں سے میں نے اب تک ہمیشہ فتح پائی ہے۔ وہ سب اس موقعہ پر بے اثر ثابت ہوئے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا۔ کہ اس پیکرِ حُسن میں حس ہی نہیں۔ مگر افسوس! کل مجھ پر اس بے نیازی اور بے التفاتی کا راز کُھل گیا۔ آہ! کاش یہ راز ابھی کچھ دن اور مجھ سے پوشیدہ رہتا۔ کچھ دنوں اور میں اسی عالم بیخودی میں۔ اسی بیخبری میں پڑا رہتا۔

راجہ صاحب کے چہرہ پر حسرت کی جگہ کرختگی و تندی کا شعلہ نمودار ہوا۔ دیکھیئے یہ وہ خطوط ہیں۔ جو کل مجھے خفیہ طور پر ہاتھ لگے ہیں۔ میں اس وقت اس امر کی تفتیش کرنا بے کار سمجھتا ہوں۔ کہ یہ خطوط میرے پاس کس نے بھیجے۔ اُسے یہ کہاں ملے۔ یہ سرفراز کے کسی بداندیش کی کارروائی ہوگی۔ مجھے تو صرف یہ تحقیق کرنا ہے۔ کہ یہ خطوط اصلی ہیں۔ یا مصنوعی۔ مجھے ان کے اصلی ہونے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ہے۔ میں نے سرفراز کی تحریر دیکھی ہے۔ اس کی گفتگو کا اندازہ کیا ہے۔ اُس کی زبان پر جو الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ میں اُن سے خوب مانوس ہوں۔ ان خطوط میں وہی تحریر ہے۔ سر مو فرق نہیں۔ وہی انداز۔ وہی بیان ہے۔ وہی الفاظ ہیں۔ اِدھر میں تو ایک نگاہ تبسم کے لئے ترستا ہوں۔ اُدھر یاروں کے نام عاشقانہ خطوط لکھے جاتے ہیں۔ شکوے و شکایات رنگین کے دفتر کھولے جاتے ہیں۔ ان خطوط کو میں نے پڑھا ہے۔ پتھر کا دل کر کے پڑھا ہے۔

راجہ صاحب کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

خون کا گھونٹ پی پی کر تڑپ رہا ہے۔ اور اپنی بوٹیاں نوچ نوچ کر پڑھا ہے۔ آنکھوں سے خون کے قطرے نکل نکل آئے ہیں۔

اُف! یہ دغا! یہ تریا چلتر! میرے محل میں رہ کر۔ میری ناز برداریوں کے سایہ میں زندگی کی بہترین نعمتوں کا لطف اُٹھا کر، میری خاکروبوں اور جاں نثاریوں کو پیروں سے کچل کر یہ راز و نیاز کے خط لکھے جاتے ہیں۔ مجھے کھارے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ دوسرے پر آبِ مقطر کی بارش کی جا رہی تھی۔ میرے لئے ایک چٹکی بھر آٹا نہیں۔ دوسرے کے لئے خوانِ نعمت حاضر کیا جا رہا تھا۔

اُف! تم قیاس نہیں کر سکتے۔ کہ ان خطوط کو پڑھ کر میری کیا حالت ہوئی۔ پہلا ولولہ جو میرے دل میں آیا۔ وہ یہ تھا کہ اسی وقت تلوار لے کر جاؤں اور اس بیدرد کے سامنے، اسی کے پیروں پر، یہ تیغہ اپنے سینے میں چبھاؤں۔ اسی کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ شاید میرے بعد وہ میری محبت کی قدر کرے۔ میرے خون کے گرم فوارے اس کے پتھر جیسے دل کو پگھلا دیں۔ اس بے رحم کو معلوم ہو کہ محبت کیا شے ہے۔ لیکن دل کے نہ معلوم کس گوشہ سے آواز آئی۔ یہ سراسر حماقت ہے! تم مر جاؤ گے اور یہ ساحرہ تمہارے زر و جواہر سے دامن بھرے۔ تمہارے عطیات سے گرانبار، دل میں تمہاری حماقت پر ہنستی ہوئی دوسرے دن اپنے گلشن میں چلی جائے گی۔ اور دونوں تمہاری دولت کے مزے اُڑائیں گے۔ اور تمہاری روح مضطرب کو تڑپائیں گے۔

سردار صاحب! یقین مانئے۔ یہ آواز مجھے اپنے ہی دل کے کسی گوشہ سے آئی۔ میں نے اسی وقت تلوار کمر سے نکال کر رکھ دی۔ یہ خیال ترک کر دیا۔ ایک ہی لمحہ میں انتقام کا ولولہ پیدا ہوا۔ دل میں ایک شعلہ سا اٹھا۔ اُف! کتنی

جاں سوز تھی وہ لپٹ، کتنا بیتاب کن تھا وہ اشتعال۔ ایک ایک رونئیں سے آگ نکل رہی تھی۔ اُٹھا کہ اسی وقت جا کر اس کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دوں۔ جن آنکھوں کی ایک نگاہ کے لئے اپنی جان نثار کرتا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے بند کر دوں۔ ان قاتل زہریلے لبوں کو ہمیشہ کے لئے سیاہ کر دوں۔ جس سینہ میں اتنا تغافل۔ اتنی بے مہری اتنی بے وفائی بھری ہو۔ اُسے چیر کر پیروں سے کچل ڈالوں۔ خون سا سر پر سوار ہو گیا۔ سرفراز کی ساری دلربائیاں۔ ساری رعنائیاں۔ ساری خوش اندازیاں مکروہ معلوم ہونے لگیں۔ اس وقت اگر مجھے معلوم ہو جاتا۔ کہ سرفراز کو کسی نے قتل کر ڈالا ہے۔ تو شائد میں قاتل کے پیروں کو بوسہ دیتا۔ اگر سنتا کہ وہ نزع کی حالت میں ہے۔ تو اس کے دم توڑنے کا تماشہ دیکھتا۔ میں خون کا مصمم ارادہ کر کے دو سری تلواریں کمر سے لگائے اس کے حریم ناز میں داخل ہوا۔ جس دروازہ پر جاتے ہی دل میں امید و بیم کی کشمکش ہونے لگتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس وقت مجھے سفاکانہ مسرت ہوئی۔

سردار صاحب! اُن کیفیات اور جذبات کا ذکر نہ کروں گا۔ جو اس وقت میرے دل پر طاری ہوئیں۔ زبان میں اتنی طاقت ہو بھی تو دل کو اس ہیجان میں لانا مناسب نہیں۔ میں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ سرفراز خواب ناز میں مست تھی۔ اُسے دیکھ کر میرے دل پر ایک عجیب رقت طاری ہوئی۔ جی ہاں وہ غیظ و غضب نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اُس کی بجائے رقت کا غلبہ ہوا۔ اس کی کیا خطا ہے۔؟ اگر اس کی یہی خطا ہے؟ جو میری ہے۔ تو مجھے اُس سے انتقام لینے کا کیا حق ہے؟ اگر وہ اپنے محبوب کے لئے اتنی ہی مضطرب اتنی ہی بیتاب۔ اتنی ہی از خود رفتہ ہے۔ جتنا میں ہوں۔ تو اس کی کیا خطا ہے۔ جس طرح میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ کیا وہ بھی اپنے دل

سے مجبور نہیں ہو سکتی۔؟ اگر مجھے کوئی عورت گرفتار کرے اور زر و جواہر سے میری محبت خریدنا چاہے تو کیا میں اس کا دم بھرنے لگوں گا۔؟ شائد نہیں۔ میں موقع پاتے ہی راہ فرار اختیار کروں گا۔ یہ میری بے انصافی ہے۔ ستم ناروا۔ اگر مجھ میں وہ اوصاف ہوتے جو اس کے نامعلوم آشنا میں ہیں۔ تو کیوں اس کی طبیعت میری جانب مائل نہ ہوتی۔ مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں۔ جو وہ اپنے محبوب میں دیکھنا چاہتی ہے اگر مجھے کڑوی چیز اچھی نہیں لگتی۔ تو میں قدرتاً حلوائی کی دکان کی طرف جاؤں گا۔ جو مٹھائیاں بیچتا ہے۔ ممکن ہے رفتہ رفتہ میرا مذاق بدل جائے۔ اور میں کڑوی چیز پسند کرنے لگوں۔ لیکن جبراً۔ تلوار کی نوک پر کوئی مجھے کڑوی چیز کی طرف رغبت نہیں دلا سکتا۔

ان خیالات نے مجھے نرم کر دیا۔ وہ صورت جو مجھے ایک لمحہ پہلے مکروہ معلوم ہوتی تھی۔ پھر صد گنا دلربا نظر آئی۔ اب تک میں نے اس کو محو خواب نہ دیکھا تھا۔ عالم خواب میں اس کا حسن زیادہ پاکیزہ اور لطیف نظر آیا۔ جیسے بارش کے بعد پھول۔ بیداری میں وہ اجتماعی کشش نہ تھی۔ نگاہ کبھی آنکھوں کے بوسے لیتی۔ کبھی لبوں کے کبھی رخساروں کے۔ اس عالم خواب میں اس کا جلوۂ حسن مسلم تھا جس کی ایک شمع روشن تھی۔ جس کا مرکز نگاہ کے لئے کوئی خاص نقطہ نہ تھا۔

راجہ صاحب نے ایک معذرت آمیز تبسم کے ساتھ پھر ساغر منہ سے لگایا۔ اور بولے :-

سردار صاحب! میرا جوش انتقام فرو ہو گیا۔ جس سے محبت ہو گئی۔ اس سے نفرت نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ ہمارے ساتھ کتنی ہی بے وفائیاں کرے۔ جہاں معشوق عاشق کے ہاتھوں قتل ہو۔ وہاں سمجھ لیجئے۔ کہ محبت نہ تھی صرف نفس پروری تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ لیکن دل کو کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ تب سے اس

وقت تک میں نے غصہ کو ضبط کرنے کی بحد امکان کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ جب تک وہ شیطان زندہ ہے۔ میرے پہلو میں ایک کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔ میری چھاتی پر سانپ لوٹتا رہے گا۔ میرے لئے خواب و خور حرام ہے۔ وہی مار سیاہ میرے خزانہ تک پہنچنے میں مانع ہو رہا ہے۔ وہی میرے اور سرفرازی کے بیچ میں دیوار حائل ہے۔ وہی اس دودھ کی مکھی ہے۔ اس سانپ کا سر کچلنا ہوگا۔ اس دیوار کو منہدم کرنا ہوگا۔ اس مکھی کو نکال کر پھینکنا ہوگا۔ جب تک میں اپنی آنکھوں سے اس کی دھجیاں بکھرتے نہ دیکھوں گا۔ میری روح کو تسکین نہ ہوگی۔ مآل کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو۔ مگر اس کو واصل جہنم کر کے دم لوں گا۔

یہ کہہ کر راجہ صاحب نے میری طرف سائلانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ بتلائیے۔ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔؟

میری زبان سے کلمۂ حیرت نکلا...... "میں"..... !

راجہ صاحب نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا: "ہاں! آپ!! آپ جانتے ہیں۔ میں نے اتنے آدمیوں کو چھوڑ کر آپ کو کیوں محرم راز بنایا۔ اور کیوں آپ سے استدعا کی؟ یہاں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ جو میرا اشارہ پاتے ہی اس مردود کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ سر بازار اُسے خاک و خون میں ملا دیں گے۔ جی ہاں! ایک اشارے سے اس کی ہڈیوں کا بُرادہ بنوا سکتا ہوں اس کے ناخنوں میں کیلیں ٹھکوا سکتا ہوں۔ مگر میں نے سب کو چھوڑ کر آپ کا انتخاب کیا۔ جانتے ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ مجھے تمہارے اُوپر اعتبار ہے۔ وہ اعتبار جو مجھے اپنے قریب تر آدمیوں پر بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ تمہارے سینہ میں یہ راز اتنا ہی محفوظ رہے گا۔ جتنا میرے۔ مجھے اعتبار ہے۔ کہ تحریص

اپنا انتہائی زور صرف کرکے بھی تمہیں نہیں ہلا سکتی۔ حیوانی تشدد اور ظالمانہ ایذا تمہارے لبوں کو نہیں کھول سکتے۔ تم بے وفائی نہ کروگے۔ دغا نہ کروگے۔ اس موقعہ سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گے۔ جانتے ہو۔ اس کا صلہ کیا ہوگا۔؟ اس کے متعلق تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ مجھ میں اور کتنے ہی عیوب ہوں۔ احسان فراموشی کا عیب نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا صلہ جو میرے امکان میں ہے۔ وہ تمہارے قدموں پر رکھ دیا جائے گا۔ منصب۔ جاگیر۔ دولت۔ اعزاز۔ تمہارے حسب خواہش عطا ہوں گے۔ تم خود اس کے مختار کامل ہوگے۔ کوئی مداخلت نہ کریگا۔ حرص اور ارمان کو انتہائی پرواز کی آزادی ہوگی۔ قدردانی کے قدیم افسانے پھر زندہ ہوجائیں گے۔ تم خود فرمان لکھو گے۔ اور میں اس پر آنکھیں بند کرکے دستخط کروں گا۔ بولو کب جانا چاہتے ہو؟ اس کا نام اور پتہ اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ اسے ذہن میں نقش کرلو۔ اور کاغذ پھاڑ ڈالو۔ میں نے کتنی بڑی ذمہ واری تمہارے اُوپر رکھی ہے۔ میری جان تمہاری مٹھی میں ہے۔ تم اُسے بنا اور بگاڑ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے۔ کہ تم اس کام کو بوجہ احسن انجام دو گے۔ جنہیں اپنا شریک کار بناؤ گے۔ وہ بھروسے کے آدمی ہوں گے۔ انتہائی فراست انتہائی دُور اندیشی اور انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ ایک غیر محتاط لفظ۔ ذرہ برابر لاپروائی۔ ایک لمحہ کی تاخیر میرے اور تمہارے دونوں کے حق میں سم قاتل ہوگی۔ دشمن گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ ناکردہ گناہ گدی سے معزول کرنے کی تجویزیں سوچی جارہی ہیں۔ گناہ کرنے پر کیا سزا ہوگی۔ اس کا اندازہ تم کرسکتے ہو۔ میں کسی دُور دراز کوہستانی علاقہ میں بند کردیا جاؤں گا۔ ریاست غیروں کے تصرف میں چلی جائے گی۔ اور میری زندگی غارت ہوجائیگی۔ تو کب جاؤ گے۔؟ یہ امپیریل بنک کا چک بک ہے۔ میں نے چکوں پر دستخط

کر دیئے ہیں ۔ جب اور جتنے روپیوں کی ضرورت ہو لے لینا ۔

میرا دماغ عرش معلی پر جا پہنچا ۔ اب مجھے معلوم ہوا ۔ کہ ثروت میں تالیف کی کتنی قوت ہوتی ہے ۔ کیوں لوگ اس کے آستانہ پر سجدے کرتے ہیں ۔ مجھ پر جیسے کوئی نشہ ہو گیا ۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا ۔ اپنی تقدیر کی تعمیر کا موقعہ زندگی میں ہر ایک انسان کو ملتا ہے ۔ اور ایک ہی بار ۔ جو اس موقعہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے ۔ وہ کامیاب ہے ۔ اور جو شش و پنج میں پڑ کر اُسے چھوڑ دیتا ہے ۔ وہ ناکام ہے ۔ ایک کو دولت ۔ عزت اور شہرت نصیب ہوتی ہے ۔ دُوسرا عُسرت اور افلاس اور نکبت میں زندگی کے دن کاٹتا ہے ۔ فیصلہ کرنے کے لئے صرف ایک منٹ ۔ بلکہ صرف ایک لمحہ کا وقت ملتا ہے ۔ کتنا بیش قیمت ہے وہ لمحہ ۔ میری زندگی میں یہ وہی لمحہ تھا ۔ میں نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔ تقدیر اپنی بہترین نعمتوں کی بشارت لئے میرے سامنے حاضر ہے ۔ وہ ساری برکتیں جن کے لئے انسان ترستا اور جیتا ہے ۔ میرا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑی ہیں ۔ مانا خطرناک بات ہے ۔ لیکن ہمت تو دیکھو ۔ دریا میں غوطہ لگانے سے ہی دُرِ یتیم ملتا ہے ۔ کنارے پر بیٹھنے والے سبکسارانِ ساحل کے لئے خرمہروں کے سوائے اور کیا ہے ۔ ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑے گا ۔ کیا مضائقہ ! خون ہی عروج کا زینہ ہے ۔ یہ دُنیا کارزارِ حیات ہے ۔ یہاں لاشوں کے زینے بنا کر بامِ رفعت پر چڑھنا پڑتا ہے ۔ خون کے نالوں میں تیر کر ہی فتح کا ساحل ملتا ہے ۔ گردوپیش کے واقعات کو دیکھو ۔ تاریخ دیکھو ۔ کامیاب زندگیوں کی داستان خونی حرفوں میں لکھی ہوئی ہے ۔ دلیروں نے ہمیشہ خون کے دریا کی شناوری کی ہے ۔ خون کی ہولیاں کھیلی ہیں ۔ خون کا

خوف پست ہمتی اور ضعف کی دلیل ہے ۔شُورما کی نگاہ منزل پر رہتی ہے ۔راستہ پرنہیں ۔چوٹی پر رہتی ہے ۔دامن کوہ پرنہیں ۔اب لپس وپیش کا موقعہ نہیں ۔ نیک وبد کی فکر اہل عمل کو نہیں ہوتی ۔

میں نے کھڑے ہو کر عرض کی ”غلام اس خدمت کے لئے حاضر ہے ۔“

راجہ صاحب نے نگاہ تحسین سے دیکھ کر کہا مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تمہارا دل کہتا ہے ۔کہ یہ کام پورا کر آؤ گے ۔“ ؟

”مجھے یقین ہے “

”میرا بھی یہی خیال تھا ۔ دیکھو مجھے پل پل کی خبریں بھیجتے رہنا۔اخفائے راز کامل شرط ہے ۔“

”ایشور نے چاہا ۔ تو حضور کو شکایت کا کوئی موقعہ نہ ہوگا “

”ایشور کا نام نہ لو ۔ایشور ایسے موقعوں کے لئے نہیں ہے ۔ایشور کی مدد اُس وقت مانگو جب اپنا دل کمزور ہو ۔جس کے بازوؤں میں قوت دل میں ارادہ اور عزم ۔ دماغ میں دانائی اور ہمت ہے ۔وہ ایشور کا دست نگر کیوں بنے ۔اچھا جاؤ ۔ اور جلد سُرخرو ہو کر آؤ ۔آنکھیں تمہارے انتظار میں دروازہ پر کھڑی رہیں گی “

(۲)

میں نے ضمیر کی تحریکات کو سر تک نہ اُٹھانے دیا ۔میرا نفس اس بد نصیب کو قابل گردن زدنی ثابت کرنے کے لئے دلیلیں پیش کرنے لگا ۔اُسے کیا حق تھا۔ کہ وہ سرفراز سے ایسے تعلقات رکھے ۔جب اُسے معلوم تھا۔کہ راجہ صاحب نے اُسے اپنے حرم میں داخل کر لیا ہے ۔تو یہ قریب قریب اتنا ہی سنگین جرم ہے۔ جتنا کسی بیاہتا کا اغوا کرنا ۔سرفراز ہر ایک اعتبار سے منکوحہ ہے ۔بلکہ منکوحہ

سے بھی بڑھ کر۔ ایسی حسینہ سے نامہ و پیام جاری رکھنا اور اُس پر ڈورے ڈالنا ہرگز قابل معافی نہیں۔ ایسے سنگین جُرم کی سزا بھی اتنی ہی سنگین ہو۔ تو کوئی افسوس کی بات نہیں۔ اگر میرے دل میں اس وقت تک کچھ ضعف۔ کچھ ویدھا تھا۔ تو اس دلیل نے اُسے دور کر دیا۔ حق کا انصاف جرأت کا منتظر ہے۔ اب وہ خون میری نظر دل میں خون ناحق نہیں۔ خون ناروا نہیں۔ بلکہ خون جائز تھا۔ اور اُس سے منہ موڑنا شرمناک بُزدلی۔

ٹرین جانے میں ابھی دو گھنٹہ کی دیر تھی۔ رات بھر کا سفر تھا۔ لیکن مجھے کھانے کی اشتہا مطلق نہ تھی۔ میں نے سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ بازار سے ایک نقلی داڑھی لایا۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔ ٹرنک میں وزرلوا لور رکھ لئے۔ پھر سوچنے لگا۔ کسے اپنے ساتھ لے چلوں۔ آغا نہ کیسے ہو؟ یہاں سے کسی کو لے جانا تو مصلحت کے خلاف ہے۔ پھر کیا اپنے بھائی صاحب کو تار دوں؟ ہاں یہی مناسب ہے۔ انہیں لکھ دوں مجھ سے بمبئی میں ملیں وہ چلتے ہوئے آدمی ہیں۔ لیکن نہیں۔ مفت میں بھائی صاحب کو کیوں پھنساؤں۔ کون جانے کیا ہو۔ بمبئی میں ایسے آدمیوں کی کیا کمی۔ ایک لاکھ روپے کا لالچ دوں گا۔ چٹکیوں میں کام ہو جائے گا۔ وہاں ایک سے ایک شاطر پڑے ہیں۔ بس، ان حضرت کو کسی حکمت سے کسی طوائف کے کمرہ میں بند کر کے وہیں بڑان کر دیا جائے۔ یا سمندر کے کنارے جس وقت وہ ہوا خوری کے لئے نکلیں۔

ابھی چونکہ دیر تھی۔ اس لئے سوچا۔ لاؤ سندھیا کروں۔ جونہی سندھیا کے کمرہ میں قدم رکھا۔ وہاں حسب دستور جس چیز پر نگاہ پڑی۔ وہ ماتاجی کی قد آدم تصویر تھی۔ میں یکایک چونک پڑا۔ جیسے کوئی آدمی اس وقت

چور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے۔ جب وہ سینہ دھ مار رہا ہو۔ میرا کلیجہ
دھک سے ہو گیا۔ روز یہی تصویر دیکھا کرتا تھا۔ دن میں صد بار اس پر
نگاہ پڑتی تھی۔ آج میرے دل کی جو کیفیت ہوئی وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا
وہ آنکھیں نگاہ سرزنش سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان میں کتنی تنبیہ تھی۔
کتنی شرم۔ کتنا افسوس۔ کتنی مایوسی۔ اُف! میں اُس طرف تاک نہ سکا۔ فوراً
آنکھیں جھکا لیں۔ ان آنکھوں کے سامنے کھڑے ہونے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔
وہ تصویر کی آنکھیں نہ تھیں۔ زندہ روشن متحرک آنکھیں تھیں۔ دل میں نفوذ
کرنے والی۔ نوکدار سلاح کی طرح سینہ میں چُبھنے والی۔ مجھے ایسا خوف ہوا۔ کہ
گر پڑوں گا۔ میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا سر آپ ہی آپ جُھک گیا۔ بالکل
نادانستہ، بالکل غیر محسوس طریقہ پر۔ میرے ارادوں میں، خیالات میں۔
خواہشات میں ایک انقلاب ہو گیا۔ اس صداقت کے پتلے۔ اس نور کے مجسمے
نے میری ضمیر کو منور کر دیا۔ دل میں کیا کیا جذبات پیدا ہوئے۔ اس کی مجھے خبر
نہیں۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ کہ میں ایک غیبی طاقت کے زیر اثر گھر سے نکلا۔
موٹر تیار کروائی۔ اور ۱۰ بجے راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میرے
لئے انھوں نے خاص طور پر ہدایت کر دی تھی۔ جس وقت چاہوں۔ اُن سے
ملوں۔ میں جا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ حضور کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں
راجہ صاحب، اس عقدہ کو اپنی دانست میں حل کر چکنے کے بعد اس وقت
اطمینان کے سانس لے رہے تھے۔ بوجھ سر سے اُتار کر وہ دم لے رہے تھے۔
مجھے دیکھ کر انہیں فراست سے کسی نئی اُلجھن کا گمان ہوا۔ چیں بجبیں ہو گئے۔
مگر ایک ہی لمحہ میں مصلحت غالب آ گئی۔ شگفتہ رو ہو کر بولے:۔
"ہاں، ہاں۔ کہئے! کوئی خاص بات۔؟

میں نے بے خوف و بے جھجک کہا " مجھے اس کام سے معذور رکھئے "
راجہ صاحب کا چہرہ سفید ہو گیا۔ میری طرف وحشت سے دیکھ کر پوچھا
"اس کا مطلب ؟"

"مجھ سے وہ کام نہ ہو سکے گا۔"

"کیوں ؟"

"مجھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے"

مہاراجہ صاحب نے شعلہ آمیز نظروں سے دیکھ کر فرمایا :۔
"شاید ضمیر بیدار ہو گیا ..... کیوں ؟ وہی بیماری جو پست ہمتوں اور نامردوں کو ہوا کرتی ہے۔ اچھی بات ہے جاؤ۔"

"حضور ! میں اپنے میں وہ قابلیت نہیں پاتا۔"

راجہ صاحب نے شیر کی طرح آتشیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرج کر کہا " مت بکو۔ نمک .... "

پھر کچھ نرم ہو کر بولے " تمہاری تقدیر میں عروج اور ثروت نہیں۔ میں نے تمہیں وہ موقع دیا تھا جسے کوئی دوسرا آدمی امداد غیب سمجھتا۔ مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تمہاری تقدیر تم سے پھری ہوئی ہے۔ ہمیشہ غلامی کرو گے اور ٹھوکریں کھاؤ گے۔ تم جیسے آدمیوں کے لئے گیروے بانے ہیں۔ اور کاسہ گدائی۔ اور ایک گوشہ غار۔ نیک و بد کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اسی کی ضرورت ہے۔ دنیا مردوں کے لئے ہے "

میں خاموش تھا پچھتا رہا تھا پہلے ہی کیوں نہ یہ عذر کیا تھا۔

راجہ صاحب نے ایک لمحہ کے بعد پھر کہا " اب بھی موقعہ ہے پھر سوچو..... "

میں نے اسی بیباکانہ انداز سے کہا "میں نے خوب سوچ لیا۔ مجھ سے ...!"
راجہ صاحب ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر بولے "بہتر ہے جاؤ۔ اور آج ہی شب کو میرے حدود کے باہر نکل جاؤ"۔ ممکن ہے۔ کل تمہیں پھر یہ موقع نہ ملے۔

اُسی رو میں انھوں نے مجھے نمکحرام۔ کج فہم۔ کمینہ اور جانے کیا کیا کہا۔ میں نے سلام کیا اور چلا آیا۔ اور اُسی رات کو یکہ وتنہا چند کپڑے اور نقد روپیہ کا صندوق لئے ہوئے گھر سے نکل پڑا۔ ہاں وہ تصویر میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

اِدھر آفتاب حدودِ مشرق میں آیا۔ اور میں ریاست کے حدود سے نکل کر انگریزی علاقہ میں آپہنچا۔



ماں

(۱)

آج قیدی چھوٹ کر گھر آ رہا ہے۔ کرونا نے ایک دن پہلے ہی گھر لیپ پوت رکھا تھا۔ اس تین سال میں اس نے اپنا پیٹ اور تن کاٹ کر جو دس پانچ روپے جمع کر رکھے تھے وہ اُس نے اپنے پیارے شوہر کی خاطر و خیر مقدم کی تیاریوں میں صرف کئے۔ اُس کے لئے دھوتیوں کا نیا جوڑا لائی تھی۔ نئے کرتے بنوائے تھے۔ بچہ کے لئے نیا فراک اور کنٹوپ بنایا۔ بار بار بچہ کو چھاتی سے لگاتی اور خوش ہوتی۔ وہ اس پیارے بچہ کو شوہر کی گود میں دیدے گی۔ تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔ اس خیال کا دل میں مزہ لے کر وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ آتے ہی آتے وہ اُسے گود میں اٹھا لیں گے۔ پیار کریں گے اور کہیں گے۔ کرونا تم نے یہ رتن دے کر مجھے نہال کر دیا۔ قید کی ساری مصیبتیں اور سختیاں بچہ کی توتلی باتوں میں بھول جائیں گی۔ اُس کی ایک طفلانہ معصوم نگاہ میں سارے غم دھل جائیں گے۔ وہ سوچتی تھی اُن کے ساتھ بہت سے آدمی ہوں گے جس وقت وہ دروازہ پر پہنچیں گے جے۔ جے کے نعرے بلند ہوں گے۔ اور لوگ اُن پر پھولوں کی برکھا کریں گے۔ کتنا پاک نظارہ ہوگا۔ اُن آدمیوں کو بٹھانے کے

لئے کرونا نے ایک چھوٹا سا ٹھاٹ بچھا رکھا تھا کچھ پان بھی بنا لئے تھے۔ اور بار بار منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی تھی۔ شوہر کی وجیہہ مردانہ صورت بار بار آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ اُن کی وہ باتیں بار بار یاد آتی تھیں۔ جو چلتے وقت اُن کی زبان سے نکلی تھیں۔ اُن کا وہ استقلال، وہ ضبط، جو پولیس کی دست درازیوں میں بھی اٹل رہا تھا۔ وہ تبسم جو اس وقت بھی ان کے لبوں کو شگفتہ کر رہا تھا۔ وہ خودداری جو اس وقت بھی اُن کے چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ کیا کرونا کے دل سے محو ہو سکتی تھی۔ اُس کی یاد آتے ہی کرونا کے چہرہ پر ... ر کی سُرخی نمایاں ہوگئی۔ یہی وہ سہارا تھا جس نے ان تین برسوں کی کڑی ... ی سخت آزمائشوں میں اُس کے دل کو تقویت دی تھی۔ راتیں فاقوں سے ... ندریں۔ اکثر گھر میں چراغ جلنے کی نوبت بھی نہ آتی تھی۔ مگر حرف التجا کبھی اُس ... سالی زبان پر نہ آیا آج اُن ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اُن کے آغوش ... سا محبت میں وہ سب کچھ ہنس کر جھیل لے گی۔ اس لازوال دولت کو پا کر دُ ... ے پھر کسی چیز کی آرزو نہ رہے گی۔

شام ہو رہی تھی۔ قضا کارہ نوردازل ... پنی منزل کی طرف لپکا چلا جاتا تھا۔ جہاں افق نے اُس کے لئے سنہرا فرش بچھا ... رکھا تھا اور آرام گاہ میں پھولوں کی سیج بچھا دی تھی۔ اُسی وقت مکان ... کے سامنے میدان میں ایک آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ گویا کہ ... جہاں یہ لمبا مسافر کا تازہ ... ہر قدم پر رُک جاتا تھا۔ کھانسنے لگ ... تا تھا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کرونا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ رفتار ... سے معلوم ہوتا تھا کوئی بوڑھا آدمی ہے۔ مگر ایک منٹ میں جب وہ قریب آ ... یا تو کرونا پہچان گئی۔ اُس کا پیلا ... شوہر ہی تھا۔ لیکن آہ! اس کی صورت کتنی ... ہو گئی تھی ... پر تی

رخصت ہوگئی تھی۔ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ نہ کوئی یار، نہ مددگار! ایک آدمی بھی ساتھ نہیں! کرونا اُسے پہچانتے ہی دروازہ کے باہر آگئی۔ مگر شوہر سے بغلگیر ہونے کا اشتیاق دل میں دب کر رہ گیا۔ سارے ولولے خاک میں مل گئے۔ آنسوؤں کے سیلاب میں ساری خوشیاں بہہ گئیں، فنا ہوگئیں۔

آدیتہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی مُسکرا کر کرونا کو دیکھا۔ مگر مسکراہٹ میں درد کا ایک دریا بھرا ہوا تھا۔ کرونا ایسی بحس ہوگئی تھی۔ گویا بدن میں جان ہی نہ ہو۔ گویا دل کی حرکت بند ہوگئی ہو۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے شوہر کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ پر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ نہ مزاج پرسی کا۔ نہ خیر مقدم کا۔ نہ رنج کا۔ بچہ اُس کی گود میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے اس تودۂ استخوان کو دیکھ رہا تھا۔ اور ماں کی گود سے چمٹا جاتا تھا۔ وہ بھول گئی کہ میری گود میں بچہ ہے۔

آخر اس نے دردناک لہجہ میں کہا۔ یہ تمہاری کیا حالت ہے۔ بالکل پہچانے نہیں جاتے۔

آدیتہ نے اُس کی تشویش کو رفع کرنے کے خیال سے مُسکرانے کی کوشش کرکے کہا۔ کچھ نہیں۔ ذرا دُبلا ہو گیا ہوں۔ اب تمہارے ہاتھوں کی روٹیاں کھا کر پھر توانا ہو جاؤں گا۔

کرونا۔۔۔۔۔ رام۔۔۔۔ رام۔ بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ کیا وہاں کھانا بھی نہیں ملتا۔ تم تو کہتے تھے۔ پولٹیکل قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور وہ تمہارے ساتھی کیا ہوئے جو تمہیں رات دن گھیرے رہتے تھے۔ اور تمہارے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے؟

آدتیہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ بولے۔ یہ بہت تلخ تجربہ ہے۔ کرونا مجھے نہ معلوم تھا کہ میرے قید ہوتے ہی لوگ میری طرف سے آنکھیں پھیر لینگے کوئی پُرسان حال نہ ہوگا۔ قوم پر مٹنے والوں کا یہی انعام ہے۔ یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا لیکن اپنے رفیق اور غمگسار بھی اتنے بیوفا ہوتے ہیں۔ اس کا مجھے نیا تجربہ ہوا۔ مگر مجھے کسی سے شکایت نہیں۔ قوم کی خدمت خود اپنا انعام ہے۔ میری حماقت تھی۔ کہ اس کے لئے صلہ یا تحسین چاہتا تھا۔

کھانے پینے کا قصہ نہ پوچھو کرونا، بڑی دردناک کہانی ہے میں فاقے کر چکا ہوں۔ بس یہی غنیمت سمجھو کہ زندہ آگیا۔ تمہارے درشن بدے تھے۔ ورنہ تکلیفیں تو ایسی ایسی اُٹھائیں کہ اب تک مجھے رخصت ہو جانا چاہئے تھا جیل کے قیدی کتے سے بھی بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ اور کھانا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کتا بھی نہ سونگھے۔

کرونا۔ تو چل کر کچھ کھالو۔ نہیں ... ... یہیں لاتی ہوں۔ کچھ کھا کر آرام سے لیٹو۔ (بچے سے) بابوجی ہیں۔ بیٹا..... تمہارے بابوجی۔

آدتیہ نے پشیمان نظروں سے بچے کو دیکھا اور اُن کا ایک ایک رُواں انہیں نفریں کرنے لگا۔ اپنی خستہ حالی پر انہیں کبھی اتنا صدمہ نہ ہوا تھا۔ کاش اُن کی حالت اب کے سنبھل جاتی۔ تو وہ پھر قومی تحریکوں کے قریب نہ جاتے۔ اس پھول سے بچے کو یوں دُنیا میں لا کر اس بیکسی اور افلاس کا شکار بنانے کا انہیں کیا حق تھا۔ وہ ایک بار پھر دنیا کی پرستش کریں گے۔ اور اس بچے کی پرورش و پرداخت کے لئے اپنے کو نثار کردیں گے۔ انہیں اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ بچہ انہیں شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے۔ تم نے میرے

ساتھ اپنا کونسا فرض ادا کیا۔ ان کا سارا اشتیاق سارا پیار بچہ کو سینہ سے لگا لینے کے لئے تڑپ اُٹھا۔ مگر ہاتھ نہ پھیل سکے۔ ہاتھوں میں طاقت نہ تھی۔

کرونا بچہ کو لئے ہوئے اُٹھی اور ایک تھالی میں کچھ کھانا نکال کر لائی۔ آدتیہ نے حریص نظروں سے تھالی کی طرف دیکھا۔ گویا مدت کے بعد کوئی کھانے کی چیز سامنے آئی ہے۔ وہ جانتا تھا۔ ہفتوں کی فاقہ کشی کے بعد اور صحت کی اس گئی گذری حالت میں یہ پُرتکلف چیزیں اسے ہضم نہ ہوں گی۔ لیکن وہ صبر نہ کر سکا۔ تھالی پر ٹوٹ پڑا۔ اور دم زدن میں تھالی صاف کر دی۔ کرونا اُن کی یہ پُرخوری دیکھ کر ڈر گئی۔ اس نے دوبارہ کسی چیز کے لئے نہ پوچھا۔ تھالی اُٹھا کر چلی گئی۔ اور لالٹین جلانے بیٹھی ہی تھی۔ کہ کانوں میں آواز آئی "کرونا۔!

کرونا نے جلدی سے لالٹین جلائی اور دوڑی ہوئی آدتیہ کے پاس آ کر بولی تم نے مجھے پکارا ہے۔؟

آدتیہ نے جواب نہ دیا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور سانس زور سے چل رہی تھی۔ ہاتھوں کے سہارے ٹاٹ گئے تھے۔ کرونا گھبرا گئی۔ بولی تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ جا کر کسی وید کو بلا لاؤں۔؟

آدتیہ نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر کے کہا فضول ہے کرونا۔ اب تم سے چھپانا فضول ہے۔ مجھے تپ دق ہو گیا ہے۔ اس تین سال کی متواتر تکلیف فکر اور فاقہ کشی نے آخر مجھے اس مرض کا شکار بنا ڈالا۔ کئی بار مرتے مرتے بچ گیا ہوں۔ تمہیں دیکھنے کی آرزو باقی تھی۔ شاید اسی لئے جان نہ نکلتی تھی۔ اب کوئی بہانہ نہیں رہا۔ دیکھو روؤ مت۔

کرونا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں ابھی وید جی کو لئے آتی ہوں۔

آدتیہ سب بے سود ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ہے۔ ایک قدم بھی چلنا محال تھا۔ مجھے تو یہی تعجب ہے کہ یہاں پہنچ کیسے گیا۔ نہ جانے کونسی غیبی طاقت مجھے یہاں لائی۔ شاید وہ اس بجھتے ہوئے چراغ کی آخری جھلک تھی۔ آہ! میں نے تمہارے لئے کچھ نہ کیا۔ کوئی آرام نہ دے سکا۔ تمہارے ساتھ بڑی بے انصافی کی محض سُہاگ کا داغ لگا کر اور ایک بچہ کی پرورش کا بار چھوڑ کر چلا چلا جا رہا ہوں۔ افسوس!

کرونا نے دل مضبوط کرکے کہا۔ تمہیں کہیں درد ہو رہا ہے؟ آگ بنالا دوں۔ کچھ بتلاتے کیوں نہیں۔

آدتیہ نے کروٹ بدل کر کہا۔ کوئی ضرورت نہیں۔ کہیں درد نہیں۔ بس ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے۔ گویا پانی میں ڈوبا جاتا ہوں۔ زندگی کا کھیل ختم ہو رہا ہے۔ چراغ کو بجھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کب آواز بند ہو جائے۔ اب جو کچھ کہنا ہے۔ کہہ ڈالوں گا۔ کیوں یہ حسرت لے جاؤں میرے ایک سوال کا جواب دو گی۔ پوچھوں۔

کرونا کے دل کا سارا ضعف، ساری مایوسی، سارا غم، سارا درد غائب ہو گیا۔ اُس کی جگہ وہ روحانی طاقت رُونما ہوئی جو موت پر ہنستی ہے۔ اور مصائب سے کھیلتی ہے۔ جواہر نگار خول کے اندر جیسے تیز تلوار چھپی رہتی ہے۔ پانی کے نغمہ شیریں میں جیسے بعید القیاس قوت چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کا نازک دل صبر اور استقلال کو اپنی گود میں چھپائے رہتا ہے۔ غصہ جیسے تلوار کو باہر کھینچ لیتا ہے۔ علم جیسے پانی کی مخفی طاقت کو بے نقاب کر دیتا ہے اُسی طرح اُلفت حسینہ کے صبر اور استقلال کو بیدار کر دیتی ہے۔

کرونا نے آہستہ سے شوہر کا سر اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور بولی:-

پوچھو پیارے۔ کیا پوچھتے ہو۔؟

آدیتیہ نے کرونا کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمہارے خیال میں میری زندگی کیسی تھی۔؟ رنج کرنے کے قابل، یا خوش ہونے کے قابل! دیکھو تم نے مجھ سے کبھی پردہ نہیں کیا۔ اس وقت بھی پردہ نہ رکھنا۔ تمہارے خیال میں مجھے اپنی زندگی پر رونا چاہیئے یا ہنسنا چاہیئے۔؟

کرونا نے جوش کے ساتھ کہا۔ تمہاری زندگی دیوتاؤں کی زندگی تھی۔ بالکل بے غرض ایلے لوث، ضرورتوں سے تنگ آ کر میں نے بار ہا تمہیں دُنیا کی طرف کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں اس وقت بھی دل میں سمجھ رہی تھی۔ کہ میں تمہیں اونچے درجہ سے گرا رہی ہوں۔ شاید تم مال و متاع کی طرف زیادہ مائل ہوتے تو میرے نفس کو زیادہ اطمینان ہوتا لیکن میری آتما کو وہ غرور اور سرور کبھی نہ ہوتا۔ جو اس وقت مجھے ہو رہا ہے۔ میں اگر کسی کو اچھی دعا دے سکتی ہوں تو وہ یہی ہو گی کہ اُس کی زندگی تمہاری جیسی ہو۔

یہ کہتے کہتے کرونا کے چہرہ پر ایک نورانی جھلک نمودار ہوئی۔ گویا اس کی ہستی کا ایک ایک ذرہ پاکیزہ ہو گیا ہو۔

آدتیہ کا زرد اور مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ آنکھوں میں ایک نورانی مستی پیدا ہو گئی۔ اس دم واپسیں کے ایک لمحے میں اسے وہ سرور حاصل ہوا۔ جو کبھی ساری زندگی میں نہ ہوا تھا۔ اس نے پُر غرور نظروں سے کرونا کو دیکھ کر کہا۔ بس اب مجھے اطمینان ہو گیا کرونا! مجھے اب اپنے بچے کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں اُسے اس سے بہتر ہاتھوں میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی کا یہی اونچا معیار تمہارے سامنے ہمیشہ رہے گا۔ اب میں خوشی سے مرنے کے لئے تیار ہوں۔

(۲)

سات سال گزر گئے۔ بچہ پرکاش اب دس سال کا خوبصورت، مضبوط دل فریب لڑکا تھا۔ بلا کا ذہین، مغرور اور دلیر۔ زمانہ کرونا کو بدنصیب سمجھے۔ وہ خود کبھی اپنی قسمت کا گلہ نہیں کرتی۔ اس کے پاس کچھ زیور رکھتے۔ اُن سے اُس نے تین چار بھینسیں اور گائیں لے لیں۔ اور خالص دودھ کے خواستگار ٹوٹ پڑے۔ اس کا سارا دودھ گھر بیٹھے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ یہی اس کی گزران کی صورت تھی۔ اُسے پہر رات سے پہر رات تک مویشیوں کی داشت و پرداخت میں مصروف رہنا پڑتا۔ پھر بھی وہ اپنے حال پر خوش ہے۔ اس کے چہرہ پر مایوسی اور بیکسی کی زردی نہیں۔ عزم اور ہمت کا جلال ہے۔ ایک ایک عضو سے خود داری کی شان ٹپک رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک روحانی غرور ہے۔ خاموش، متین اور عمیق۔ حسرتیں اور کلفتیں۔ وہ بیوگی کا غم۔ وہ بیکسی کا غم سب اس گہرائی میں فنا ہو گئے ہیں۔ پرکاش پر وہ جان دیتی ہے۔ اس کی خوشیاں۔ اس کی تمنائیں۔ اُس کی دنیا۔ اس کی جنت، سب کچھ پرکاش پر نثار ہے۔ مگر یہ مجال نہیں کہ پرکاش کوئی شرارت کرے۔ اور کرونا اغماض کر جائے۔ نہیں، وہ اس کے اطوار کی بڑی بیدردی سے نگرانی کرتی ہے۔ وہ پرکاش کی صرف ماں نہیں۔ ماں اور باپ دونوں ہے۔ اُس کے برتاؤ میں ماں کے پیار کے ساتھ۔ باپ کی تندی بھی شامل ہے۔ شوہر کے آخری الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ وہ روحانی مستی جو ان کی آنکھوں میں چھا گئی تھی۔ وہ غرور جو اُن کے چہرہ پر دوڑ گیا تھا۔ ابھی تک اُس کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ شب و روز کی یاد نے آدیتہ کو اُس کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ وہ دنیا کے لئے مر گئے ہیں۔ اس کے لئے زندہ ہیں۔

اُسے ہمیشہ اُن کی ہستی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ آدتیہ کی روح اس کی ہر حال میں شریک ہے۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ پرکاش جوان ہوکر اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصود ہے۔ اس زندگی کا جو درد اور غم کی ایک داستان ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ ایک بھکارن دروازہ پر آکر بھیک مانگنے لگی۔ پرکاش دروازہ پر کھیل رہا تھا۔ شرارت سوجھی۔ گھر میں گیا۔ اور ایک کٹورے میں تھوڑا سا بھوسہ لایا۔ بھکارن نے اپنی جھولی پھیلا دی پرکاش نے وہ بھوسہ جھولی میں ڈالدیا۔ اور زور سے تالیاں بجاتا بھاگا بھکارن نے قہر کی نگاہ سے دیکھا اور بولی واہ رے لاڈلے۔ مجھ سے ہنسی کرنے چلا ہے۔ کیا یہی ماں باپ نے سکھایا ہے۔؟ تب تو خوب کُل کا نام جگاؤ گے۔!

کرونا باہر نکل آئی اور بولی۔ کیا ہے ماتا، کسے کہہ رہی ہو۔؟

بھکارن نے پرکاش کی طرف اشارہ کرکے کہا وہ تمہارا لڑکا ہے نہ؟ دیکھو کٹورے میں بھوسہ بھر کر میری جھولی میں ڈال گیا ہے۔ تھوڑا سا آٹا تھا وہ بھی مٹی میں مل گیا۔ کوئی اس طرح دکھیاروں کو ستاتا ہے۔ سب کے دن ایک سے نہیں رہتے آدمی کو گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے۔

کرونا نے کرخت لہجہ میں پکارا...... پرکاش!

پرکاش نادم نہ ہوا۔ تمکنت کے انداز سے سر اٹھائے ہوئے آیا۔ اور بولا۔ یہ کیوں ہمارے یہاں بھیک مانگنے آتی ہے! کچھ کام نہیں کرتی۔!

کرونا خفیف ہوکر بولی۔ شرم تو نہیں آتی۔ اُلٹے زبان درازی کرتے ہو۔

کرونا نے بڑھیا کو آٹا دال دے کر رخصت کیا۔ مگر پرکاش کی یہ حرکت اس کے دل میں پھوڑے کی طرح ٹیستی رہی۔ یہ شرارت اُس نے کہاں سیکھی۔؟

رات کو بھی اُسے بار بار یہی خیال ستاتا رہا۔

آدھی رات کے قریب یکا یک پرکاش چونکا تو دیکھا لالٹین جل رہی ہے۔ اور کرونا بیٹھی رو رہی ہے۔ بولا اماں! ابھی تم سوئیں نہیں؟ کرونا نے منہ پھیر کر کہا۔ نیند نہیں آئی۔ تم کیسے جاگ گئے۔؟ پیاس تو نہیں لگی ہے۔؟

پرکاش۔ میرا قصور معاف کرو۔ اب میں پھر ایسی شرارت نہ کروں گا۔

یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ کرونا نے اُسے گلے لگا لیا۔ اور بولی۔ بیٹا مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہو یا تمہارے دل میں سچ مچ پچھتاوا ہو رہا ہے۔؟

پرکاش نے سسکتے ہوئے کہا نہیں اماں! مجھے دل سے افسوس ہو رہا ہے۔ ابکی وہ بڑھیا آئے گی تو میں اُسے پیسے دُوں گا۔

کرونا کا چہرہ غرور سے سُرخ ہو اُٹھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ آدتیہ سامنے کھڑے بچے کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اور کچھ کہہ رہے ہیں۔ کرونا! رنجیدہ مت ہو۔ تیری ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔

(۳)

نوجوان پرکاش کے قول اور فعل میں مناسبت نہ تھی۔ اور دنوں کے ساتھ اس کے کیریکٹر کا یہ پہلو نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ زبان سے وہ قوم کا سچا ہمدرد اور جاں نثار تھا۔ مگر قوم کے لئے کسی قسم کے ایثار کی ضرورت نہ سمجھتا تھا ذہین تھا ہی۔ یونیورسٹی سے اُسے وظیفے ملتے تھے۔ کرونا بھی اس کی مدد کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا خرچ پورا نہ پڑتا تھا۔ وہ کفایت شعاری اور سادہ معاشرت پر عالمانہ تقریریں کر سکتا تھا۔ مگر وضع اور قطع یونیورسٹی کے فیشن ایبل طلباء سے جو بھر بھی کمتر نہ ہوتی تھی۔ نمود و نمائش کی دھن اُسے ہمیشہ سوار رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی تھی۔

دل قوم کی طرف تھا۔ دماغ اپنی طرف۔ مگر دماغ کے مقابلہ میں دل کی ایک نہ چلتی تھی۔ قوم کی خدمت اوسر کی کھیتی تھی۔ وہاں غربت اور تنگدستی کے سوا اور کیا تھا۔ بڑے سے بڑا صلہ جو مل سکتا تھا۔ وہ تھی قوم کی عقیدت، ہر دلعزیزی، نیک نامی۔ مگر وہ بھی پائدار نہیں۔ اتنی عارضی کہ ایک غلطی میں عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر سکتا تھا۔ اس کا دل ایک بے اختیاری جوش کے ساتھ امیرانہ زندگی کی طرف مائل ہوتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسے افلاس اور غربت سے نفرت ہونے لگی۔ وہ پست حالی کو ہمدردی کے قابل نہیں نفرت کے قابل سمجھتا تھا۔ اور اس کی ذمہ داری قوم کے سر منڈھتا تھا۔ دماغ میں درد کہاں، احساس کہاں۔ اس کا جوہر تو دلیل ہے۔ ذہانت ہے۔ حوصلہ ہے۔

سندھ میں سیلاب آیا۔ ہزاروں آدمی تباہ ہو گئے۔ یونیورسٹی نے سیلاب زدوں کی امداد کے لئے ایک سیوا سمتی بھیجی۔ پرکاش نے پہلے بڑی سرگرمی اور خلوص کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے اندر یہ جنگ برابر جاری رہی کہ کیوں نہ اس اثنا میں بیٹھ کر کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کروں۔ تاکہ اول درجہ میں پاس ہو جاؤں۔ آخر روانگی کے وقت وہ بیماری کا بہانہ کر کے بیٹھ رہا۔ گرونا نے سنا تو اسے بہت رنج ہوا۔

چند ہی مہینوں کے بعد اڑیسہ میں قحط نے آفت برپا کر دی کانگریس نے قحط زدوں کی امداد کے لئے ایک مشن تیار کیا۔ اسی زمانہ میں یونیورسٹی نے طلباء کو تاریخی یادگاروں کا مطالعہ کرنے کے لئے لنکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ گرونا نے لکھا تم اڑیسہ جاؤ۔ مگر پرکاش کا دل لنکا کی جانب مائل تھا۔ وہ کئی دن تک اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر لنکا کی کشش غالب آئی۔ گرونا کو معلوم ہوا تو اسے بے انتہا صدمہ ہوا۔ مگر جب پرکاش نے لکھا۔ اماں! میں یہ سب تیاریاں

قومی خدمت کے لئے کر رہا ہوں۔ کیونکہ خدمت کے لئے یونیورسٹی کی ڈگریوں ہی کی قدر ہوتی ہے۔ دلسوزی اور لگن کوئی نہیں دیکھتا۔ تو کرونا کو تشفی ہوگئی۔

اُسی سال پرکاش اوّل درجہ میں ایم۔ اے ہوا۔ اور یونیورسٹی میں اول آیا۔

(۴)

یونیورسٹی کھلتے ہی پرکاش کے نام یونیورسٹی کے رجسٹرار کا خط پہنچا۔ انھوں نے پرکاش کو انگلینڈ جاکر تعلیم کی تکمیل کے سرکاری وظیفہ منظور ہونے کی خبر دی تھی۔ پرکاش خط لئے ہوئے مجنونانہ مسرت سے ماں کے پاس دوڑا۔ اور بولا۔ اماں! مجھے انگلینڈ جاکر پڑھنے کے لئے سرکاری وظیفہ ملا ہے۔

کرونا نے بے اعتنائی سے کہا۔ تو تمہارا کیا ارادہ ہے۔؟

پرکاش نے تعجب سے کہا:۔ ایسا موقع پاکر بھلا کون چھوڑتا ہے۔ اماں۔!

کرونا۔ تم تو قومی والنٹیروں میں بھرتی ہونے جا رہے تھے۔

پرکاش۔ تو کیا آپ سمجھتی ہیں وہی ایک قومی خدمت ہے۔ میں انگلینڈ سے آکر بھی تو قومی کام کر سکتا ہوں۔ اور اماں سچ پوچھو تو ایک مجسٹریٹ قوم کی جتنی خدمت کر سکتا ہے۔ اتنی ایک ہزار والنٹیر بھی نہیں کر سکتے۔ میں سول سروس کے امتحان میں بیٹھوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کامیاب ہوجاؤنگا۔

کرونا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ تو تم بھی مجسٹریٹ ہو جاؤ گے۔

پرکاش نے مباحثہ کے انداز سے کہا۔ قومی درد رکھنے والا مجسٹریٹ کانگریس کے ایک ہزار پریسیڈنٹوں سے زیادہ قومی خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے کام کی اخباروں میں تعریفیں نہ ہوں گی۔ اس کی تقریروں پر تالیاں

نہ بجیں گی۔ اس کی گاڑیاں جہلا نہ کھینچیں گے۔ نہ یونیورسٹی کے طلبا ر اسے سپاسنامے پیش کریں گے۔ لیکن حقیقی معنوں میں جو خدمت وہ کرسکتا ہے۔ وہ دوسرا نہیں کرسکتا۔ وہ قوم کا خاموش بے غرض خادم ہے۔

کرونا۔ لیکن یہی مجسٹریٹ تو قومی خدمت کرنے والوں کو سزائیں دیتے ہیں۔ ان پر گولیاں چلاتے ہیں۔

پرکاش نے کچھ خفیف ہو کر کہا۔ یہ تو مجسٹریٹ کی طبیعت ہے۔ اگر اس کے دل میں قومی درد ہے۔ تو وہ ملائمت سے وہی کام کرسکتا ہے۔ جو دوسرے گولیاں چلا کر بھی نہیں کرسکتے۔

کرونا۔ میں یہ نہ مانوں گی۔ سرکار اسے کوئی ایسا کام نہ کرنے دیگی۔ جس سے سرکار کی شان میں کوئی فرق آئے۔ اگر مجسٹریٹ اس کی مرضی کے مطابق کام نہ کرے گا۔ تو وہ مجسٹریٹ نہ رہے گا۔ وہ ہندوستانی مجسٹریٹ ہی تو تھا جس نے تمہارے بابوجی کو ذرا سی بات پر تین سال کی قید ٹھونک دی تھی۔ اور اس نے آخر ان کی جان ہی لے کر چھوڑی۔ بیٹا تم میری اتنی بات مان لو۔ سرکاری عہدوں پر نہ گرو۔ مجھے یہ منظور ہے۔ کہ تم موٹا کھا کر اور موٹا پہن کر اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کرو۔ بجائے اس کے کہ تم حاکم بن جاؤ۔ اور شان سے زندگی بسر کرو۔ یہ سمجھ لو کہ جس دن تم حاکم کی کرسی پر بیٹھو گے، اسی دن تمہارا دماغ حاکموں کا ہو جائے گا۔ تم کوئی ایسی کارگزاری دکھانی چاہو گے۔ کہ افسروں کی نگاہ میں تمہاری نیکنامی ہو۔ ترقی ہو۔ جس کا کھاؤ گے اس کا گاؤ گے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔

پرکاش۔ تو آپ یہ چاہتی ہیں۔ کہ میں زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا پھروں؟

کرونا۔ اگر ٹھوکر کھانے سے آتما آزاد رہ سکتی ہے۔ تو میں کہوں گی۔

ٹھوکریں کھانا اچھا ہے۔

پرکاش نے جواب دیا۔ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اور اسی غصہ میں رجسٹرار کو لکھ دیا۔ مجھے انگلینڈ جانا منظور نہیں ہے۔ مگر اُس دن سے اُس کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ مغموم متفکر اپنے کمرہ میں پڑا رہتا۔ نہ کہیں گھومنے جاتا۔ نہ کسی سے ملتا۔ منہ لٹکا کر گھر میں آتا۔ دو چار لقمے کھاتا اور باہر چلا جاتا۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ نہ چہرہ پر وہ سرخی رہی نہ تازگی۔ معلوم ہوتا تھا۔ برسوں کا مریض ہے۔ ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا۔ گویا اس انکاری خط کے ساتھ اس کی حرارت۔ ساری زندگی رخصت ہو گئی۔ کرونا اس کا دل بہلانا چاہتی۔ اس غم کو بھلا دینا چاہتی مگر سب بے سود۔

آخر ایک دن اُس نے پرکاش سے کہا۔ بیٹا اگر تم نے ولایت جانے کی ٹھان ہی لی ہے۔ تو جاؤ میں منع نہ کروں گی۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں نے تمہیں ناحق روکا۔ میں نے تو اس خیال سے منع کیا تھا۔ کہ تمہیں قومی خدمت کرتے دیکھ کر تمہارے بابو جی کی آتما خوش ہو گی۔ یہی اُن کی آخری وصیت تھی۔ مگر جب تمہیں اتنا صدمہ ہے تو نہ روکوں گی۔

پرکاش نے ترشی سے جواب دیا۔ اب تو انکاری خط لکھ چکا۔ کوئی دوسرا آدمی چن لیا گیا ہوگا۔ اب کس منہ سے پھر درخواست کروں۔ اور پھر کرنا ہی کیا ہے۔ جب آپ کی مرضی ہے کہ گاؤں گاؤں کی خاک چھانوں۔ تو وہی سہی۔

کرونا کا غرور پامال ہو گیا۔ بولی! مجھے یقین ہے ابھی جگہ خالی ہو گی۔ کل لکھ دو۔ اب جانے کو تیار رہوں۔

پرکاش نے چڑ کر کہا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اماں! لوگ ہنسی اڑائینگے میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے۔ کہ جس طرح آپ کی منشا ہو گی۔ اسی طرح زندگی

بسر کروں گا۔

کرونا نے منہ پھیر کر کہا۔ یہ میری یا کسی غیر کی منشا کی بات نہیں ہے۔ یہ خیال تو تمہارے دل میں خود بخود پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ جب تم نے میری منشا سے، مجھ پر احسان جتا کر اپنے دل پر جبر کر کے مجھے اپنے راستہ کا کانٹا سمجھ کر، والنٹیروں میں نام لکھا بھی لیا۔ تو کیا فائدہ۔؟ تم آج ہی لپنے رجسٹرار کو لکھ دو۔

پرکاش۔ اب نہیں لکھ سکتا۔

کرونا۔ اس سے کیا فائدہ کہ نہ ادھر کے رہو نہ اُدھر کے۔ بیدل قومی کارکن سے سرگرم سرکاری افسر کہیں اچھا۔

پرکاش۔ مجبوری ہے۔

کرونا نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ ذرا دیر میں کپڑے بدل کر باہر چلی گئی۔ پرکاش نے دیکھا وہ کہیں جا رہی ہے۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ کرونا کے لئے باہر آنا جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مگر جب شام ہو گئی۔ اور وہ نہ لوٹی تو پرکاش کو اندیشہ ہوا۔ وہ افسوس کرنے لگا۔ کہ میں نے اماں سے پوچھا کیوں نہیں کہاں جا رہی ہو؟ جُوں جُوں رات گزرنے لگی۔ اس کا اندیشہ خوف کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اب اُسے یاد آیا۔ ماں کے ہاتھ میں چھوٹا بیگ بھی تھا۔ اگر کہیں قریب ہی گئی تو بیگ کیوں لے گئی۔؟ تو کیا کہیں دور چلی گئی۔ آخر گئی تو کہاں۔ جب وہ ۱۰ بجے تک نہ لوٹی۔ تو پرکاش کو ایک دوسرا ہی خوف پیدا ہوا وہ گھر سے نکلا اور سیدھا دریا کی طرف جا پہنچا۔ مگر وہاں گہرا سناٹا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کئی بار کانپتی ہوئی آواز سے پکارا۔ اماں! اماں!! مگر لہروں کے ماتمی راگ کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی۔

وہیں بیٹھ کر وہ رونے لگا۔ مگر اُسے پھر خیال ہوا۔ کہیں اماں آ نہ گئی ہوں ۔ اُسے گھر پر نہ دیکھ کر گھبرا نہ رہی ہوں۔ وہ فوراً اُٹھا۔ اور تیزی سے قدم اٹھایا۔ گھر چلا۔ امید و بیم سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر کرونا ابھی تک نہ لوٹی تھی ۔

پرکاش نے ساری رات بیٹھے بیٹھے کاٹی۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے۔ اپنی ضد اور ماں کی دل شکنی پر صدمہ ہوتا۔ اپنی بے حسی پر غصہ آتا ۔ میں نے کیوں اماں کی بات نہ مانی ۔؟ کیوں دولت و ثروت کے لئے ان کی تمناؤں کا خون کیا ؟ اُس نے ارادہ کیا۔ اب بھول کر بھی انگلینڈ کا نام نہ لوں گا۔ اس طرح ہنس کھیل کر زندگی بسر کروں گا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ علی الصباح پرکاش ماں کی تلاش میں نکل ہی رہا تھا کہ اُسے سامنے آتے دیکھا۔ چہرہ زرد۔ دل بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی اُس کا سہاگ اُٹھ گیا ہے۔ گویا دنیا میں اب اس کے لئے کچھ نہیں رہا۔ گویا وہ دریا کے کنارے کھڑی اپنی لدی ہوئی ناؤ کو ڈوبتے دیکھ رہی ہے۔ اور کچھ کر نہیں سکتی ۔

پرکاش نے دوڑ کر پوچھا۔ اماں کہاں چلی گئی تھیں۔ بڑی دیر لگائی۔ میں ساری رات تمہارا انتظار کرتا رہا۔ دریا کے کنارے دوڑا گیا۔ اِدھر اُدھر چاروں طرف تلاش کیا۔ کہاں گئی تھیں تم ۔؟

کرونا نے جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا یونیورسٹی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ پرکاش نے تعجب سے اُسے کھول کر پڑھا۔ مسرت کی سُرخی چہرہ پر دوڑ گئی ۔

بولا۔ یہ تمہیں کہاں مل گیا اماں ۔؟

کرونا ۔ اسی کے لئے تو گئی تھی ۔

پرکاش ۔ تو کیا تم نے رجسٹرار سے ملاقات کی؟
گرونا ۔ اور کیا کرتی ۔
پرکاش گئیں کس ٹرین سے؟ اُس وقت گاڑی کہاں ملی ۔ ؟
گرونا ۔ موٹر پر گئی ۔
پرکاش ۔ پچاس میل کا سفر کر ڈالا ۔ رجسٹرار نے کیا کہا ۔ ؟
گرونا ۔ کچھ نہیں ۔ ابھی تک کسی دوسرے آدمی کا انتخاب نہیں ہوا تھا ۔ یہ خط لکھ دیا ۔

پرکاش نے افسردہ خاطر ہو کر کہا ۔ جب تم نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں تو پھر کیوں بھیج رہی ہو ۔ ؟

گرونا ۔ اس لئے کہ تم جانا چاہتے ہو ۔ میں تمہارا یہ رنجیدہ چہرہ نہیں دیکھ سکتی ۔ اپنی زندگی کے بیس سال تمہارے اُوپر نثار کر دیئے ۔ تمہارے لئے خوشیوں کے ہار گوندھتی تھی ۔ تمہارے لئے دعاؤں کے تھال سجاتی تھی ۔ اب ان آنکھوں سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی ۔ تمہارا سفر مبارک ہو ۔ جب تک زندہ رہوں گی تمہیں دعائیں دوں گی ۔ جب تم نہ تھے تب بھی روتی تھی ۔ تم ہوئے تب بھی روتی تھی ۔ تم نہ رہو گے تب بھی روؤں گی ۔ میرا تو جنم ہی رونے کے لئے ہوا ہے ۔ گرونا اور کچھ نہ کہہ سکی ۔ رقت نے اس کی زبان بند کر دی ۔

اسی دن سے پرکاش سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا ۔ نئے نئے سوٹ بنوائے ۔ ضروری اور غیر ضروری صد ہا چیزیں خریدیں ۔ گرونا کے پاس جو کچھ تھا ۔ وہ سب کا سب خرچ ہو گیا ۔ قرض کی نوبت آئی ۔ مگر پرکاش اپنی دُھن میں مست تھا ۔ گرونا کی سُرخ آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ اُسے نظر نہ آتا ۔ اس ایک ہفتہ میں وہ کتنی نحیف و ضعیف ہو گئی ہے ۔ اس کے بالوں پر کتنی

سفیدی آگئی ہے۔ اس کے چہرہ پر کتنی جھرّیاں پڑ گئی ہیں۔ یہ اُسے کچھ نظر نہ آتا۔

آخر روانگی کا دن آیا۔ پرکاش کو احباب نے رخصتی دعوت دی۔ وہ تو دعوتیں کھانے اور دوستوں سے ملنے ملانے میں منہمک تھا۔ اور کرونا اپنے شوہر کی یادگاروں پر اپنا غم و غصہ اتار رہی تھی۔ ان کی کھاڑھے کی چادریں۔ کھدّر کے کرتے اور پائجامہ اور لحاف ابھی تک صندوقوں میں حفاظت سے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہر سال دھوپ میں سکھائے جاتے۔ اور جھاڑ کر رکھ دیئے جاتے تھے۔ کرونا نے آج پھر اُن کپڑوں کو نکالا۔ مگر سکھا کر رکھنے کے لئے نہیں بلکہ غریبوں کو تقسیم کرنے کے لئے۔ وہ آج شوہر سے ناراض ہے۔ وہ لٹیا ڈور اور چھڑی جو پرتاب کی مونس اور تنہائی کی رفیق تھی۔ اور جن کی آج بیس سال سے کرونا پرستش کرتی چلی آتی تھی۔ بڑی بیدردی سے آنگن میں پھینک دی گئیں۔ وہ جھولی جو ہمیشہ پرتاب کے کندھوں پر رہتی تھی۔ آج کوڑے میں ڈال دی گئی۔ وہ تصویر جس کے سامنے کرونا بیس سال سے بلا ناغہ سر جھکاتی اور پھول چڑھاتی تھی۔ آج زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ شوہر کی کوئی یادگار اب وہ گھر میں رکھنا نہیں چاہتی۔ اس کا دل غم و غصہ سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اور شوہر کے سوا وہ کس پر اپنا غصہ اتارے۔؟ کون اس کا اپنا ہے؟ وہ کس سے اپنا درد کہے کیسے اپنی چھاتی چیر کر دکھائے وہ ہوتے تو کیا آج پرکاش غلامی کی زنجیر گلے میں ڈال کر یوں خوش ہوتا۔ وہ کیوں نہیں ہیں۔؟ کیوں اپنی روحانی اور جسمانی طاقت سے پرکاش کا دل نہیں پھیر دیتے؟ دکھیا کو کون سمجھائے۔؟

(۵)

کرونا زندہ تھی۔ مگر اسے ایسا کوئی علاقہ دنیا سے نہ تھا۔ اس کا چھوٹا سا سنسار خواب کی طرح پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سنہری تمنائیں اب حسرت کی تاریکی

میں فنا ہو چکی تھیں۔ جس روشنی کو وہ سامنے دیکھ کر زندگی کی اندھیری رات میں بھی دل میں اُمیدوں کا خزانہ لئے آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔ وہ بجھ گئی۔ اور وہ خزانہ لٹ گیا۔ اب نہ اس کی کوئی منزل تھی اور نہ منزل پر پہنچنے کی ضرورت۔ جن گایوں کو وہ دونوں وقت اپنے ہاتھوں سے روٹیاں کھلاتی اور سہلاتی تھی۔ وہ اب کھونٹوں پر کھڑی مشتاق نگاہوں سے دروازہ کی طرف تکتی رہتی تھیں۔ بچھڑوں کو گلے سے لگا کر چمکارنے والا اب کوئی نہ تھا۔ کس کے لئے مسکا نکالے۔ کس کے لئے مکھن بنائے؟ کھانے والا کون تھا۔؟ اپنے اس چھوٹے سے سنسار کو کرونا نے اپنے ہی اندر سمیٹ لیا تھا۔

مگر ایک ہفتہ میں کرونا کے مزاج نے پھر رنگ بدلا۔ اُس کا وہ چھوٹا۔ اُس کا وہ چھوٹا سا سنسار پھیلتے پھیلتے عالمگیر ہو گیا۔ جس لنگر نے کشتی کو ساحل سے ایک مرکز پر باندھ رکھا تھا وہ اُکھڑ گیا۔ اب کشتی سمندر کی وسیع فضا میں تیرے گی۔ چاہے وہ غضب ناک موجوں کا لقمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کرونا ایک دن دروازہ پر آ بیٹھی اور محلے بھر کے لڑکوں کو جمع کر کے انہیں دُودھ پلایا۔ دوپہر تک مکھن نکالنے میں لگی رہی۔ اور یہ مکھن محلے کے لڑکوں نے کھایا۔ پھر کا کھانا پکانے بیٹھی۔ اور کئی طرح کے کھلونے پکائے۔ یہ سب کا سب کتوں نے کھایا۔ اب یہ ہی اس کا روز کا وطیرہ ہو گیا۔

چڑیاں۔ اور کتے بلیاں اور چیونٹیاں اور محلّے کے لڑکے بالے سب اُس کے اپنے ہو گئے محبت کا وہ دروازہ اب کسی کے لئے بند نہ تھا۔

ایک دن پرکاش کا خط آیا۔ کرونا نے اُسے اُٹھا کر پھینکدیا۔ پھر چند منٹوں کے بعد اُسے اُٹھا کر پھاڑ ڈالا۔

مگر جب آسمان کا جوگی اپنی کُٹی میں دُھونی رما کر بیٹھا اور آسمانی ہستیاں

اپنا قصہ غم سنانے کے لئے جمع ہوئیں تو کردنا اس خط کو پڑھنے کے لئے بے قرار ہو اٹھی ۔

اس نے اپنے دل کو سمجھایا ۔ پرکاش تیرا کون ہے ؟ مجھے اس سے کیا سروکار ! وہ کہیں رہے اس سے کیا مطلب ؟ ہاں پرکاش میرا کون ہے ؟ دل نے جواب دیا پرکاش تیرا سب کچھ ہے ۔ وہ اس لافانی محبت کی یادگار ہے ۔ جس سے تو ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی ۔ وہ تیری جان کی جان ہے ۔ تیری روح کی روح ہے ! کردنا اس خط کے پرزوں کو جمع کرنے لگی ۔ گویا اس کی جان بکھر گئی ہو ۔ ایک ایک ٹکڑا اُسے اپنی کھوئی ہوئی اُلفت کا نقش قدم سا معلوم ہوتا تھا ۔ جب سارے منتشر پرزے جمع ہو گئے تو وہ چراغ کے سامنے بیٹھ کر انھیں جوڑنے لگی ۔ جیسے کوئی حسرت زدہ دل یاد ہائے شیریں کے شکستہ تاروں کو جوڑ رہا ہو ۔

ہائے ری ماتا ! وہ برہن ساری رات اس خط کو جوڑنے میں لگی رہی ۔ خط دونوں طرف سے لکھا ہوا تھا ۔ اس لئے عبارت کا مربوط ہونا اور بھی مشکل ! کوئی لفظ کوئی جملہ بیچ میں غائب ہو جاتا اور راستہ میں ایک خلیج سی حائل ہو جاتی اس ٹکڑے کو وہ پھر تلاش کرنے لگتی ۔ ساری رات گزر گئی ۔ مگر خط ناتمام تھا ۔ دن چڑھا محلے کے لڑکے مکھن دودھ کے اشتیاق میں آ کر جمع ہو گئے ۔ کتوں اور بلیوں نے آسن جمائے ۔ چڑیاں آنگن میں پھدکنے لگیں ۔ کوئی اولتی پر بیٹھی ۔ کوئی چبوترے پر ۔ مگر کردنا کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ۔ جیسے بچہ اپنی ماں کو پاکر ساری دنیا کے کھلونے اور مٹھائیاں اور میوے اس گود پر نثار کر دے ۔ دوپہر ہوا کردنا نے سر نہ اٹھایا ۔ نہ بھوک تھی ، نہ پیاس ۔ شام ہو گئی ۔ مگر وہ خط ابھی تک نامکمل تھا ۔ خط کا منشا ، کچھ کچھ

سمجھ میں آگیا تھا۔

پرکاش کا جہاز ۔۔۔۔۔۔۔۔ سے ۔۔۔۔۔۔۔ جا رہا ہے۔ اس کے دل میں ۔۔۔۔ اٹھا ہوا ہے لیکن پیاس سے تڑپتے ہوئے آدمی کی پیاس کیا اوس سے بجھ سکتی ہے ۔!

کرونا اپنے لخت جگر کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو پڑھنا اور اسے دل پر نقش کر لینا چاہتی تھی ۔ اس طرح تین دن گزر گئے ۔!

شام ہو گئی تھی۔ تین دن کی جاگی آنکھیں ذرا جھپک گئیں۔ کرونا نے دیکھا ایک وسیع کمرہ ہے ۔ اس میں کرسیاں اور میزیں لگی ہیں ۔ بیچ میں ایک اونچے چبوترہ پر کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے ۔ کرونا نے اُسے غور سے دیکھا ۔ وہ پرکاش تھا ۔ ایک لمحہ میں ایک دست و پا بہ زنجیر قیدی چبوترے کے سامنے لایا گیا ۔ بالکل خستہ حال ۔ جاں بہ لب ۔ یہ پرتاب تھا ۔ کرونا کی آنکھیں کھل گئیں ۔ آنسو جاری ہو گئے ۔ اس نے خط کے ٹکڑوں کو پھر سمیٹ دیا ۔ اور اس تودے کو چراغ کی نذر کر دیا ۔ ایک شعلہ اٹھا اور ایک لمحہ میں اس کی راکھ کی ایک چٹکی کے سوا کچھ نہ رہا ۔ یہ اُس ماں کی چتا تھی ۔ جو ایک اضطراب و انتشار بن کر اس کے دل میں ہیجان پیدا کر رہی تھی ۔ اُسی ایک چٹکی راکھ میں اس کا گڑیوں والا بچپن ۔ اس کی غم نصیب جوانی ۔ اُس کی پُر تمنا بیوگی ۔ !مدفون ہو گئی !!

صبح کو لوگوں نے دیکھا ۔ تو چڑیا پنجرے سے اُڑ چکی تھی ۔ پنجرا خالی پڑا ہوا تھا ۔ پرتاب کی تصویر ابھی تک اس سینہ سے چمٹی ہوئی تھی ۔ جس کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی ۔

اور پرکاش کا جہاز یورپ چلا جا رہا تھا ۔

مجبوری

(۱)

جب بابو ہردے ناتھ کی اکلوتی لڑکی کیلاش کماری تیرہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی۔ تو انھوں نے سوچا لڑکی کا دل بہلانے کی کوئی ترکیب کرنی چاہیئے۔ اکیلی رہے گی تو بیٹھی بسورا کرے گی۔ تنہائی رنج کو اور بھی جان گسل کردیتی ہے۔ اس لئے ایک گراموفون لائے۔ قصہ کہانی کی کتابیں جمع کیں۔ اور اپنی بیوی کو تاکید کردی کہ لڑکی کو سیر تماشے دکھلاتی رہے۔ نہیں تو ذرا سی بچی رو رو کر مرجائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیلاش کماری کو سیر و تفریح کا چسکا پڑ گیا۔ ایک دن بھی تھیئٹر یا لب دریا کی سیر کرنے نہ جاتی۔ تو اسے وقت کاٹنا عذاب ہوجاتا۔ تفریح جدت کی غلام ہے اور جدت کو تقویم پارینہ سے نفرت۔ کیلاش کماری نت نئے مشاغل تفریح کی تلاش میں منہمک رہتی۔

زبان خلق بھلا ایسے موقعوں پر کیوں کر خاموش رہتی۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتی۔ کسی نے ذرا ٹوپی ٹیڑھی رکھی۔ اور اس نے آوازے کسے۔ کوئی ذرا اکڑ کر چلا۔ اور پڑوسیوں کی نظروں میں کھبا۔ بیوہ کے لئے پوجا ہے۔ تیرتھ برت ہے۔ موٹا کھاتا ہے، موٹا پہنتا ہے۔ اسے تفریح اور سیر کی کیا ضرورت ہے!

لڑکی پیاری سہی لیکن شرم اور حیا بھی تو ہے کوئی چیز۔ کچھ دنوں تک تو آپس میں کھچڑی پکتی رہی۔

آخر ایک دن کئی مستورات نے جاگیشری کے گھر قدم رنجہ کیا۔ اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک صاحبہ بولیں۔

بہن تمہیں مزے میں ہو کہ ہنسی خوشی میں دن کاٹ دیتی ہو۔ ہمیں تو دن پہاڑ ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی کام نہ دھندھا۔ کوئی کہاں تک باتیں کرے!

دوسری خاتون نے فرمایا:۔ ارے تو یہ تو بڑے بڑے کی بات ہے۔ سبھی کے دن ہنسی خوشی میں کٹیں تو روئے کون! یہاں تو صبح سے شام تک چُولہے چکی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ کسی بچے کو دست آ رہے ہیں۔ تو کسی کو بخار چڑھا ہوا ہے۔ دن بھر ہائے ہائے کرتے بیت جاتی ہے۔ سارے دن کٹھ پتلی کی طرح ناچتی رہتی ہوں۔

تیسری صاحبہ بولیں:۔ بڑے کی بات نہیں ہے۔ ویسا دل چاہیئے۔ تمہیں تو کوئی راج سنگھاسن پر بٹھا دے تب بھی تسکین نہ ہوگی۔ تب اور ہائے ہائے کروگی۔

اس پر ایک ضعیفہ بولیں:۔ نوج ایسا دل! یہ بھی کوئی دل ہے۔ کہ گھر میں چاہے آگ لگ جائے۔ چاروں طرف کتنی ہی رُسوائی ہو رہی ہو۔ لیکن آدمی اپنے راگ رنگ میں مست رہے! وہ دل ہے کہ پتھر۔!؟

دوسری عورتوں نے ضعیفہ کی اس علانیہ چوٹ پر شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ وہ سب جاگیشوری کی چٹکیاں لینا چاہتی تھیں۔ زخمی کو تڑپانا ہی اُن کی غرض تھی۔ اِس کھُلی ہوئی چوٹ نے اُن کی دلآزاری کے لئے کوئی گنجائش نہ رکھی۔ بات پلٹ گئی۔ تعلیم نسواں پر بحث ہونے لگی۔ مگر جاگیشوری کو سزا مل گئی۔ جب

مستورات رخصت ہوگئیں۔ تو اُس نے جا کر شوہر سے یہ سارا قصہ سنایا۔ ہردے ناتھ اُن کھلے آدمیوں میں نہ تھے۔ جو ہر ایک موقع پر اپنی روحانی آزادی کا شور مچاتے ہیں۔ اور زبان خلق کی پروا نہیں کرتے۔ متفکر ہو کر بولے، تو اب ؟

"تمہیں کوئی تدبیر سوچو۔"

"اُن لوگوں کا کہنا بے جا نہیں۔ کیلاشی کے مزاج میں مجھے بھی ایک تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ مجھے خود تجربہ ہو رہا ہے۔ کہ اس کے من بہلاؤ کے لئے ہم نے جو تدبیر سوچی وہ مناسب نہیں ہے۔"

"کیلاشی تو شاید جان ہی دیدے۔"

"ہمیں اس کے مزاج کو تبدیل کرنا ہوگا۔"

"مشکل ہے۔"

(۲)

رفتہ رفتہ اصلاح ہونے لگی۔ بابو صاحب اب گراموفون بہت کم بجاتے۔ کوئی دھرم گرنتھ پڑھ کر سناتے۔ ماں بیٹی مذہبی اور روحانی معاملات میں محو رہنے لگیں۔ کیلاش کماری کو باقاعدہ دیکشا دے دی گئی۔

اب ماں بیٹی کشتی کی سیر کرنے کے لئے گنگا جی نہ جاتیں۔ بلکہ اشنان کرنے کے لئے دونوں روزانہ مندر میں درشن کرنے جاتیں۔ اور ایکادشی کا برت رکھتیں۔ کئی مہینہ تک تو کیلاشی کو یہ نئی دنیا نہایت تکلیف دہ اور خشک معلوم ہوئی۔ پر اعتقاد عودت کا وصف ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے ان معاملات سے دلچسپی ہوگئی۔

اب وہ سولھویں سال میں تھی۔ اپنی حالت سے بے خبر نہ تھی۔

تفریحات سے اُسے خود ہی نفرت ہونے لگی۔ بیوہ ہونا کسی بہت بڑے گناہ کی سزا ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں راسخ ہونے لگا۔ میں نے پہلے جنم میں کوئی بڑا گناہ کیا ہوگا۔ اگر میرے شوہر زندہ ہوتے تو میں پھر مایا موہ میں پھنس جاتی اصلاح کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ گروجی کا یہ کہنا سچ ہے۔ کہ پرماتما نے تمہیں اصلاح کا یہ موقعہ دیا ہے۔ بیوگی کوئی سزا نہیں ہے۔ بلکہ اصلاح کا ذریعہ ہے۔ میری نجات اب تیاگ، بھگتی اور اُپاسنا سے ہی ہوگی۔

کچھ دنوں کے بعد زہد و تقویٰ کا اثر اتنا زیادہ ہوگیا۔ کہ کیلاش کماری کو ہر ایک سے نفرت ہونے لگی۔ کسی کو نہ چھوتی۔ مہریوں سے دُور رہتی۔ سہیلیوں سے گلے تک نہ ملتی۔ نہ کسی کا بنایا ہوا یا چھُوا ہوا کھانا کھاتی۔ دن میں دو تین بار اشنان کرتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی دھرم گرنتھ پڑھا کرتی۔ سادھو مہاتماؤں کی صحبت میں اُسے روحانی سرور حاصل ہوتا۔ جہاں کسی مہاتما کے آنے کی خبر پاتی اُن کے درشنوں کے لئے بیتاب ہوجاتی۔ یہاں تک کہ دنیا سے اُس کی طبیعت بیزار ہوگئی۔ محویت کی حالت پیدا ہوئی گھنٹوں دھیان میں غرق رہتی۔ قیود تمدن سے نفرت ہونے لگی۔ تیسرا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا۔ کہ اُس نے سنیاسی بن جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ماں باپ نے سُنا تو ہوش اڑ گئے۔ جاگیشوری نے بیٹی کو سمجھایا۔ بیٹیا! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کہ تم ایسی باتیں سوچتی ہو۔

کیلاش کماری۔ مایا موہ سے جتنی جلدی نجات ہوجائے اتنا ہی اچھا۔

ہردے ناتھ۔ کیا اپنے گھر میں رہ کر مایا موہ سے نجات نہیں ہوسکتی؟ مایا موہ کی جگہ دل ہے! گھر نہیں!

جاگیشوری ۔ کتنی بدنامی ہوگی ۔!

کیلاش کماری ۔ اپنے کو بھگوان کے چرنوں پر قربان کرچکی تو مجھے بدنامی کی کیا پرواہ ۔؟

جاگیشوری ۔ نہیں نہ ہو ہمیں تو ہے ۔ ہمیں تو تمہارا ہی سہارا ہے ۔ تم نے سنیاس لے لیا تو ہم کس کے سہارے جئینگے ۔؟

کیلاش کماری ۔ پرماتما ہی سب کا سہارا ہے ۔ کسی دوسرے کا سہارا لینا بھول ہے ۔

دوسرے ہی دن یہ بات محلے والوں کے کانوں میں پہنچ گئی ۔ رائے زنی شروع ہوگئی ۔ یہ تو ہونا ہی تھا ۔ نئی بات کیا ہوئی ۔؟ لڑکیوں کو اس طرح آزاد نہیں کر دیا جاتا ۔ بھیجے نہ سامنے تھے کہ لڑکی نے خاندان کا نام روشن کر دیا ۔ اپنشد اور ویدانت پڑھتی ہے ۔ ایسی ایسی دلیلیں نکالتی ہے ۔ کہ بڑے بڑے علماء کی زبان بند ہو جاتی ہے ۔ تو اب روتے کیوں ہیں ۔؟

اپنے بچے کو دوڑتے دوڑتے دھم سے گر پڑتے دیکھ کر ہم پہلے اُس کو جھڑکتے ہیں ۔ پھر گود میں اُٹھا لیتے ہیں ۔ ان حرف گیریوں کے بعد ہمدردیوں کا دور آیا ۔ کئی اصحاب ہردے ناتھ سے اس معاملہ میں مشورہ کرنے آئے ۔ مسئلہ کا آغاز کیونکر ہو ۔!

کئی منٹ کے بعد ایک صاحب بولے ۔ سنا ہے ڈاکٹر گوڑ کی اصلاح آج کثرت رائے سے منظور ہوگئی ۔

دوسرے صاحب بولے :۔ یہ لوگ ہندو دھرم کو ملیامیٹ کرکے چھوڑیں گے ۔

تیسرے حضرت نے فرمایا :۔ ملیامیٹ تو ہو ہی رہا ہے ۔ اب اور کوئی

کیا کرے گا۔ جب ہمارے ساودھو مہاتما، جو ہندو دھرم کے ستون ہیں لتنے نفس پرست ہو گئے ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کو بہکانے جانے میں بھی تامل نہیں کرتے تو باقی ہی کیا رہ گیا۔

ہردے ناتھ۔ یہ مصیبت تو میرے سر بھی پڑا چاہتی ہے۔ آپ لوگوں کو تو معلوم ہو گا۔

پہلے۔ آپ ہی کے سر کیوں، ہم سبھی کے سر پڑی ہوئی ہے۔

دوسرے۔ ساری قوم کے سر کہیئے صاحب!

ہردے ناتھ۔ نجات کی کوئی تدبیر سوچیئے۔

پہلے۔ آپ نے سمجھایا نہیں۔؟

ہردے ناتھ۔ سمجھا کے ہار گیا۔ کچھ سُنتی ہی نہیں۔

تیسرے۔ پہلے ہی غلطی ہوئی۔ اُسے اس راستہ پر ڈالنا ہی نہ چاہیئے تھا۔

پہلے۔ اب پچھتانا بے سود ہے۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے۔ کہ بیواؤں سے اُستانیوں کا کام لینا چاہیئے۔ اگرچہ میں اس مسئلہ سے بھی متفق نہیں ہوں۔ پر سنیاسنی ہونے سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔ منشا تو صرف یہی ہے کہ لڑکی کا دل کسی کام میں لگا رہے۔ کسی سہارے کے بغیر آدمی کے بھٹک جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگادڑ بسیرا لیتے ہیں۔

دوسرے۔ تجویز تو معقول ہے۔ محلہ کی دس پانچ لڑکیاں جمع کر لی جائیں۔ اور کام شروع کر دیا جائے۔ لڑکیوں کو اگر کتابیں، کاغذ، گڑیاں وغیرہ ملتی رہیں تو شوق سے آئیں گی۔

ہردے ناتھ نے کیلاش کماری کے سامنے یہ تجویز پیش کی تو اسے بےحد صدمہ ہوا۔ سنیاس کے اونچے رتبہ سے اُستانی کا درجہ بدرجہا پست تھا۔ کہاں وہ مہاتماؤں کی صحبت، وہ کوہستانی مقامات کا عارفانہ شکوہ، قدرتی دلچسپیوں کی وہ روحانی کشش، برف بستہ چوٹیوں کی وہ نورانی پاکیزگی۔ مان سروور اور کیلاش کے وہ وجدانی مناظر، اور کہاں لڑکیوں کو پڑھانا اور سکھانا۔ جو کام دس دس روپے کے مدرس کرتے ہیں۔ مگر ہردے ناتھ مایوس نہ ہوئے۔ برابر خدمت خلق کی عظمت اُس کے دل نشین کرتے رہے۔ اصلی سنیاس خدمت ہی ہے۔ سنیاسی محض اپنی نجات کا طالب ہوتا ہے۔ رفاہ عام میں خودغرضی کا شائبہ بھی نہیں۔ خودغرضی چاہے روحانی ہو یا جسمانی سب ایک محدود شے۔ رفاہ عام غیر محدود ہے۔ دیکھو رشیوں میں دوھیچ کا جو رتبہ ہے۔ ہرلیش چندر کی جو عظمت ہے ہے۔ وہ اور کسے حاصل ہے؟ اس دعویٰ کی تائید میں وہ اُپنشدوں اور ویدوں کی نظیریں پیش کرتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کیلاش کماری کے خیالات میں تغیر ہونے لگا۔

(۳)

کیلاش کماری کے جوشِ خدمت نے سیلابی صورت اختیار کی۔ سارے دن لڑکیوں کو لئے بیٹھی رہتی۔ کبھی پڑھاتی۔ کبھی ان کے ساتھ کھیلتی۔ کبھی سینا پرونا سکھاتی۔ پاٹ شالہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن گیا۔ کوئی لڑکی بیمار ہوجاتی۔ تو فوراً اُس کے گھر جاتی۔ اس کی تیمارداری کرتی۔ غریب لڑکیوں کے لئے خود کھانے کپڑے کا انتظام کرتی۔ اُن میں کسی کی شادی درپیش ہوتی تو چندہ کرکے روپیہ جمع کرتی۔

پاٹ شالا کو کھلے ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ ایک لڑکی کو جسے وہ

بہت پیار کرتی تھی چیچک نکل آئی۔ کیلاشی اُسے دیکھنے گئی۔ ماں باپ نے بہت روکا۔ پروہ نہ مانی۔ کہا فوراً لوٹ آؤں گی۔ لڑکی کی حالت خراب تھی۔ مگر کہاں تو روتے روتے تالو سوکھتا تھا۔ کہاں کیلاشی کو دیکھتے ہی ہنسنے لگی۔ کیلاشی وہاں ایک گھنٹہ رہی۔ لڑکی برابر اُس سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن جب وہ چلنے کو اٹھی تو لڑکی پھر رونے لگی۔ کیلاشی مجبور ہوکر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ پھر اُٹھی تو پھر لڑکی کی وہی حالت ہوئی۔ وہ اُسے کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔ سارا دن وہیں گزر گیا۔ رات کو بھی لڑکی نے نہ آنے دیا۔ ہردے ناتھ اُسے بلانے کو بار بار آدمی بھیجتے پر وہ لڑکی کو چھوڑ کر نہ جا سکتی۔ اُسے خوف ہو رہا تھا۔ کہیں یہاں سے چلی اور لڑکی ہاتھ سے گئی۔ اُس کی ماں سوتیلی تھی۔ اس لئے کیلاشی کو اُس کی جانب سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ اس طرح وہ متواتر تین دن تک وہاں رہی۔ جب چوتھے دن لڑکی کی حالت سنبھل گئی۔ تو گھر آئی۔ مگر ابھی کپڑے اتار ہی رہی تھی کہ لڑکی کے گھر سے آدمی پہنچا۔ جلدی چلئے۔ لڑکی رو رو کر جان دے رہی ہے۔

ہردے ناتھ نے کہا۔ کہہ دو شفاخانے سے کوئی نرس بلوا لیں۔

کیلاشی۔ واہ آپ فضول بگڑ رہے ہیں۔ اُس غریب کی جان بچ جائے۔ میں تین دن نہیں۔ تین مہینے اُس کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ آخر یہ جسم کس کام آئے گا۔

ہردے ناتھ۔ تو یہ لڑکیاں کیسے پڑھیں گی۔؟

کیلاشی۔ دو چار دن میں وہ اچھی ہو جائے گی۔ دانے مرجھا چلے ہیں۔ تب تک آپ ان لڑکیوں کی دیکھ بھال کرتے رہئے گا۔

ہردے ناتھ۔ چھوت کا بھی تو خوف ہے۔ یہ بیماری چھوت سے پھیلتی ہے

گیلاشی ۔ ہنس کر، میں مر جاؤں گی تو آپ کے سر سے ایک بلا ٹل جائے گی۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے اُدھر کی راہ لی۔ ماں۔ ہاں! ہاں!..... کرتی رہ گئی۔

ہردے ناتھ نے جاگیشوری سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے بہت جلد یہ پاٹ شالا بھی بند کرنی پڑے گی۔ جس راستے پر چلتا ہوں وہی کچھ دنوں کے بعد دلدل بن جاتا ہے۔ اب پھر بدنامی کے سامان ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لوگ کہیں گے لڑکی دوسروں کے گھر کئی کئی دن پڑی رہتی ہے۔ پاٹ شالا بند ہی کرنی پڑے گی۔

جاگیشوری ۔ اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔!

کیلاش کماری دو دن کے بعد لوٹی تو ہردے ناتھ نے پاٹ شالا بند کر دینے کی تجویز پیش کی۔ کیلاشی نے گرم ہو کر کہا۔ اگر آپ کو بدنامی کا اتنا خوف ہے تو مجھے زہر دیدیجئے۔ اس کے سوا بدنامی سے بچنے کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

ہردے ناتھ ۔ بیٹی دنیا میں رہ کر دنیا ہی کا طرز زندگی اختیار کرنا پڑتا ہے۔

کیلاشی ۔ تو کچھ معلوم بھی تو ہو کہ دنیا مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ مجھ میں عقل ہے۔ جان ہے۔ ہوش ہے۔ جانور کیسے بن جاؤں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اپنے کو ابھاگنی سمجھوں۔ اور ایک ٹکڑا روٹی کھا کر پڑی رہوں۔ ایسا کیوں کروں؟ سنسار مجھے جو چاہے سمجھے۔ میں اپنے کو ابھاگنی نہیں سمجھتی۔ میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔ میں اسے اپنی ذلت سمجھتی ہوں کہ قدم قدم پر مجھ پر شک کیا جائے۔ ہمیشہ چرواہوں کی طرح کوئی لاٹھی لئے میرے پیچھے گھومتا رہے۔ کہ کسی کے

کھیت میں نہ جاپڑوں۔ یہ حالت میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔
پاٹ شالا دوسرے دن بند ہوگئی۔

(۴)

تیجے کا دن آیا۔ گھروں میں صفائی ہونے لگی۔ عورتیں اس تقریب کی تیاریاں کرنے لگیں۔ جاگیشوری نے بھی برت کا سامان کیا۔ نئی نئی ساڑیاں منگوائیں۔ کیلاشی کے سسرال سے اس موقعہ پر کپڑے، مٹھائیاں اور کھلونے آیا کرتے تھے سو اب کے بھی آئے۔ یہ سہاگن عورتوں کا برت ہے لیکن بیوائیں بھی رکھتی ہیں۔ کیونکہ شوہر سے اُن کا محض جسمانی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ دائمی اور روحانی تعلق ہے۔ کیلاش کماری اب تک یہ برت رکھتی آئی تھی۔ اب کی اُس کی اُس نے فیصلہ کیا یہ برت نہ رکھوں گی۔ ماں نے سُنا تو ماتھا ٹھونک لیا۔ بولی۔ یہ برت رکھنا تمہارا دھرم ہے۔

کیلاشی۔ مرد بھی عورت کے نام پر کوئی برت رکھتے ہیں۔؟

جاگیشوری۔ مردوں میں یہ رسم نہیں ہے۔

کیلاشی۔ اسی لئے نہ کہ مردوں کو عورتوں کی جان اتنی پیاری نہیں ہوتی جتنی عورتوں کو مردوں کی۔؟

جاگیشوری۔ عورت مرد کی برابری کیسے کرسکتی ہے۔ اُس کا تو دھرم ہی ہے مرد کی خدمت کرنا۔

کیلاشی۔ میں اسے اپنا دھرم نہیں سمجھتی۔ میرے لئے اپنی اصلاح نفس کے سوا کوئی دوسرا دھرم نہیں ہے۔

جاگیشوری۔ بیٹی، غضب ہو جائے گا۔ دُنیا کیا کہے گی۔!

کیلاشی۔ پھر وہی دنیا۔ مجھے دُنیا سے کوئی مطلب نہیں۔ جس

دُنیا میں میرے لئے اینٹ اور پتھر کے سوا اور کچھ نہیں ۔ اُس دنیا سے میں نہیں ڈرتی۔

ہردے ناتھ نے جاگیشوری سے یہ باتیں سُنیں تو سناٹے میں آ گئے۔ ان باتوں کا مطلب کیا ہے ؟ یہ اصلاح نفس کا جذبہ ہے یا ٹوٹے ہوئے مجروح دل کی صدا ؟ بینوائی شرم کا احترام نہیں کرتی۔ یہ حرماں نصیب کا نالۂ درد ہے ! عام حالتوں میں حزن ویاس بیکسی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ خوددار آدمیوں میں وہ ہردماغ ہوجاتا ہے۔ دل کے نازک جذبات کو فنا کردیتا ہے۔ یہ مایوسی کا آخری درجہ ہے۔

جاگیشوری سے پوچھا۔ اب کیا کرنا ہوگا۔ ؟

"کیا بتاؤں ؟"

"کوئی تدبیر ہے ؟"

"بس ایک ہی تدبیر ہے۔ پر اُسے زبان پر نہیں لا سکتا۔"

لیلیٰ

(۱)

یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ لیلےٰ کون ہے ۔ کہاں سے آئی ہے ۔؟ اور کیا کرتی ہے ؟
ایک دن لوگوں نے ایک بے مثال حسینہ کو طہران کے ایک گوشہ میں اپنے دف پر حافظؔ کی یہ غزل جھوم جھوم کر گاتے سُنا ۔ ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند
چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

اور سارا طہران اُس پر فدا ہوگیا ۔ یہی لیلیٰ تھی ۔
لیلیٰ کے حُسن دل کش کا تصور کرنا ہو تو اُفق کی شگفتہ سُرخی کو خیال میں لائیے جب نیلگوں آسمان زرّیں شعاعوں سے منور ہوتا ہے ۔ موسمِ بہار کو خیال میں لائیے جب باغ میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں ۔ اور اُن پر بُلبلیں چہچہاتی ہیں ۔
لیلیٰ کی دلکش آواز کا تصور کرنا ہو تو اس گھنٹی کی آواز پیہم کو خیال میں لائیے ۔ جو رات کی سحر کار خموشی میں اُونٹوں کی گردنوں میں بجتی ہوئی سنائی دیتی ہے یا اُس بانسری کی آواز کو جو دوپہر کی تکان افزا سکوت میں کسی درخت کے سایہ سے مچلتی ہوئی نکلتی ہے ۔

جس وقت لیلیٰ مست ہو کر گاتی تھی تو اس کے چہرہ پر ایک غیر معمولی رونق آجاتی تھی۔ وہ اُس آنے والے دن کا پیغام سُناتی تھی۔ جب مُلک میں امن کی سلطنت ہوگی۔ جب خونریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ بادشاہوں کو بیدار کرتی یہ عیش و تنعم کب تک ؟ یہ ثروت اور اقتدار کب تک۔ ؟ وہ رعایا کی خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کرتی۔ ان کی رگہائے جاں کو اپنے نغموں سے مترنم کردیتی۔

سارا طہران لیلیٰ پر فدا تھا۔ مایوسوں کے لئے وہ اُمید کا چراغ تھی۔ رنگین مزاجوں کے لئے جنت کی حُور، دولت مندوں کے لئے ضمیر بیدار۔ اور ذی اقتداروں کے لئے رحم و انصاف کا پیغام۔ جیسے روح مادہ کو کھینچ لیتی ہے اُسی طرح لیلیٰ نے انسانوں کو اپنی طرف مائل کرلیا تھا۔ اور یہ حُسن بے مثال امرت کی طرح پاک۔ برف کی طرح سفید اور گلِ نورس کی طرح تازہ تھا۔ اُس کی ایک پُرمہر نگاہ۔ ایک شگفتہ تبسم، ایک رسیلی ادا پر سونے کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے۔ اقتدار اس کی پرستش کرتا۔ ثروت اِس کے پیروں کی خاک چُومتی۔ لیکن لیلیٰ میں فقر کی استغنا تھی اور صبر کی بے نیازی۔ وہ شاعر کے تخیل کی طرح صرف مسرت اور آرزو کی چیز تھی۔

(۲)

ایک دن شام کو طہران کا شاہزادہ گھوڑے پر سوار اُدھر سے نکلا۔ لیلیٰ گا رہی تھی۔ نادر نے گھوڑے کو روک لیا۔ اور معلوم نہیں کتنی دیر تک ایک عالم بےخودی میں کھڑا سنتا رہا۔

مرادر دلیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ؏ مرادر دلیست..................

لمحہ بہ لمحہ شائقین کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ سارا طہران چلا آرہا ہے۔ دفعتًا نادر گھوڑے سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر لیکایک

لیلیٰ کے پاس جاکر اُس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ لوگ ادب سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔

لیلےٰ نے اُس کی طرف غلط انداز نگاہ سے دیکھا۔ پر کچھ پوچھا نہیں، کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ بدستور گانے میں محو رہی۔ لیکن اُس کا گلا تھرانے لگا۔ جیسے باجے کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔

ایک شریف آدمی نے کہا:۔ لیلےٰ۔! یہ ہمارے حضور شاہزادہ نادر ہیں۔

لیلیٰ بے پروائی سے بولی:۔ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن یہاں شاہزادوں کا کیا کام۔ اُن کے لئے محلات ہیں، محفلیں ہیں، شراب کا دور ہے۔ میں اُن کے لئے گاتی ہوں۔ جن کے دل میں درد ہے۔ اُن کے لئے نہیں جن کے دل میں شوق ہے۔

شاہزادہ نے مجنونانہ لہجہ میں کہا:۔ لیلیٰ۔! بیشک میں شوق کا غلام تھا مگر تم نے درد کا مزہ چکھا دیا۔

لیلیٰ پھر گانے لگی۔ لیکن آواز قابو میں نہ تھی۔ گویا یہ اس کا گلا ہی نہ تھا۔ لیلیٰ نے مجبور ہو کر دف بغل میں دبا لیا۔ اور اپنے مسکن کی طرف چلی۔ سامعین اس کے پیچھے پیچھے اس مقام تک آئے جہاں اُس کا جھونپڑا تھا۔ جب وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچی تو سبھی رخصت ہو چکے تھے۔ صرف ایک شخص جھونپڑے کے سامنے خاموش مؤدب کھڑا تھا۔

لیلیٰ نے پوچھا۔ تم کون ہو۔؟

نادر نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا:۔ تمہارا غلام نادر؛

لیلےٰ۔ میرے جھونپڑے میں تمہارے لئے بھی جگہ نکل آئے گی۔

نادر ۔ نہیں لیلےٰ ۔ میرے لئے یہ درخت کا سایہ کافی ہے۔

آج نادر کو باجرے کی خشک روٹیوں میں وہ لذت ملی جو نعمتوں کے خوان میں بھی کبھی نہ ملی تھی ۔ کھا کر اُس نے گھاس کا بستر بنایا ۔ اور اُسی درخت کے سایہ میں پڑ رہا ۔

نادر سارے دن لیلےٰ کے نغمے سُنتا ۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، جہاں وہ جاتی اس کے پیچھے پیچھے گھومتا اور رات کو خشک روٹیاں کھا کر اسی درخت کے نیچے سو رہتا ۔ بادشاہ نے سمجھایا ۔ ملکہ نے سمجھایا ۔ اُمرا نے منتیں کیں ۔ لیکن نادر کے سر سے لیلےٰ کا سودا نہ گیا ۔ ملکہ اس کے لئے اچھے سے اچھے کھانے بنوا کر بھیجتی ۔ پر نادر اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا ۔

مگر لیلےٰ کے نغموں میں اب وہ شیرینی نہ تھی ۔ نہ وہ لوچ تھا ۔ نہ وہ اثر ۔ وہ اب بھی گاتی تھی ۔ سُننے والے اب بھی آتے تھے ۔ مگر اب وہ اپنا دل خوش کرنے کو نہیں ۔ اُن کا دل خوش کرنے کو گاتی تھی ۔ اور سننے والے بھی بے قرار ہو کر نہیں ۔ بلکہ اُس کو خوش کرنے کے لئے آتے تھے ۔

ایک روز لیلےٰ گانے نہ گئی ۔ تو نادر نے کہا ۔ کیوں لیلیٰ آج کیا ہے ؟

لیلےٰ نے کہا ۔ اب کبھی نہ جاؤں گی ۔ سچ کہنا تمہیں میرے گانے میں پہلے کا سا لُطف آتا ہے ۔ ؟

نادر بولا ۔ پہلے سے کہیں زیادہ ۔

لیلےٰ ۔ لیکن اور لوگ تو اب پسند نہیں کرتے ۔ ؟

نادر ۔ مجھے اس کا تعجب ہے ۔

لیلےٰ ۔ تعجب کی بات نہیں ۔ اس دل میں پہلے سب کے لئے جگہ تھی ۔ اُس کا دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ وہ سب کو خوش کر سکتا تھا ۔ اُس میں سے جو

آواز نکلتی تھی۔ وہ سب کے دلوں میں پہنچتی تھی۔ اب تم نے اُس کا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہاں صرف تم ہو۔ اُس کی آواز تمہیں کو پسند آتی ہے۔ یہ دل اب تمہارے سوا اور کسی کے کام کا نہیں رہا۔ چلو۔ آج تک تم میرے غلام تھے۔ آج سے میں تمہاری کنیز ہوں۔ تھوڑی سی آگ لے کر اس جھونپڑے میں لگا دو۔ اس وٹ کو اُسی میں جلا دوں گی۔

(۳)

کئی سال گزر گئے۔ نادر اب بادشاہ تھا اور لیلیٰ اُس کی ملکہ......
ایران کی حکومت ایسی خوش اسلوبی سے کبھی نہ ہوئی تھی۔ دونوں ہی رعایا کے خدمت گزار تھے۔ محبت نے وہ مشکلیں بھی رفع کر دیں۔ جو لیلیٰ کو پریشان کئے رہتی تھیں۔ نادر شاہانہ اقتدار کا ضامن تھا۔ لیلیٰ حقوقِ عامہ کی۔ لیکن عملاً اُن میں کوئی فرق نہ تھا۔ کبھی یہ دب جاتا۔ کبھی وہ دب جاتی۔ نادر لیلیٰ کا رُخ دیکھتا تھا۔ لیلیٰ نادر کا پاس کرتی تھی۔ کام سے فرصت ملتی۔ تو دونوں کبھی گاتے بجاتے، کبھی دریا کی سیر کرتے۔ کبھی کسی درخت کے سایہ میں بیٹھے ہوئے حافظ کی غزلیں پڑھتے اور جھومتے۔ نہ لیلیٰ میں اب وہ سادگی تھی۔ نہ نادر میں اب وہ تکلف تھا۔ نادر کا لیلیٰ پر قابو تھا۔ جو معمولی بات تھی۔ مگر لیلیٰ کا بھی نادر پر پورا قابو تھا۔ جو غیر معمولی بات تھی۔ جہاں بادشاہوں کی محلسرا میں بیگمات کے محلے بستے تھے۔ سو رحبنوں اور کوڑیوں سے ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہاں لیلیٰ اکیلی تھی۔ جہاں محلسرا کا سالانہ خرچ کروڑوں تک پہنچتا تھا۔ وہاں اب ہزاروں سے زائد نہ تھا۔ یہ ساری قطع و برید لیلیٰ نے کی تھی۔ بادشاہ نادر تھا۔ حکومت لیلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔

مگر سیاسیات کے رموز حالِ تنقید نہیں ہوتے۔ اقتدار پرستوں کے

دلوں میں اندیشے پیدا ہونے لگے۔ اگر ملک کا یہی حال رہا تو ملوکیت کے فنا ہو جانے میں شبہ نہیں جمشید کا لگایا ہوا تناور درخت جس نے صدیوں تک آندھی اور طوفان کا مقابلہ کیا۔ اب ایک حسینہ کے نازک مگر قاتل ہاتھوں سے اُکھڑا جا رہا تھا۔ اس تحریک نے احرار کو بھی مشتعل کیا۔ اگر ایران اس رفتار سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہوگا۔ تو وہ قیامت سے پہلے منزل مقصود پر پہنچے گا۔ دونوں جماعتوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ اور یہ کشمکش روز بروز زیادہ ہونے لگی۔

(۷)

رات کا وقت تھا لیلیٰ و نادر اپنی خواب گاہ میں بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ کمرہ میں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف ایک جاجم بچھا ہوا تھا۔

نادر نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ بس اب یہ زیادتی نہیں۔ تمہاری چال ہو چکی۔ تمہارا پیدل پٹ گیا۔

لیلیٰ۔ اچھا یہ شہ!

نادر۔ تمہارے ساتھ ہارنے میں جو مزہ ہے وہ جیتنے میں کہاں۔

لیلیٰ۔ اچھا! تو گویا آپ میرا دل خوش کر رہے ہیں۔ شہ بچایئے نہیں دوسری چال میں مات ہوتی ہے۔

نادر۔ (اروپ دے کر) اچھا اب سنبھل جانا۔ ایک بار میرا فرزین اٹھا تو تمہاری صفوں کا صفایا کر دے گا۔

لیلیٰ۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ یہ شہ! لایئے فرزین۔ یہ نہ ہوگا۔

نادر۔ جب تک میرا دل آرام موجود ہے بادشاہ کو کوئی غم نہیں۔

لیلیٰ۔ اچھا یہ شہ! لایئے دل آرام کو ادھر۔ کہئے اب تو مات ہوئی۔

نادر۔ ہاں جانِ من! اب تو مات ہوگئی۔ جب میں ہی نثار ہوگیا۔ تو میرا بادشاہ کب بچ سکتا تھا۔

لیلےٰ۔ تینوں باتیں ہوگئیں۔ اب چپکے سے اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ اور اس فرمان پر دستخط کر دیجئے۔

یہ کہہ کر لیلےٰ نے ایک فرمان نکالا جسے اُس نے خود اپنے موتی کے سے حروف میں لکھا تھا۔ اس میں غلہ کی درآمد کا محصول گھٹا کر نصف کر دیا گیا تھا۔ لیلیٰ رعایا کے فلاح کے لئے دل وجان سے کوشاں رہتی تھی۔ نادر نے اس شرط پر یہ رعایت منظور کی تھی کہ لیلےٰ اُسے تین باتیں دیدے۔ وہ مشاق کھلاڑی تھا۔ یہ لیلیٰ جانتی تھی۔ مگر یہ شطرنج کی بازی نہ تھی۔ صرف محبت کا کھیل تھا۔ نادر نے مسکرا کر فرمان پر دستخط کر دیئے۔

لیلیٰ کا چہرہ غرور سے سُرخ ہوگیا۔ جو کام برسوں کی تحریک سے نہ ہوسکتا تھا۔ وہ محبت کی ایک نگاہ نے پورا کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر پھولی نہ سماتی تھی۔ کہ جس وقت یہ فرمان سرکاری اخبار میں شائع ہوگا۔ اس وقت احرار کتنے خوش اور اہلِ استبداد کتنے غضبناک ہوں گے۔

محبت سے سرشار نادر اُس کے چاند سے مکھڑے کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اُس کا قابو ہوتا تو حُسن کی اس مُورت کو اپنے دل بٹھا لیتا۔

(۵)

دفعتہً صدر دروازہ پر ایک دل ہلا دینے والا شور سُنائی دیا۔ ایک لمحہ میں خلقت کا ایک سیلاب ہتھیاروں سے مسلح آپہنچا۔ اور اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ کہ محافظوں کی جماعت دیوار کی مانند حائل ہوگئی۔ وہ خشمگیں جماعت دیواروں پر چڑھنے لگی۔ باب عالی پر دست بدست

جنگ شروع ہو گئی۔

لیلیٰ رنج و ندامت سے سر جھکا کر کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ کیا یہی وہ مجمع ہے جس کی تکالیف کی داستان اُس کی زبان پر سحر بن جاتی تھی۔؟ یہی وہ کمزور، فاقہ کش، خستہ حال خلقت ہے۔ جو اُسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔؟

نادر بھی خاموش تھا لیکن شرم سے نہیں۔ اُس کا چہرہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ بار بار ہونٹ چباتا اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر رہ جاتا تھا۔ بار بار لیلیٰ کی طرف پرسش کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ تمہاری منشا ہو تو دم زدن میں باغیوں کے پرزے اُڑا دوں۔ مگر اُس سے آنکھیں چار نہ ہوتی تھیں۔

آخر وہ بے قرار ہو کر بولا: لیلیٰ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا کہتی ہو۔؟

لیلیٰ نے عاجزانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ذرا صبر کیجئے۔ پہلے ان لوگوں سے پوچھئے چاہتے کیا ہیں۔؟

نادر محل کی چھت پر چڑھ گیا۔ لیلیٰ بھی اُس کے پیچھے پیچھے اُوپر آ پہنچی۔ دونوں باغیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہزاروں گلوں سے آواز نکلی۔ وہ کھڑی ہے! وہ کھڑی ہے! لیلیٰ وہ کھڑی ہے۔! یہ وہ مجمع تھا۔ جو لیلیٰ کے نغموں پر مست ہو جایا کرتا تھا۔

نادر نے بلند آواز میں باغیوں سے خطاب کیا۔ اے ایران کی بدنصیب رعایا۔! تم نے بغاوت کا جھنڈا کیوں کھڑا کیا ہے۔؟ کیا تم کو میرا اور اپنے خدا کا بالکل خوف نہیں ہے۔؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اپنی آنکھوں کے ایک اشارے سے تمہاری ہستی خاک میں ملا سکتا ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔

کہ ایک لمحہ کے اندر یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ کلام پاک کی قسم، میں تمہارے خون کی ندی بہادوں گا۔

سرور نے کہا :- جو بندۂ عیش ہو اور آواز خلق کی طرف سے کان بند کرلے وہ ہمیں اپنے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور نہیں کرسکتا۔ ہم اس وقت تک نہ جائیں گے۔ جب تک شاہی محل لیلے سے خالی نہ ہوجائے گا۔

نادر نے طیش میں آکر کہا :- احسان فراموشو! تمہیں اپنی ملکہ کی شان میں ایسی بے ادبی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی! جب سے لیلے نے اس سلطنت کو زینت دی ہے۔ اُس نے تمہارے ساتھ کتنی رعائتیں کی ہیں۔ کیا تم بھول گئے۔ ظالمو! یہ ملکہ ہے! مگر وہی کھانا کھاتی ہے۔ جو تم کتوں کو کھلا دیتے ہو۔ وہی کپڑے پہنتی ہے۔ جو تم فقیروں کو دیدیتے ہو۔ آکر محلسرا کو دیکھو۔ تم اسے اپنی جھونپڑیوں ہی کی طرح آرائش و تکلف سے خالی پاؤگے۔ لیلےٰ تمہاری ملکہ ہو کر بھی فقیروں کی زندگی بسر کرتی ہے۔ تمہیں اس کے قدموں کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہیئے۔ اُس کی شان میں تم ایسی گستاخیاں کرتے ہو! افسوس! مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ تم جاہل ہو۔ انسانیت سے بے بہرہ۔ تم اسی قابل ہو کہ تمہاری گردنیں چھُری سے کاٹی جائیں۔ اور تمہیں پیروں تلے روندا جائے۔

ہزاروں گلوں سے گھنگھور گرج کی صدا نکلی:- لیلے ہماری دشمن ہے۔ وہ ہماری ملکہ نہیں ہے۔!

نادر نے غضبناک ہوکر کہا :- تمہارے اوپر خدا کا قہر نازل ہو! جس خاتون نے تمہارے لئے خواب و خور حرام کردیا ہے۔ اُسے تم اس طرح مطعون کرتے ہو۔

یہ دیکھیے وہ فرمان ہے جس پر ابھی ابھی لیلیٰ نے مجھ سے جبراً دستخط کرائے ہیں۔ غلہ کا محصول اور آمد نصف کر دیا گیا ہے۔ کیا اب بھی تمہیں اطمینان نہیں ہوتا۔ جیسے تم معتبر سمجھتے ہو اُسے یہ فرمان دیکھنے کے لیے بھیجدو۔

پھر وہی گرجتی ہوئی صدا نکلی۔ ہم اپنی تقدیر کو کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے۔ خواہ وہ لیلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔

نادر غصہ سے کانپنے لگا۔ لیلیٰ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ اگر رعایا کی یہی مرضی ہے۔ کہ میں پھر دف بجا کر گاتی پھروں۔ تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ میں اپنے نغموں سے ایک بار پھر اُن کے دلوں پر حکومت کر سکتی ہوں۔

نادر نے جوش میں آ کر کہا: لیلیٰ! میں رعایا کی تنگ مزاجیوں کا غلام نہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں تمہیں اپنے پہلو سے جدا کر دوں، طہران کی گلیاں شنگرف ہو جائیں گی۔

نادر نے مینار پر چڑھ کر خطرہ کا گھنٹہ بجایا۔ سارے طہران میں اُس کی آواز گونج اٹھی۔ محافظ فوج قلعہ میں موجود تھی۔ مگر ایک سپاہی بھی نہ نظر آیا۔

نادر نے دوبارہ گھنٹہ بجایا۔ اُس کی جھنکار سے آسمان تھرا اٹھا۔ ستارے کانپ اُٹھے۔ مگر ایک بھی سپاہی نہ نکلا۔

آخر نادر نے تیسری بار گھنٹہ بجایا۔ مگر اس کا جواب بھی صرف ایک کمزور صدائے واپسیں تھی۔

نادر نے سر پیٹ لیا۔ سمجھ گیا۔ کہ بُرے دن آ گئے۔ اب بھی لیلیٰ کو رعایا کی ضد پر قربان کر کے وہ اپنی سلطنت کی حفاظت کر سکتا تھا۔ مگر لیلیٰ اُسے سلطنت سے کہیں عزیز تھی۔ اُس نے جھپٹ پر آ کر لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُسے

لیے ہوئے صدر دروازہ سے نکلا۔ احرار نے نعرہ فتح کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا۔ مگر کسی نے مزاحمت نہ کی۔ راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

دونوں چپ چاپ طہران کی گلیوں میں چلے جاتے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ بازاروں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کتے مرعوب ہو گئے تھے۔ فقیروں نے بھی مسجدوں میں پناہ لی تھی۔ مگر یہ دونوں بے خوف چلے جارہے تھے۔ نادر کی کمر میں تلوار تھی۔ لیلیٰ کے ہاتھ میں دف تھا۔ یہ اُن کی شوکت کی مٹی ہوئی نشانی تھی۔

(۶)

پورا سال گزر گیا۔ لیلیٰ اور نادر دیس بدیس کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ سمرقند اور بخارا، بغداد اور حلب، قاہرہ اور عدن سارے ملک انھوں نے چھان ڈالے۔ لیلیٰ کا دف پھر جادو کرنے لگا۔ اُس کی آواز سنتے ہی شہروں میں ہلچل مچ جاتی۔ چاروں طرف سے تواضع و تکریم ہونے لگتی۔ لیکن یہ دونوں رہ نورد کہیں ایک دن سے زیادہ نہ ٹھہرتے۔ نہ کسی کے دروازے پر جاتے۔ رُوکھا کھاتے اور کبھی کسی درخت کے نیچے۔ کبھی کسی پہاڑ کے غار میں۔ اور کبھی سڑک کے کنارے رات بسر کرتے تھے۔ دنیا کے ظالمانہ برتاؤ نے انھیں دنیا سے بیزار کر دیا تھا۔ اُس کی ترغیبوں سے کوسوں بھاگتے تھے۔ اُنھیں تجربہ ہو گیا تھا۔ کہ یہاں جس کے لئے جان دو وہی اپنا دشمن ہو جاتا ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کرو وہی بدی پر کمر باندھتا ہے۔ بڑے بڑے رؤسا کے دعوتی پیغام آتے۔ مگر لیلیٰ کسی کی نہ سنتی تھی۔ نادر کو کبھی کبھی حکومت کا خبط سوار ہو جاتا۔ وہ چاہتا کہ پوشیدہ طور پر کافی فوج مہیا کر کے طہران پر حملہ کر دوں اور باغیوں کو مغلوب کر کے بلا خرخشہ حکومت کروں۔ مگر لیلیٰ کی بے دلی دیکھ کر اُسے کسی تحریک کی جُرأت نہ ہوتی تھی۔

اُدھر ایران میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ جمہوریت سے تنگ آ کر رؤسا نے بھی استبداد پر کمر باندھی تھی۔ اور فریقین میں متواتر معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ پورا سال گزر گیا۔ مگر کھیت جوتے بوئے نہ گئے۔ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ تجارت کی کساد بازاری تھی۔ خزانہ خالی۔ روز بروز جمہور کی طاقت رو بہ زوال تھی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ حریت کے رضا کاروں نے ہتھیار ڈال دیئے اور سلطنت کی عنان اُمرا کے ہاتھوں میں آ گئی۔ مخالفین کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ کچھ قید کئے گئے۔ کچھ جلاوطن ہوئے اور کتنوں ہی کو پھانسی دیدی گئی۔ جمہور کا خاتمہ ہو گیا۔ اب اقتدار پسندوں کو نادر کی یاد آئی۔ تجربہ نے ثابت کر دیا۔ کہ ملک میں جمہوریت کی صلاحیت نہیں ہے۔ ظاہر کے لئے دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ اس موقعہ پر ملوکیت ہی ملک کو بچا سکتی تھی۔ یہ بھی مسلم تھا۔ کہ نادر اور لیلےٰ کو اب جمہوریت سے کوئی خاص رغبت نہ ہو گی۔ وہ رؤسا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلے بنے رہیں گے۔ اور اس طرح اُن لوگوں کو رعایا پر من مانی سختیاں کرنے کا موقعہ ملے گا۔ آپس میں مشورے ہوئے اور نادر کو منا لانے کے لئے رؤسا کا ایک وفد روانہ ہوا۔

(۷)

شام کا وقت تھا۔ لیلےٰ اور نادر دمشق میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ لیلےٰ قدرت کی بہار دیکھنے میں محو تھی۔ اور نادر دورِ گذشتہ کی یاد میں۔ ایک کے لئے زندگی پُر بہار تھی۔ دوسرے کے لئے خارزار۔

دفعتہً بہت دُور گرد اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے تھے۔ نادر اُٹھ بیٹھا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کا چہرہ مسرت سے

جگمگا اُٹھا، جسم لاغر میں جان سی پڑ گئی۔ جوش سے بولا۔ لیلیٰ یہ ایران کے لوگ ہیں۔ کلام پاک کی قسم، یہ ایران کے لوگ ہیں۔

لیلیٰ نے آنے والوں کی طرف متفکر نظروں سے دیکھا اور بولی۔ اپنی تلوار سنبھال لو۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔!

نادر۔ نہیں لیلیٰ۔! ایران کے لوگ اتنے فرومایہ نہیں ہو سکتے۔ کہ ایک معذور آدمی پر تلوار اُٹھائیں۔

لیلیٰ۔ پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔

یہ رئوسا کا وفد تھا جو نادر کو تخت کی دعوت دینے آرہا تھا۔ نادر دوڑ کر اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔ وہ اب ایران کا بادشاہ نہ تھا۔ ایک ایرانی سیاح تھا۔ بادشاہت مٹ گئی تھی۔ مگر ایرانیت روئیں روئیں میں بھری ہوئی تھی۔

نادر نے ان کا پیغام سنکر بے نیازی کی شان سے کہا۔ میں اس غربت میں بہت آرام سے ہوں۔ آپ لوگ مجھے دق نہ کریں۔

وفد کے سردار نے کہا۔ ہم حضور کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ یہیں آپ کے قدموں پر نثار ہو جائیں گے۔

"اب مجھے اس کشمکش میں نہ ڈالیے۔ حکومت سے طبیعت سیر ہو گئی۔"

"حضور، شورش پسندوں کا اب نشان بھی نہیں باقی ہے۔ ہم لوگ انہیں پھر سر نہ اُٹھانے دیں گے۔ صرف حضور کا سہارا چاہیئے۔"

اگر آپ مجھے اس ارادہ سے لے جانا چاہتے ہیں تو معاف رکھیئے۔ میں نے اس سیر و سیاحت میں ہر ایک ملک کی رعایا کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُن کی حالت قابل رحم ہے۔ ایران میں مجھے کبھی ایسے موقعے نہ ملے تھے۔ میں رعایا کو اہلکاروں کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اب آپ لوگ

مجھ سے یہ اُمید نہ رکھیں کہ میں آبائی غارت گری شروع کروں گا۔ اور امرا کی آسائش اور وقار کے لئے رعایا کا خون کروں گا۔ یہ عذاب اپنی گردن پر نہیں لے سکتا میں میزانِ عدل برابر رکھوں گا۔ اور اسی شرط پر ایران جا سکتا ہوں۔

لیلےٰ نے مسکرا کر کہا۔ تم رعایا کا قصور معاف کر سکتے ہو کیونکہ اُسے تم سے کوئی عناد نہ تھا۔ اُس کے دانت تو مجھ پر سکتے ہیں اُسے کیوں کر معاف کر سکتی ہوں۔

نادر نے متانت سے کہا۔ تم اتنی کینہ پرور نہیں ہو لیلےٰ! مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہارے منہ سے یہ باتیں نکل رہی ہیں۔

اُسی روز سے جب احرار نے باب عالی پر ہنگامہ کیا تھا۔ اور لیلےٰ کی جلاوطنی پر مصر ہوئے تھے لیلےٰ کے خیالات میں انقلاب ہو گیا تھا۔ ابتدا ہی سے اُس نے عوام سے ہمدردی کرنا سیکھا تھا۔ فاقہ کشی اور برہنگی کی تکلیفیں جھیل چکی تھی۔ وہ شاہی عمال کو رعایا پر ظلم کرتے دیکھتی اور اس کا نازک دل تڑپ اُٹھتا۔ وہ اپنے میں کوئی ایسی طاقت پیدا کرنا چاہتی تھی۔ جو ظالموں کے دل میں رحم اور رعایا کے دل میں جُرأت پیدا کرے۔ اُس کا طفلانہ تصور اُسے تخت شاہی بٹھا دیتا۔ جہاں وہ اپنے عدل و انصاف سے دُنیا میں ایک نیا دور قائم کر دیتی۔ کتنی ہی راتیں اُس نے ایسے ہی خوابوں کے دیکھنے میں کاٹی تھیں۔ کتنی ہی بار وہ مظلوموں کے سرہانے بیٹھ کر روئی تھی۔ تب اُس میں نغمہ کا کمال رونما ہوا۔ اُسے اپنی قوت کا احساس ہونے لگا۔ وہ طفلانہ تصور زیادہ روشن، زیادہ متعین ہو گیا۔ وہ اب اتنا بعید از امکان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ دفعتہً نادر اس کے طفلانہ تصور کی بہار لئے ہوئے اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ خواب نے حقیقت کی شکل اختیار کی۔ لیکن حقیقت اتنی دلفریب، اتنی خوش آیند نہ تھی۔

جتنا وہ خواب، اُسے زندگی کا تیا اور تلخ تجربہ ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ رعایا اتنی متحمل، اتنی عاجز اور بے زبان نہیں ہے۔ وہ اچھے سلوک کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ مقدرت پا کر اس کا اچھا استعمال نہیں کر سکتی۔ اسی دن سے رعایا کی جانب سے اُس کا دل پھر گیا تھا۔ آج پھر اُنہیں مکروہات کے دائرہ میں قدم رکھتے ہوئے اندیشہ اور خوف سے اُس کا دل کانپ رہا تھا۔ پر نادر کی خاطر وہ کیا کچھ نہ کرتی۔

(۸)

جس روز نادر اور لیلیٰ نے پھر طہران میں قدم رکھا سارا شہر اُن کے خیر مقدم کے لئے اُمڈ پڑا۔ شہر پر ہیبت ایک اندھیرے بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ امرار کے محلے آباد اور گلزار تھے۔ غُربا کے محلے اُجڑے ہوئے۔ جنہیں دیکھ کر جگر پاش پاش ہو جاتا تھا۔ نادر رو پڑا۔ مگر لیلیٰ کے ہونٹوں پر بے رحمانہ تبسم تنا بیٹھا تھا۔

نادر نے باگ ڈور سنبھالی۔ مگر اب اور تب میں کتنا فرق تھا! تب کوئی طاقت اُس کے سُست قدموں کو آگے بڑھاتی رہتی تھی۔ اب وہی طاقت اس کے تیز قدموں کو روکتی تھی۔ وہ ہر روز دیکھتا کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔ اور جو نہیں کرنا چاہتا وہی ہوتا ہے۔ مگر اس کا علاج اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ لیلیٰ مشیت غیب کی طرح اس کے دل پر مسلط تھی۔ اس گردش کے ایام میں لیلیٰ کی زندگی کے چھپے ہوئے پہلو، جو پوشیدہ حقیقتیں آشکارا ہوئی تھیں وہ اتنی دلکش، اتنی لطف انگیز، اتنی ساحر تھیں کہ نادر اُس کی منشا کو نوشتہ تقدیر سمجھتا تھا۔ لیلیٰ کی صحبت میں اُس کی تمناؤں کا معراج تھا۔ اس کے لئے وہ کیا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ رعایا کی اور اس کی سلطنت کی اس کے سامنے کیا

ہستی تھی۔!

اس طرح تین سال گزر گئے۔ رعایا کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔

(۹)

ایک روز نادر شکار کھیلنے گیا اور ہمراہیوں سے الگ ہو کر جنگل میں بھٹکنے لگا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اور نہ رفیقوں کا کہیں پتہ نہیں۔ گھر لوٹنے کا راستہ بھی نہ معلوم تھا۔ آخر خدا کا نام لے کر وہ ایک طرف چل پڑا۔ کہ کسی گاؤں یا آبادی کا نشان تو ملے گا۔ وہیں رات بھر پڑا رہوں گا۔ چلتے چلتے جنگل کے دوسرے سرے پر اُس کو ایک گاؤں نظر آیا۔ جس میں مشکل سے تین چار مکانات ہوں گے۔ ہاں ایک مسجد البتہ تھی۔ مسجد میں ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مگر کسی آدمی کا نشان نہ تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس لئے کسی کو جگانا مناسب نہ تھا۔ نادر نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور اُسی مسجد میں رات بسر کرنے کی ٹھانی۔ وہاں ایک بوسیدہ چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اُس پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ یکایک کسی کی آہٹ پا کر چونکا تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا نماز پڑھ رہا ہے۔ نادر کو تعجب ہوا کہ اس وقت کون نماز پڑھتا ہے۔ اُسے خبر ہی نہ تھی۔ کہ رات ختم ہو چکی اور یہ فجر کی نماز ہے۔ وہ پڑا پڑا دیکھتا رہا۔ بوڑھے نے نماز ادا کی۔ پھر سینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دُعا مانگنے لگا۔

"اے خدائے پاک! تو ہی غریبوں کا مددگار اور بیکسوں کا سہارا ہے۔ تو اس ظالم بادشاہ کے مظالم دیکھتا ہے پھر بھی تیرا قہر اس پر نازل نہیں ہوتا۔ یہ کافر بے دین ایک حسینہ کے عشق میں اپنے کو اتنا بھول گیا ہے۔ کہ نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور نہ کانوں سے سنتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے تو اسی حسینہ

کی آنکھوں سے سنتا ہے تو اسی حسینہ کے کانوں سے۔ تیری مخلوق ان مظالم سے تنگ آگئی ہے۔ یا تو اس ظالم کو جہنم واصل کر دے۔ یا ہم بیکسوں کو دُنیا سے اٹھالے۔

نادر کا خون سرد ہو گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا۔ کہ رعایا اُس سے مطمئن نہیں ہے۔ مگر اُسے کبھی یہ خیال نہ ہوا تھا۔ کہ اس کی مصیبت اتنی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ بڈھا تو خدا کی درگاہ میں فریاد کر کے رخصت ہو گیا۔ پر نادر وہیں جیسے پتھرا گیا گویا اس پر بجلی گر پڑی ہو۔

ایک ہفتہ تک نادر دربار میں نہ آیا۔ اور نہ کسی مشیر کو ہی طلب کیا۔ سارے دن اندر پڑا سوچا کرتا۔ لیلیٰ اس کے پاس بار بار جاتی۔ کبھی اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کبھی اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر پوچھتی تم کیوں اتنے اداس ہو؟ نادر اُسے دیکھ کر رونے لگتا۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہتا۔ نیکنامی یا لیلیٰ؟ یہی اُس کے سامنے مشکل مسئلہ تھا۔ اُس کے دل میں برابر کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ پر وہ کچھ تصفیہ نہ کر سکتا تھا۔ نیکنامی عزیز تھی۔ وہ بدنام ہو کر زندہ رہ سکتا تھا۔ مگر لیلیٰ کے بغیر زندگی محال تھی۔

آٹھویں دن وہ مسکراتا ہوا اُٹھا۔ اُس نے تصفیہ کر لیا تھا۔ لیلیٰ میری ہے میں لیلیٰ کا ہوں! نہ میں اس سے الگ، نہ وہ مجھ سے جُدا۔ جو کچھ وہ کرتی ہے وہ میرا۔ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ اُس کا ہے۔ یہاں من وتو کا فرق ہی کہاں ہے۔ بادشاہت چند روزہ ہے۔ فانی ہے۔ محبت قائم ہے۔ لافانی۔ ہم روز ابد تک ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بہشت کا لطف اُٹھائیں گے۔ ہمارا عشق ابد تک ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔

نادر خوش ہو کر اُٹھا۔ اُس کا چہرہ فتح کی سُرخی سے لال ہو رہا تھا۔

آنکھوں سے شجاعت ٹپکی پڑتی تھی۔ وہ لیلیٰ کی محبت کا جام پینے جا رہا تھا۔ جسے ایک ہفتہ سے اُس نے منہ نہیں لگایا تھا۔ اُس کا دل اُسی اُمنگ سے اُچھلا پڑتا تھا۔ جو آج سے پانچ سال پہلے پیدا ہوا کرتی تھی محبت کا پھول کبھی نہیں مُرجھاتا۔ محبت کی ندی کبھی نہیں اُترتی۔

لیکن لیلیٰ کی آرامگاہ کا دروازہ بند تھا۔ اور اس کا دف جو روزانہ دروازہ پر ایک کھونٹی سے لٹکا رہتا تھا۔ غائب تھا۔ نادر کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے کا مطلب تو یہ ہو سکتا تھا۔ کہ لیلیٰ باغ میں ہوگی۔ مگر دف کہاں گیا۔ ممکن ہے کہ وہ دف لے کر باغ میں گئی ہو۔ لیکن یہ اُداسی کیوں چھائی ہے۔ یہ حسرت کیوں برس رہی ہے۔

نادر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولدیا۔ لیلیٰ اندر نہ تھی۔ پلنگ بچھا ہوا تھا۔ شمع جل رہی تھی۔ وضو کا پانی رکھا ہوا تھا۔ نادر کے پیر کانپنے لگے۔ کیا لیلیٰ رات کو بھی نہیں سوئی۔ کمرہ کی ایک ایک چیز میں لیلیٰ کی یاد تھی۔ اس کی تصویر تھی۔ اُس کی مہک تھی۔ مگر لیلیٰ نہ تھی۔ مکان سونا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بے نور آنکھ۔۔!

نادر کا دل بھر آیا اُس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی سے کچھ دریافت کرے۔ دل اتنا رنجیدہ ہو گیا کہ وہیں فرش پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ جب ذرا آنسو تھما تو آنسو پونچھنے لگا۔ اور بستر کو سونگھا کہ شاید لیلیٰ کی کچھ خوشبو ہی معلوم ہو۔ لیکن خس اور گلاب کی مہک کے سوا اور کوئی خوشبو نہ تھی۔

دفعتہً اُس کے تکیہ کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ایک کاغذ کا پُرزہ نظر آیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے کلیجہ کو سنبھال کر وہ پُرزہ نکال لیا۔ اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ ایک نظر میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ نادر کی قسمت کا آخری

فیصلہ تھا۔ نادر کے منہ سے نکلا۔ ہائے لیلےٰ......! اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ لیلےٰ نے اس پرزہ میں لکھا تھا:۔

"میرے پیارے نادر!.... تمہاری لیلیٰ تم سے جُدا ہوتی ہے ہمیشہ کے لئے۔ تلاش نہ کرنا۔ تم میرا سُراغ نہ پاؤ گے۔ میں تمہاری محبت کی کنیز تھی۔ تمہاری بادشاہت کی بھُوکی نہیں۔ آج ایک ہفتہ سے دیکھ رہی ہوں۔ کہ تمہاری نگاہ پھری ہوئی ہے۔ تم مجھ سے نہیں بولتے۔ میری طرف آنکھ اُٹھا کر کبھی نہیں دیکھتے۔ مجھ سے بیزار رہتے ہو۔ میں کن کن ارمانوں سے تمہارے پاس جاتی ہوں۔ اور کتنی مایوس ہو کر لوٹتی ہوں۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سزا کے لائق کوئی کام نہیں کیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تمہاری بھلائی ہی کی نیت سے۔ ایک ہفتہ مجھے روتے ہی گزر گیا۔ مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اب میں تمہاری نگاہوں سے گر گئی۔ تمہارے دل سے خارج ہو گئی۔...."!

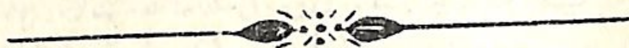
"آہ۔! یہ پانچ سال ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہی وفا لے کر آئی تھی۔ یہی وفا لے کر جاتی ہوں۔ پانچ سال تک محبت کے مزے اُٹھا کر عمر بھر کے لئے داغ حسرت لئے جاتی ہوں۔۔!"

لیلےٰ محبت کی لونڈی تھی۔ جب محبت نہ رہی۔ تو لیلیٰ کیوں کر رہتی...... رخصت!!"

نادر نے اس کاغذ کے پُرزے کو آنکھوں سے لگایا۔ اور وہیں

بیٹھ گیا۔ اس کا دل ایک ہولناک بیابان کی طرح کھڑا سسک رہا تھا۔

ایک لمحہ میں اسی ہولناک بیابان سے ایک صدائے درد اُٹھی۔ لیلیٰ ......! لیلیٰ ......! جس نے اُس بیابان کے ایک ایک ذرے کو اسی صدا سے مترنم کر دیا۔



مزارِ اُلفت

(۱)

اب نہ وہ جوانی ہے۔ نہ وہ نشہ ہے، نہ وہ جنون۔ وہ محفل برہم ہو گئی۔ وہ شمع بجھ گئی جس سے اس محفل کی رونق تھی۔ وہ نازنین کنجِ لحد میں سو رہی ہے۔ جس نے وفا پر اپنے تئیں قربان کیا۔ ہاں اُس کی محبت کا نقش اب بھی دل پر ہے۔ اور اُس کی دلفریب یادگار آنکھوں کے سامنے۔ اربابِ نشاط میں ایسی وفا، ایسا خلوص، ایسی عفت نایاب ہے۔ اور رؤسا میں ایسا نباہ، ایسی فدائیت، ایسی عقیدت نادر کنور رنبیر سنگھ روز بلا ناغہ شام کو زہرہ کے مزار کی زیارت کرنے جاتے۔ اُسے پھولوں سے سجاتے اور آنسوؤں سے سینچتے۔ پندرہ سال گزر گئے۔ ایک دن بھی ناغہ نہیں ہوا۔ پریم کی اُپاسنا ہی اُن کی زندگی کا مقصود تھا۔ اُس پریم کا جس میں انھوں نے وہ کچھ پایا۔ وہ کچھ دیکھا۔ وہ کچھ محسوس کیا جس کی یاد اب بھی مست کر دیتی ہے۔ اس زیارت میں سلوچنا بھی اُن کے ساتھ ہوتی جو زہرہ کی یادگار اور کنور صاحب کی ساری آرزوؤں کا مرکز تھی۔ کنور صاحب نے دو شادیاں کی تھیں مگر دونوں عورتوں بے اولاد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ پھر انھوں نے شادی نہ کی۔ ایک دن ایک محفل میں زہرہ کے درشن ہوئے۔ دونوں مائل ہو گئے۔

ایسا معلوم ہوا گویا ازل کے دو رفیق بچھڑ کر پھر مل گئے ہوں۔ زندگی کی بہار شروع ہوئی۔ کتنی فرحت سے بھری ہوئی، کتنی نغمہ ریز۔ مگر افسوس! وہ بہار پانچ مختصر سالوں میں ہی رخصت ہو گئی۔ وہ خوابِ شیریں پریشان ہو گیا۔ وہ صدق اور وفا کی دیوی تین سال کی سلوچنا کو اُن کی گود میں سونپ کر سدھار گئی۔ کنور صاحب نے اس پریم کی امانت کو حرزِ جاں بنا لیا۔ ان کی مادرانہ اُلفت دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ کتنے ہی تو انہیں مجنوں سمجھتے۔ سلوچنا ہی کی نیند سوتے۔ اُسی کی نیند جاگتے۔ ساتھ پڑھتے، ساتھ کھیلتے، ساتھ سیر کرتے۔ اتنی یکسوئی کے ساتھ جیسے کوئی بیوہ اپنے لڑکے کو پالے۔ جب سے سلوچنا یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔ خود اُسے موٹر پر پہنچا آتے اور شام کو خود جا کر لے آتے۔ اُن کی دلی آرزو تھی کہ اُس کی شادی کسی ممتاز اور شریف خاندان میں ہو۔ وہ اُس کی پیشانی سے وہ داغ دھو دینا چاہتے تھے۔ جو گویا تقدیر نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے لگا دیا تھا۔ دولت تو اُس داغ کو نہ دھو سکی۔ شاید تعلیم دھو ڈالے۔!

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کے مزار پر شفق کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ اور کنور صاحب زہرہ کے مزار کو پھولوں سے سجا رہے تھے۔ سلوچنا کچھ فاصلے پر کھڑی اپنے کتے سے گیند کھیل رہی تھی۔ کہ یکایک اُس نے اپنے پروفیسر ڈاکٹر "رامیندر" کو آتے دیکھا۔ شرما کر منہ پھیر لیا۔ گویا اُنہیں دیکھا ہی نہیں۔ خوف ہوا کہیں ڈاکٹر رامیندر اُس سے مزار کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔

یونیورسٹی میں داخل ہوئے اُسے ایک سال سے کچھ کم ہی ہوا تھا۔ مگر اتنے ہی دنوں میں اُس نے محبت کی مختلف صورتیں دیکھ لی تھیں۔ کہیں وہ سامانِ تفریح تھا۔ کہیں ذریعہ نشاط۔ کہیں مایۂ ہوس، کہیں تحریکِ نفس۔ کہیں وہ ذوقِ صالح نہ نظر آیا۔ جو محبت کی بنیاد ہے۔ صرف رامیندر ہی ایسے شخص تھے جنہیں اپنی طرف

تاکتے دیکھ کر اس کے دل کے تار گونجنے لگتے تھے۔ پر اُن آنکھوں میں کتنی بے بسی تھی۔ کتنی معذرت کتنی التجا۔!!

راجیندر نے کنور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا: تمہارے بابا اس قبر پر کیا کر رہے ہیں۔؟

سلوچنا کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ بولی "یہ اِن کی پرانی عادت ہے۔

راجیندر۔ کسی مہاتما کی سمادھی ہے۔؟

سلوچنا نے اس سوال کو اڑا دینا چاہا۔ راجیندر کو یہ تو معلوم ہی تھا۔ کہ سلوچنا کنور صاحب کی ایک داشتہ عورت کی لڑکی ہے۔ پر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اُسی عورت کی قبر ہے اور کنور صاحب اس یادگار محبت کے پجاری ہیں۔ یہ سوال انہوں نے ذرا بلند آواز میں کیا تھا۔ کنور صاحب اس وقت جوتے پہن رہے تھے آواز اُن کے کانوں میں پڑ گئی۔ جلدی سے جوتے پہن لئے اور قریب آ کر بولے۔ دنیا کی آنکھوں میں تو وہ مہاتما نہ تھیں۔ پر میری آنکھوں میں تھیں اور ہیں۔ یہ میری الفت کا مزار ہے

سلوچنا کا جی چاہتا تھا وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن کنور صاحب کو زہرہ کی نوحہ خوانی میں مزہ آتا تھا۔ راجیندر کا استعجاب دیکھ کر بولے۔ اس میں وہ دیوی سو رہی ہے۔ جس نے دنیا کو میرے لئے جنت بنا دیا تھا۔ سلوچنا اسی کی یادگار ہے۔

راجیندر نے مزار کی طرف دیکھ کر کہا: اچھا!!

کنور صاحب نے دل میں اُس یاد سے محظوظ ہو کر کہا۔ وہ زندگی ہی اور تھی پروفیسر صاحب۔ ایسی نفس کشی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ آپ کو فرصت ہو تو میرے ساتھ چلئے۔ آپ کو اپنی داستان محبت........!

سلوچنا نے قطع کلام کرکے کہا: وہ سُنانے کی چیز نہیں ہے۔ دادا جی۔!

کنور صاحب نے کہا: میں رامیندر بابو کو غیر نہیں سمجھتا۔

رامیندر کو اس داستان محبت میں نفسیات کا ایک عمیق مسئلہ چھپا ہوا نظر آیا۔ وہ کنور صاحب کے ساتھ اُن کے گھر تک اور بہت دیر تک ان کی باتیں سنتے رہے۔ آج انہیں اس خواہش کے اظہار کا موقعہ ملا۔ جو مہینوں سے الفاظ کی تلاش میں پریشان تھی۔ کنور صاحب نے انہیں گلے لگا کر اُن کی التجا قبول کی۔ رامیندر نے اپنے رفیق حیات کے لئے جو ذہنی معیار قائم کیا تھا۔ سلوچنا اس پر پوری اُتری تھی۔

کنور صاحب نے انہیں ٹٹولا۔ آپ نے اس معاملہ کے ہر ایک پہلو پر غور کرلیا ہے۔؟

رامیندر نے مضبوطی سے کہا۔ میں ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر سماج ہمیں اتنی آزادی بھی نہیں دے سکتا تو ہم ایسے سماج میں رہنا ہی اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔

کنور صاحب نے پھر کہا۔ لوگ خوب مضحکہ اُڑائیں گے۔!

رامیندر۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی ذی فہم انسان نہ ہنسے گا۔ اور بے اصول آدمیوں کے ہنسنے کی مجھے پرواہ نہیں۔!

کنور صاحب۔ تمہارے خاندان میں تو لوگ مخالفت نہ کریں گے۔؟

رامیندر۔ میں تو آپ سے عرض کرچکا کہ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر میں بُرائی کروں۔ یا کوئی ایسا کام کروں۔ جو اخلاقاً قابل مذمت ہو۔ تو میں سماج کے فتوے کے سامنے شوق سے سر جھکا دوں گا۔ لیکن سماج کے بیجا ظلم کو برداشت کرنا اخلاقی کمزوری ہے۔

رامیندر کی اس دلیرانہ اصول پسندی نے کنور صاحب کو

مطمئن کردیا۔

(۲)

لیکن ڈاکٹر رامیندر کو اس وقت تک سماج کے ظلم کا تجربہ نہ تھا۔ جہاں جاتے ان کی عزت ہوتی تھی۔ تقریبوں اور پارٹیوں میں ان کے نام دعوتی خطوط آتے تھے۔ اپنی شادی کی تقریب میں انھوں نے جو شاندار دعوت دی تھی اس میں وہ سبھی حضرات شریک ہوئے جن سے انہیں ہمدردی کی امید تھی۔ لیکن جب سے سلوچنا گھر میں آئی ان کے یہاں مستورات کا آنا جانا تقریباً بند ہوگیا۔ مرد دوست اب بھی آتے تھے۔ بلکہ پیشتر کے مقابلہ میں اُن کی آمد و رفت اور بڑھ گئی۔ صبح شام احباب کا تانتا لگا رہتا۔ سلوچنا اُن کی خاطر و تعظیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی لیکن ان احباب کے ساتھ اُن کی مستورات نہ آتیں۔ پہلے چند ماہ تو رامیندر نے اِدھر توجہ نہ کی لیکن جب کئی ماہ گزر گئے۔ اور مستورات کا احتراز بدستور قائم رہا تو انہوں نے ایک دن سلوچنا سے کہا۔ یہ لوگ اپنی گھر والیوں کو نہیں لاتے۔

سلوچنا نے آہستہ سے کہا "ہاں دیکھتی تو ہوں"

رامیندر۔ کیا عورتیں تم سے پرہیز تو نہیں کرتیں۔؟

سلوچنا۔ شاید کرتی ہوں۔

رامیندر۔ مگر یہ لوگ تو بڑے آزاد ہیں۔ ان کی عورتیں بھی کافی تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے۔؟

سلوچنا نے آہستہ سے کہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

رامیندر نے کچھ دیر تامل کرکے کہا "ہم لوگ کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ تو کیا ہرج ہو؟ وہاں تو کوئی ہمیں نہ جانتا ہوگا"

سلوچنا نے اب کی تیز لہجہ میں کہا۔ دوسری جگہ کیوں جائیں۔ ہم نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ہے۔ کسی سے کچھ مانگتے نہیں۔ جسے آنا ہو آوے نہ آنا ہو نہ آوے۔ کسی دوسرے مقام پر جا کر منہ چھپانا مجھے تو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

رفتہ رفتہ رامیندر پر اب ایک اور حقیقت کھلنے لگی۔ جو خواتین کے احتراز سے کہیں زیادہ دل شکن کہیں زیادہ مذمت آمیز اور نفرت انگیز تھی۔ رامیندر کو اب معلوم ہونے لگا۔ کہ یہ حضرات جو آتے ہیں۔ اور گھنٹوں بیٹھے قومی اور مجلسی امور پر مباحثے کیا کرتے ہیں۔ فی الواقع تبادلہ خیال کے لئے نہیں بلکہ نظارہ حسن کے لئے آتے ہیں۔ ان کی نگاہیں سلوچنا ہی کی متلاشی رہتی ہیں۔ ان کے کان اسی کی شکر ریزیوں کے مشتاق رہتے ہیں۔ اس کے حسن و انداز کا لطف اٹھانا ہی ان کا مقصود ہے۔ یہاں انھیں وہ شرافت اور لحاظ نہیں مانع ہوتی جو کسی معزز آدمی کی بیٹی بہو کی طرف آنکھیں نہیں اٹھنے دیتی۔ وہ سوچتے ہیں یہاں انھیں ہر قسم کی آزادی ہے۔ کبھی کبھی جب رامیندر کی عدم موجودگی میں کوئی حضرت آجاتے۔ اس وقت سلوچنا کے لئے سخت آزمائش کا سامنا ہوتا۔ وہ اپنی نگاہوں سے، اپنی ناز و ادا نہ باتوں سے۔ اپنی ٹھنڈی آہوں سے۔ اس پر ظاہر کر دینا چاہتے تھے۔ کہ ہم بھی تمہارے شیدائیوں میں ہیں۔ اگر رامیندر کا تم پر سولہوں آنہ حق ہے۔ تو زکوٰۃ کے طور پر ہم بھی ایک نگاہ، ایک تبسم کے مستحق ہیں۔ سلوچنا اس وقت زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

اب تک رامیندر اور سلوچنا دونوں کلب جایا کرتے تھے۔ وہاں آزاد خیالوں کا اچھا جمگھٹ رہتا تھا۔ جب تک رامیندر کو کسی کی جانب سے شبہ نہ تھا وہ اسے اصرار کے ساتھ لے جاتا۔ سلوچنا کے پہنچتے ہی وہاں ایک زندہ دلی سی پیدا ہو جاتی۔ مجلس میں جان سی پڑ جاتی۔ جس میز پر سلوچنا بیٹھتی اسی پر مجمع

ہو جاتا - کبھی کبھی سلوچنا گاتی بھی تھی - اس وقت تو سارے مجمع پر نشہ طاری ہو جاتا کلب میں مستورات کی تعداد زیادہ نہ تھی - مشکل سے پانچ چھ لیڈیاں آتی تھیں - مگر وہ سلوچنا سے زیادہ مخاطب نہ ہوتیں - نہیں بلکہ اپنے حرکات و کنایات سے اُسے جتا دینا چاہتی تھیں - کہ تم مردوں کا دل خوش کرنے کے لئے ہو - مردوں کا دل خوش کرو - ہم شریف زادیوں کے پاس تمہاری کوئی ضرورت نہیں - لیکن جب سے رامیندر پر یہ تلخ حقیقت روشن ہوئی اُنھوں نے کلب جانا چھوڑ دیا - دوستوں کے یہاں آمد و رفت بھی کم کر دی - اور اپنے یہاں آنے والوں سے بے اعتنائی کرنے لگے - وہ چاہتے تھے میرے گوشہ تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو - رفتہ رفتہ انہوں نے باہر آنا جانا چھوڑ دیا - گھر پر بیٹھے پڑھا لکھا کرتے - اپنے چاروں طرف انہیں احتراز اور دغا کی دیوار کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی - کسی پر اعتماد نہ کر سکتے تھے کہیں سے ہمدردی اور خلوص کی امید نہیں - دل سب سے بیزار تھا - بدطینت اور تنگ دل آدمیوں سے ملنے سے فائدہ ہی کیا - شروع سے محبت پسند آدمی تھے - اول درجہ کے بااخلاق - یہ گوشہ نشینی انہیں حد درجہ ناگوار معلوم ہوتی تھی - نہ کوئی سیر نہ تفریح - یہ تو قید تھی - جبری قید - اگرچہ وہ قول و فعل سے سلوچنا کی دلجوئی کرتے رہتے تھے - لیکن سلوچنا کی باریک نگاہوں سے اب یہ چھپا نہ تھا - کہ یہ حالت ان کے لئے روز بروز ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے - وہ دل میں سوچتی ان کی یہ حالت میرے ہی باعث تو ہے - میں ہی تو ان کی زندگی کا کانٹا ہو گئی - اگر میں نہ ہوتی تو کیوں انہیں ان دل آزاریوں کا سامنا کرنا پڑتا -

آخر ایک دن اُس نے رامیندر سے کہا - آج کل کلب کیوں نہیں چلتے ؟ کئی ہفتے ہوئے گھر سے نکلے تک نہیں - ؟

رامیندر نے بے دلی سے کہا - میرا تو جی نہیں چاہتا - اپنا گھر سب

سے اچھا ہے۔

طبیعت تو گھبراتی ہی ہوگی۔ تم تنہائی کے عادی کبھی نہیں رہے۔ یہ تپسیا کیوں کرتے ہو۔؟ میں تو نہ جاؤں گی۔ اُن عورتوں سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ اُن میں ایک بھی ایسی نہیں جس کے دامن پر سیاہ داغ نہ ہوں۔ لیکن سیتا بنی پھرتی ہیں۔ مجھے تو ان کی صورت سے چڑھ ہوگئی ہے۔ لیکن تم کیوں نہیں جاتے؟ کچھ تفریح ہی ہو جائے گی۔

رامیندر۔ تفریح کیا خاک ہوگی۔ جب دل ہی اندر سے جل رہا ہو تو تفریح کہاں۔؟

سلو چنا چونک پڑی۔ آج پہلی بار اُس نے رامیندر کے منہ سے ایسی بات سُنی۔ وہ اپنی نگاہ میں خود مظلوم تھی۔ ذلت یا تحقیر جو کچھ تھی اُس کی تھی۔ رامیندر کے لئے تو اب بھی سب دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ جن سے چاہیں مل سکتے ہیں۔ ان کے لئے کونسا امر مانع ہے۔ مشکل تو میری ہے۔! مرد شہدے، عورتیں مغرور اور کینہ پرور!!

لیکن نہیں۔! اگر انہوں نے کسی دوسری شریف زادی سے شادی کی ہوتی۔ تو ان کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ معزز گھرانوں کی عورتیں آتیں۔ آپس میں اتحاد اور خلوص پیدا ہوتا۔ ریشم میں ریشم کا پیوند لگ جاتا۔ مگر اب تو ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ یا ٹاٹ میں ریشم کا۔ بات ایک ہی ہے۔

رامیندر کو بھی فوراً معلوم ہو گیا کہ زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اُسی بات کو زیادہ واضح اور ملائم انداز سے کہا جا سکتا تھا۔ انھوں نے فوراً اس کی تادیل کی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم اور تم الگ الگ ہیں؟ ہماری اور تمہاری زندگی ایک ہے۔ جہاں تمہاری قدر نہیں وہاں میں کیسے

جا سکتا ہوں۔ مجھے بھی سماج کے ان رنگے سیاروں سے کراہیت ہو رہی ہے۔ میں قریب قریب ان سبھوں کے اندرونی حالات سے واقف ہوں۔ اونچے عہدے، یا بڑی بڑی ڈگریاں یا دولت سے کسی کی آتما نہیں پاک ہو جاتی۔ جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ وہ اگر کوئی کمتر درجہ کا آدمی کرتا تو اُسے کہیں منہ دکھانے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر یہ لوگ اپنی ساری بُرائیاں آزاد خیالی کے پردہ میں چھپاتے ہیں۔ ان لوگوں سے دور ہی رہنا اچھا۔!

سلوچنا کو تسکین ہو گئی۔

(۳)

دوسرے سال سلوچنا کی گود میں ایک چاند سی لڑکی کا ظہور ہوا۔ اس کا نام رکھا گیا شوبھا۔ کنور صاحب کی صحت کچھ خراب ہو رہی تھی۔ وہ ان دنوں منصوری میں تھے۔ یہ خبر پاتے ہی رامیندر کو تار دیا۔ کہ زچہ اور بچہ کو لے کر یہاں آ جاؤ۔ موسم اچھا ہے۔ لیکن رامیندر اس موقع پر نہ جانا چاہتے تھے۔ اپنے احباب کی شرافت اور آزاد خیالی کا ایک بار وہ آخری امتحان لینا چاہتے تھے۔ اس کے لئے اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ اس تقریب میں انہوں نے اعلیٰ پیمانہ پر ایک دعوت کرنے کا فیصلہ کیا۔ گانے بجانے کی بھی تجویز ہوئی۔ کئی باکمال گویئے بلائے گئے۔ احباب کے نام دعوتی کارڈ بھیجے گئے۔ مسلم دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ انگریزی۔ ہندوستانی اور مسلمانی، ہر ایک قسم کے کھانے کا انتظام تھا۔ پھلاہاری مٹھائیاں بھی منگوائی گئی تھیں۔ تاکہ راسخ الاعتقاد اصحاب کو شکایت کا موقع نہ ہو۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے کنور صاحب گرتے پڑتے منصوری سے آئے۔ برہی کے دن دعوت کی تاریخ تھی۔ دوپہر ہی سے نشستیں سجائی جانے لگیں۔ کوئی طشتریاں لگانے لگا۔ کوئی دونے سجانے لگا۔ شام

ہوتے ہوتے سارا انتظام مکمل ہو گیا۔ مدعو حضرات ایک ایک کر کے تشریف لانے لگے۔ کنور صاحب خود ان کا استقبال کر رہے تھے۔ نواب صاحب تشریف لائے۔ خانصاحب آئے۔ مرزا صاحب آئے۔ میر صاحب آئے۔ غرض شہر کے مسلم رئیسوں میں بہت کم ایسے ہوں گے۔ جو اس موقع پر جلوہ افروز نہ ہوئے ہوں۔ مگر پنڈت جی اور بابو جی اور لالہ صاحب اور چودھری صاحب اور ککڑ اور مہرا اور چوپڑہ اور کول اور بکو اور سری واستو یہ اور ماتھر اور دوبے اور چوبے سب غفلت تھے۔ گویا شہر میں ان کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ سبھی احباب ہوٹلوں میں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے تھے۔ شرابیں لنڈھاتے تھے۔ پھر آج کیوں تشریف نہیں لائے؟ اس لئے نہیں کہ چھوت کا خیال مانع تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی شرکت کو اس شادی کے جواز کی سند سمجھتے تھے۔ اور یہ سند وہ انہیں منظور نہ تھی۔ حیرت تو یہ تھی کہ انگریز احباب نے بھی قدر افزائی نہ کی۔ ہاں دو چار عیسائی جن کے حسب نسب کا کوئی پتہ نہ تھا آ گئے۔ دس بجے رات تک کنور صاحب پھاٹک پر کھڑے رہے۔ اسلامی دعوت ختم ہو گئی۔ گانا شروع ہوا۔ مگر ہندو حضرات ابھی تک لاپتہ تھے۔ ہندوؤں کے شامیانے میں ایک متنفس بھی نہ تھا۔ رامیندر پرشاد ایک کرسی پر مغموم اور دل شکستہ سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ کنور صاحب نے آ کر کہا۔ اب لوگوں کا انتظار فضول ہے۔ سب سامان غریبوں کو دیدو۔ رامیندر نے افسردہ خاطر ہو کر کہا۔ "جی ہاں! یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔

کنور۔ مجھے تو پہلے ہی اندیشہ تھا۔

رامیندر۔ مجھ سے حماقت ہوئی کہ یہ دعوت کی۔ یہ تو میری علانیہ توہین ہوئی۔

کنور۔ ہماری توہین نہیں ہوئی۔ خود ان لوگوں کی تنگ دلی کا پردہ فاش ہوگیا۔

رامیندر۔ خیر امتحان ہوگیا۔ کہئے تو ابھی جاکر ان لوگوں کی خبر لوں۔؟

کنور صاحب نے حیرت سے کہا: کیا اُن کے گھر جاکر۔؟

رامیندر۔ جی ہاں! پوچھوں کہ آپ لوگ جو قومی اصلاح کے راگ الاپتے پھرتے ہیں وہ کس بل پر؟ یہی آپ کی اخلاقی ہمت ہے۔!

کنور۔ فضول ہے۔ جاکر آرام سے لیٹو۔ نیک و بد کی سب سے بڑی پہچان اپنا ضمیر ہے۔ اگر ہمارا دل گواہی دے کہ یہ کام بُرا نہیں تو پھر ساری دنیا منہ پھیرلے۔ ہمیں کسی کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ میرے بھائی بند، عزیز رشتہ دار سب نے مجھے ترک کر دیا۔ مگر میں نے کسی کی تنکے برابر بھی پرواہ نہ کی۔ اور میرا خیال ہے کہ مجھے زندگی میں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔

رامیندر۔ لیکن میں ان لوگوں کو یُوں نہ چھوڑوں گا۔ ایک کا بخیہ اُدھیڑ کر نہ رکھ دوں تو نام نہیں۔

یہ کہتے ہوئے وہ محفل میں جا بیٹھے۔ کنور صاحب نے طشتریاں اُٹھوا اُٹھوا کر غربا کو تقسیم کروانی شروع کیں۔

(۴)

رامیندر ابھی شام کی ہوا خوری کر کے سوئے ہی تھے کہ ارباب نشاط کا ایک مجمع سلوچنا کو مبارک باد دینے کے لئے آپہنچا۔ اُن کے ساتھ باجہ تھا۔ کئی عورتیں سروں پر تھال رکھے ہوئے تھیں۔ ایک لڑکی ناچ رہی تھی۔ اور سب کی سب گاتی بجاتی چلی آتی تھیں۔ یہ بدھاوا تھا۔ زہرہ کی ایک سگی بھتیجی تھی گلنار۔ بلا کی حسین اور خوش گلو۔ سلوچنا کے یہاں پہلے برابر آتی جاتی تھی۔ ادھر دو سال سے

نہ آئی تھی۔ لڑکی کی ولادت کی خبر پاکر پھولی نہ سمائی۔ بدھاوا لے کر آپہنچی۔ حسب دستور اپنی سکھیوں، سہیلیوں کو بھی ساتھ لائی۔ اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔ اس پر شہر کے تماشائیوں کا اژدھام۔ پھاٹک پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ رامیندر پرشاد نے یہ شور وغل سُنا تو باہر آئے۔ گلنار نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔ اور بولی بابو جی بیٹی مبارک! بدھاوا لائی ہوں۔!

رامیندر پرشاد کا سارا جسم مفلوج سا ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ نہ منہ سے بولے نہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نہ وہاں سے ہلے۔ بس نقش دیوار بنے کھڑے رہ گئے۔ ایک بازاری عورت سے رسم پیدا کرنے کا خیال اس درجہ شرمناک اور پراشکراہ تھا۔ کہ اس کے سامنے ضمیر کی بلند آواز غائب ہو گئی۔ اتنا اخلاق بھی نہ برت سکے کہ کمرہ میں لے جا کر بٹھا تو دیتے۔ آج پہلی بار انہیں اپنی ذلت کا خود احساس ہوا۔ احباب کی بے وفائی اور لیڈروں کے احتراز کو وہ اُن کی بے انصافی سمجھتے تھے۔ اپنی ذلت نہیں۔ کل کے واقعہ کو بھی انہوں نے سماج کے ظلم ہی سے منسوب کیا۔ لیکن یہ بدھاوا ان کی آزادروی کے لئے بھی بہت سنگین تھا۔ سلوچنا نے جس آب و ہوا میں پرورش پائی تھی، وہ ایک شریف اور ممتاز ہندو خاندان کی آب و ہوا تھی۔ وہاں ان تعلقات کی چرچا تک نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ اب یہی سلوچنا ایک بار روزانہ زہرہ کے مزار کی زیارت کرنے جاتی تھی۔ مگر زہرہ اب ایک آسمانی وجود تھی۔ دُنیاوی کثافتوں اور آلائشوں سے پاک۔ گلنار سے قرابت داری اور مراسم کا نباہ دوسری بات تھی۔ جو لوگ تصاویر کے سامنے سر جھکاتے اور نمسکار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تصاویر پر پھول چڑھاتے اور تلک لگاتے ہیں۔ وہ بھی تو مورتی پوجا کی مذمت کرتے ہیں۔ ایک صریح ہے۔ دوسرا کنایہ۔ ایک نظروں کے سامنے ہے۔ دوسرا آنکھوں سے پوشیدہ۔

سلوچنا کل زچہ خانہ سے نکل چکی تھی۔ اپنے کمرہ میں پردہ کے سامنے کھڑی وہ رامیندر پرشاد کی پریشانی اور کشمکش دیکھ رہی تھی۔ جس سماج کو اُس نے اپنا معبود بنانا چاہا تھا۔ جس کے دروازہ پر سجدہ کرتے اُسے برسوں ہو گئے تھے۔ اُس کی طرف سے مایوس ہو کر اُس کا دل اس کا دل اس وقت بے اختیار بغاوت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا گلنار کو بلا کر گلے لگا لوں۔ جو لوگ میری بات کبھی نہیں پوچھتے اُن کی خوشامد کیوں کروں۔ یہ بیچاریاں اتنی دُور سے آئی ہیں۔ آخر مجھے اپنا ہی سمجھ کر تو۔ ان کے دل میں محبت تو ہے۔ یہ میرے رنج اور خوشی میں شریک ہونے کو تیار تو ہیں۔ انہیں لالچ یہاں نہیں لائی۔ اپنی جیب سے خاصی رقم خرچ کرنی پڑی ہوگی۔ کس لئے ؟ اسی لئے تو وہ کہ مجھے اپنا سمجھتی ہیں۔ اُن کا خون اب بھی جوش کھاتا ہے۔

آخر رامیندر نے سر اُٹھایا اور مصنوعی تبسم کے ساتھ گلنار سے بولے "آیئے۔ آپ لوگ اندر چلی آئیے۔ یہاں دھوپ ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگے آگے راستہ دکھاتے ہوئے دیوان خانہ کی جانب چلے کہ یکایک ایک خادمہ نکلی اور گلنار کے ہاتھ میں ایک پرزہ دے کر چلی گئی۔ گلنار نے وہ پُرزہ لے کر دیکھا اور اُسے رامیندر پرشاد کے ہاتھ میں دے کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ رامیندر نے پرزہ دیکھا۔ لکھا تھا بہن گلنار! تم یہاں ناحق آئیں۔ ہم لوگ یونہی ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اب اور رُسوا مت کرو۔ بدھاوا واپس لے جاؤ۔ بچی کے لئے دعا کرنا۔ کبھی ملنے کا جی چاہے تو رات کو آنا اور اکیلے۔ میرا جی تمہارے گلے لپٹ کر رونے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔

رامیندر نے پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور دلیرانہ انداز سے بولے :۔
"انہیں بکنے دو۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اندر آؤ۔"

گلنار نے ایک قدم پیچھے پھر کر کہا۔ نہیں بابوجی۔ اب مجھے اجازت دیجئے جاؤں گی۔

رامیندر۔ ایک منٹ تو بیٹھو۔!

گلنار۔ جی نہیں۔ ایک سکنڈ بھی نہیں۔ میں نے بڑی حماقت کی۔ کہ بے سوچے سمجھے یہ سب تیاریاں کر بیٹھی۔

یہ کہتی ہوئی وہ اُلٹے قدم واپس ہو گئی۔ خوان اور طشت سب جُوں کے تُوں لوٹ گئے۔

رامیندر کا چہرہ زرد تھا۔ سر جُھکا ہوا۔ آنکھوں میں اعتراف گناہ کی جھلک تھی۔ وہ خودداری، وہ غصہ جائز جو بے انصافی کے احساس سے پیدا ہوتا ہے رخصت ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ ندامت اور پشیمانی تھی۔ اپنی شکست کا ذلت آمیز احساس! اس گلنار کو بدھاوے کی کیوں سوجھ گئی۔ یوں تو کبھی آتی جاتی نہ تھی۔ آج بلائے بے درماں کی طرح کھوپڑی پر سوار ہو گئی۔ اپنے دل میں سمجھتی ہوگی۔ میری بڑی قدر ہوگی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ کنور صاحب اتنے آزاد خیال ہوں گے۔ انھوں نے زہرہ کے خاندان والوں سے بھائی چارے کا نباہ کیا ہوگا۔ میں اتنا آزاد نہیں ہوں۔ کہیں سلوچنا اس کے پاس آتی جاتی تو نہیں۔ مجھ سے تو اُس نے کبھی اس گلنار کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مگر پوشیدہ خط و کتابت کرتی ہوگی۔ ورنہ گلنار کو یہاں آنے کی ہمت نہ ہوتی۔ کنور صاحب عیاش تھے ہی۔ ان کے گھر بدھاوے آتے ہوں گے۔ ان کے گھر سے بائنے جاتے ہوں گے۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید کی تقریبوں میں دعوتیں اُڑتی ہوں گی۔ سلوچنا نے لکھا بھی تو ہے کہ ملنے کو جی چاہے تو بات کو آنا۔ اور اکیلی۔ جی تمہارے گلے لپٹ کر رونے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے کیوں نہ لکھے۔ خُوبُو وہی ہے۔ سرشت وہی، ضمیر وہی، انگاہ وہی، معیار وہی،

مانا کنور صاحب کے گھر میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مگر خون کا اثر اتنی جلد زائل نہیں ہو سکتا۔ اچھا دونوں بہنیں ملتی ہوں گی تو ان میں کیا باتیں ہوتی ہوں گی۔ علمی یا تاریخی چرچا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بازاری گفتگو ہوتی ہوگی۔ گلنار اپنے تجربات بیان کرتی ہوگی۔ بازار حسن کے خریداروں اور دکانداروں کے عیب و ہنر پر بحث ہوتی ہوگی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ گلنار اس کے پاس آتے ہی اپنے کو بھول جائے۔ اور کوئی بھدی، معیوب اور شرمناک بات نہ کرے۔ ان میں اتنی تہذیب اتنی متانت کہاں! اپنی فتوحات کی داستان کہتے کسے بُرا معلوم ہوتا ہے۔

مگر انسان بغیر کسی سے ملے جلے رہ بھی تو نہیں سکتا۔ یہ بھی تو ایک طرح کی بھوک ہے۔ بھوک میں اگر صاف کھانا نہ ملے۔ تو انسان جھوٹا کھانے سے بھی تو گریز نہیں کرتا۔ ہمارے دوست احباب نے ہی تو یہ حالت پیدا کی ہے۔ اگر یہ لوگ سلوچنا کو اپنا بناتے۔ اس سے یوں احتراز نہ کرتے۔ اُسے ذلیل نہ سمجھتے، تو اُسے کیوں ایسے آدمیوں سے ملنے کی خواہش ہوتی۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ ساری خطا ہمارے سماج کی ہے۔ جو ہمیں سنبھلنے نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے ماضی کو تازہ رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمیں گڈھے سے نکلنے نہیں دیتا۔ اگر یہ لوگ سلوچنا سے ہمدردی کرتے۔ اس کی عزت کرتے تو اس کے دل میں اپنی روایات ماضی سے خود بخود نفرت پیدا ہوتی۔ اس کے دل میں خود بخود روشنی جلوہ نما ہوتی۔ اُس کی تحقیر کر کے ان لوگوں نے اُسے اس طرف مائل ہونے پر مجبور کیا ہے۔!

کنور۔ تو یہ کہو تمہارے ایکا سے واپس کیا گیا ہے۔ تم نے اس طبقہ کو اپنی طرف کھینچنے کا کتنا نادر موقعہ کھو دیا ہے۔ اسلوچنا کی مثال کا جو کچھ تھوڑا بہت اثر پیدا ہوا تھا وہ تم نے مٹا دیا۔ بہت ممکن تھا کہ تمہاری ہمدردی اور اخلاق اور ایک معزز آدمی سے رشتہ رکھنے کا خیال اس کی زندگی میں ایک

نئے دَور کا آغاز کرتا۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہر ایک بُرائی مجبوری سے پیدا ہوتی ہے۔ چور اس لئے چوری نہیں کرتا کہ چوری کرنے میں اسے کوئی لطف حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ضرورت اُسے مجبور کرتی ہے۔ ہاں وہ ضرورت واقعی ہے یا خیالی اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ بیوی کے لئے میکہ جاتے وقت کوئی زیور بنوانا ایک آدمی کے لئے ضروری ہو سکتا ہے۔ دوسرے کے لئے بالکل غیر ضروری۔ فاقہ کشی کی حالت میں ایک آدمی اپنا ایمان کھو سکتا ہے۔ دوسرا مر جائے گا۔ مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے گا۔ مگر قدرت کا یہ قانون آپ جیسے عالموں کو نہ بھول جانا چاہیئے کہ زندہ رہنا فطرت کا پہلا اصول ہے زندہ رہنے کے لئے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ زندہ رہنا ہر ایک آدمی کے لئے جتنا ہی مشکل ہو گا۔ اتنی ہی برائیوں کی تعداد بھی بڑھے گی۔ جتنا ہی آسان ہوگا اتنی ہی برائیاں کم ہوں گی۔ سماج کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ زندہ رہنا ہر ایک آدمی کے لئے آسان ہو۔ رابندر بابو آپ نے اس وقت ان غریبوں کے ساتھ وہی کیا جو دوسرے آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور جس کا آپ کو بےحد صدمہ ہے۔

رامیندر پرشاد نے اس لمبی تقریر کو اس طرح سُنا گویا کوئی دیوانہ بک رہا ہو۔ اس قسم کی دلیلیں وہ بارہا سُن چکے تھے۔ اور خود ان کا استعمال کر چکے تھے۔ ان کا جواب دینے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ جب دل پر کوئی چوٹ لگتی ہے۔ تو دلیلوں سے آدمی کی تشفی نہیں ہوتی۔ جس کے روپے لُٹ گئے ہوں۔ اس کے لئے تقدیر یا ایشور کی مرضی کی دلیل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بازاری عورتوں کا دروازے پر رشتہ دار کی حیثیت سے آنا اتنا شرمناک اور ذلت آمیز تھا۔ کہ رامیندر کسی دلیل سے قائل ہو کر اُسے قبول نہ کر سکتے تھے۔ نفرت دلیلوں کی محکوم نہیں۔ لاپروائی سے بولے میں ایسے آدمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا

چاہتا۔ وہ زہر اپنے گھر میں نہیں پھیلانا چاہتا۔

اسی اثنا میں سلوچنا بھی کمرہ میں آگئی۔ زچگی کا اثر ابھی چہرہ اور جسم پر باقی تھا جسم لاغر تھا اور چہرہ زرد۔ رامیندر اُسے دیکھ کر ذرا تیز ہو گئے۔ وہ اس پر ظاہر کر دینا چاہتے تھے۔ کہ میں ایک حد تک جا سکتا ہوں۔ اس کے آگے میں کسی طرح قدم نہ اُٹھاؤں گا۔ مجھے اس حد سے آگے لے جانے کی کوشش کامیاب نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں بولے۔

'میں یہ کبھی نہ گوارا کروں گا۔ کہ کوئی بازاری عورت کسی وقت اور کسی حالت میں میرے گھر میں آئے۔ رات اس قید سے مستثنیٰ نہیں۔ اور نہ تنہا یا صورت تبدیل کر کے آنے سے ہی اس بُرائی کا اثر دُور ہو سکتا ہے۔ میں سوسائٹی کی حرف گیریوں سے نہیں ڈرتا۔ اس اخلاقی زہر سے ڈرتا ہوں۔ میرے ساتھ رہ کر تمام پُرانے ناتے توڑ دینے پڑیں گے۔ کوئی حیلہ، کوئی عذر سننے کی مجھے تاب نہیں ہے۔

سلوچنا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بولی 'کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس قید میں اکیلی جان دُوں۔ کوئی تو ہو جس سے آدمی ہنسے بولے۔

رامیندر نے گرم ہو کر کہا: ہنسنے بولنے کا شوق تھا۔ تو میرے ساتھ شادی نہ کرنی چاہیئے تھی۔ بیواہ کا بندھن بڑی حد تک سا تیاگ کا بندھن ہے۔ جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے۔ اور عورت خاندان کی عزت و حرمت کی ذمہ دار اور امین سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت تک کوئی مرد یہ نہ قبول کرے گا۔ کہ اس کی بیوی ایسے آدمیوں سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ جن کے اطوار اور کردار بُرے ہیں۔

کنور صاحب کو معلوم ہو گیا کہ اس طرح ردّوکد کرنے سے رامیندر اور سخت ہوتے جائیں گے۔ اور اصلی نشا فوت ہو جائے گا۔ اس لئے انھوں نے زیادہ سنجیدگی سے کہا: لیکن بیٹا! یہ کیوں خیال کرتے ہو۔ کہ ایک اعلیٰ درجہ

کی تعلیم یافتہ عورت دوسروں کا اثر قبول کرے گی۔ اپنا اثر بالکل نہ ڈالے گی۔

رامیشور رساں معاملات میں، میں تعلیم کا قائل نہیں تعلیم ایسی کتنی ہی باتوں کو جائز قرار دیتی ہے۔ جو رسم و رواج اور قدیم روایات کے اعتبار سے مذموم ہیں۔ فلسفہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ وہ شادی کو حیوانی ضرورت سمجھتا ہے۔ اور اس معاملہ میں جذبات اور نازک احساسات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ اگر پاؤں پھسل جائیں تو ہم انہیں کاٹ کر پھینکا نہیں دیتے۔ پھر اگر جسم کا کوئی دوسرا حصہ لغزش کرے تو وہ کیوں قابل بدھی نی سمجھا جائے۔ یہ منطق کی دلیل ہے۔ اور آپ مجھے معاف رکھیں۔ فی الحال میں اس دلیل کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں ہوں۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ میرے ساتھ رہ کر پرانے تعلقات مٹا دینے پڑیں گے۔ اتنا ہی نہیں، دل کو ایسا بنا لینا پڑے گا۔ کہ ایسی صحبتوں سے اُسے خود کراہیت ہو۔ ہمیں اس طرح زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ کہ سماج اپنی غلطی پر نادم ہو اور خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کرے۔ نہ یہ کہ ہم ایسا طرز معاشرت اختیار کریں۔ جس سے دوسروں کو اپنے احتراز کو جائز سمجھنے کا موقع ملے۔

ساوِتری نے بے نیازی کی شان سے کہا۔ کوئی عورت اتنی بدگمانی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ وہ اس قید کو برداشت کر سکتی ہے۔ آپ کو کیا حق ہے۔ کہ آپ اس کے رہنما بنیں؟ وہ آپ کی آنکھوں سے کیوں دیکھے۔؟ اسے یہ فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ کیا چیز اس کے لئے مضر ہے۔ اور کیا چیز مفید ہے۔

کنور صاحب خائف ہو کر بولے: "ساوِتری! تم بھولی جاتی ہو۔ کہ مباحثہ میں ہمیشہ ملائم الفاظ کا استعمال کرنا چاہیئے۔ ہم جھگڑا نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک مسئلہ پر دوستانہ مباحثہ کر رہے ہیں۔

سلوچنا نے بیباکانہ انداز سے کہا :۔ یہ دوستانہ مباحثہ نہیں ہے۔ میرے لئے بیڑیاں تیار کی جا رہی ہیں ۔ میں ان بیڑیوں کو نہیں پہن سکتی میں اپنے ضمیر کی آزادی کو اتنا ہی عزیز سمجھتی ہوں جتنا کوئی مرد سمجھتا ہے ۔ اور کسی حالت میں اسے قربان نہیں کر سکتی ۔

رامیندر نے اپنی زیادتی کو محسوس کر کے کہا :۔ میں نے تمہارے ضمیر کی آزادی کو چھیننے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ اور نہ میں اتنا تنگدل ہوں ۔ لیکن تمہارے کسی فعل کو میں معیوب سمجھوں تو کیا تمہیں سمجھانے کا مجھے حق نہیں ہے!؟

سلوچنا ۔ اتنا ہی ہے جتنا تمہیں سمجھانے کا مجھے ہے ۔ تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے ۔

رامیندر ۔ میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا ۔

سلوچنا ۔ اگر میں اپنے کسی عزیز سے ربط ضبط رکھوں تو آپ کی عزت میں خلل پڑتا ہے ۔ کیا اسی طرح آپ یہ تسلیم کریں گے کہ آپ کسی بازاری عورت سے آمد و رفت رکھیں تو میری عزت میں خلل پڑتا ہے ۔

رامیندر ۔ ہاں ! میں یہ مانتا ہوں ۔

سلوچنا ۔ آپ کا کوئی بھائی آ جائے تو محض اس بنا پر کہ اس کا تعلق کسی بازاری عورت سے ہے ۔ آپ اسے دروازے سے دھتکار دیں گے ؟

رامیندر ۔ تم مجھے اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتیں ۔

سلوچنا ۔ اور آپ مجھے مجبور کر سکتے ہیں ۔؟

رامیندر ۔ بیشک ۔

سلوچنا ۔ کیوں ۔؟

رامیندر ۔ اس لئے کہ میں اس چھوٹے سے خاندان کا جزو اعظم ہوں ۔

اس لئے کہ تمہارے باعث ہی مجھے .... رامیندر کہتے کہتے رک گئے۔ مگر سلوچنا اُن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تاڑ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا سینہ میں برچھی لگ گئی۔ جی میں بے اختیار ایک طوفان اٹھا کہ اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر ساری دنیا سے ناتا توڑ کر چلی جاؤں اور پھر انہیں منہ نہ دکھاؤں۔ اگر اسی کا نام شادی ہے۔ کہ کسی ایک آدمی کی مرضی کی غلام ہو کر رہوں۔ وہ رات کو دن کہے تو اُس کی ہاں میں ہاں ملاؤں تو اس شادی کو دور ہی سے سلام ہے۔

وہ طیش میں آ کر کمرہ سے نکلی اور باہر کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر کنور صاحب نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ اور بولے:۔ کیا کرتی ہو بیٹیا! گھر میں جاؤ۔ کیوں روتی ہو۔؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔؟ یہ تو نہیں جانتا۔ لیکن جب تک زندہ ہوں تمہیں کس بات کا غم ہے؟ رامیندر بابو نے کوئی ایسی بات نہیں کہی اور نہ کہنی چاہئے تھے۔ پھر آپس کی باتوں کا کیا بُرا ماننا۔ کسی موقعہ پر تم بھی جو جی میں آوے کہہ لینا۔

یوں سمجھاتے ہوئے کنور صاحب اُسے گھر میں لے گئے۔ حقیقتاً سلوچنا کے دل میں کبھی گلنار سے ملنے کی خواہش نہ ہوئی تھی۔ وہ اُس سے خود احتراز کرتی تھی۔ ایک عارضی غصہ کی حالت اُس نے گلنار کو وہ پُرزہ لکھ دیا تھا۔ مگر وہ خود سمجھتی تھی کہ ان لوگوں سے ربط ضبط رکھنا مناسب نہیں۔ لیکن رامیندر کی طرف سے یہ ممانعت ہوئی یہی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ یہ کیوں مجھے منع کریں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتی۔؟ کیا انہیں میری طرف سے اتنی بدگمانی تھی۔ یہ بدگمانی اسی لئے تو ہے کہ میں ....! نہیں میرے ساتھ مطلق ہمدردی نہیں! صریح دیکھتے ہیں۔ کہ دن بھر گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد! تمہیں تو میری دلدہی کے لئے خود گلنار کو کبھی کبھی بلا لینا چاہئے تھا۔

مجھے خود اس سے مل آنے کے لئے تقاضا کرنا تھا۔ میں ایسی نادان نہ تھی۔ کہ گلنار سے ملنے جاتی۔ یہ سب تو کچھ نہ ہوا۔ اُلٹے اور گلا دبانے کو تیار۔ ایسے محبت ہو وہ کبھی اتنا بیدرد نہیں ہو سکتا۔ محبت نہیں۔ بس بات یہی ہے۔ میں ابھی ابھی جاؤں گی۔ گلنار سے ملنے جاؤں گی۔ دیکھوں کوئی میرا کیا کرتا ہے۔

پیار میں پلی ہوئی سلوچنا کو کبھی کسی نے ترچھی نظروں سے دیکھا تک نہ تھا۔ کنور صاحب اس کی مرضی کے غلام تھے۔ رامیندر بھی اتنے دنوں اس پر نثار ہوتے رہے۔ آج یکایک یہ جھڑکی اور دھمکی پا کر اس کا خود سر دل الفت و محبت کے سارے رشتوں کو پیروں سے کچل ڈالنے کے لئے بیقرار ہو اٹھا۔ وہ سب کچھ سہہ لے گی۔ مگر یہ ذلت، یہ بیہودہ قید، یہ دھونس اس سے نہ سہی جائے گی۔ اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر سائیس سے کہا۔ گاڑی تیار کرو۔ مجھے چوک جانا ہے۔ ابھی لاؤ۔

کنور صاحب نے چمکار کر کہا۔ بیٹی سلو! کیا کرتی ہو۔ میرے اوپر ترس کھاؤ اس وقت کہیں مت جاؤ۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے پچھتانا پڑے گا۔ رامیندر بابو بھی بڑے غصہ ور آدمی ہیں۔ انہیں کا کہا مان لو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ تمہاری ماں جب زندہ تھی بار ہا ایسی نوبت آئی کہ میں نے اُس سے کہا گھر سے نکل جاؤ۔ مگر اُس محبت کی دیوی نے کبھی ڈیوڑھی کے باہر پاؤں نہیں نکالا۔ اس وقت تحمل سے کام لو۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ذرا دیر میں رامیندر خود نادم ہو کر تمہارے پاس اپنی خطا معاف کرانے آئیں گے۔

یکایک رامیندر نے آ کر پوچھا:۔ گاڑی کیوں منگوائی؟ کہاں جا رہی ہو۔؟

رامیندر کا چہرہ اتنا غضب ناک ہو رہا تھا کہ سلوچنا سہم اُٹھی۔ دونوں آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اُسے یہ کہنے کی ہمت

نہ پڑی کہ کہہ دے گلنار کے گھر جاتی ہوں۔ شاید اُسے خوف ہوا گلنار کا نام لیتے ہی یہ میری گردن پر سوار ہو جائیں گے۔ حفظ جان کا خیال غالب آیا۔ گردن جھکا کر بولی۔ ذرا اماں کے مزار تک جاؤں گی۔

رابیندر نے تحکمانہ انداز سے کہا: کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔

سلوچنا نے ناگ کی طرح پھنکار کر کہا: کیا اماں کے مزار کی زیارت کی بھی ممانعت ہے۔؟

رابیندر نے اُسی انداز سے کہا: ہاں!

سلوچنا۔ تو پھر اپنا گھر سنبھالو۔ میں جاتی ہوں۔

رابیندر۔ جاؤ، تمہارے لئے کیا، یہ گھر نہ سہی، دوسرا گھر سہی۔

ابھی تک تسمہ باقی تھا۔ وہ بھی کٹ گیا۔ یُوں شائد سلوچنا یہاں سے کنور صاحب کے بنگلہ پر جاتی۔ دو چار دن رُوٹھی رہتی۔ پھر رابیندر پرشاد اُسے منا لاتے۔ اور معاملہ طے ہو جاتا۔ لیکن اس چوٹ نے مصالحت اور تفہیم کی جڑ کاٹ دی۔ سلوچنا دروازہ تک پہنچی تھی۔ وہیں کھڑی رہ گئی۔ گو یا سارے اعضا مفلوج ہو گئے ہوں۔ گویا کسی رشی کے شراپ نے اس کے پران کھینچ لئے ہوں۔ وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔ کچھ سوچ نہ سکی۔ جس کے سر پر بجلی گر پڑی ہو۔ اس میں راکھ کے سوا اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔ سوچنے والا دماغ کہاں۔؟ رونے والا دل کہاں۔؟ بولنے والی زبان کہاں؟ یہ سب تو جل کر راکھ ہو گئے۔ وہاں اب کیا ہے۔ رابیندر کے یہ الفاظ بجلی سے کہیں زیادہ قاتل تھے۔

سلوچنا کب تک وہاں بیٹھی رہی اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ جب اُسے کچھ ہوش آیا۔ تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھڑی کی طرف نگاہ گئی۔ ایک بج رہا تھا۔ سامنے آرام کرسی پر کنور صاحب نوزائیدہ بچی کو گود میں لئے سو گئے تھے۔ برآمدہ

میں وائی بیٹھی جمہائیاں لے رہی تھی۔ سلوچنا نے اُٹھ کر برآمدہ میں جھانکا۔ رامیندر اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس کے جی میں آیا۔ اسی وقت اُن کے سامنے جا کر کلیجہ میں چھُرا مار لوں۔ اور انہیں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ وہ مہلک الفاظ یاد آ گئے۔

ہائے! ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلے کیوں کر۔! اتنے مہذب اور بیدار مغز اور روشن خیال ہو کر بھی وہ زبان پر ایسے الفاظ کیونکر لا سکے! اس کی ساری نسائیت، ہندوستانی عصمت کی ازلی روایات میں پلی ہوئی، زمین پر مجروح پڑی اپنی بیکسی پر رو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اگر میرے نام پر یہ داغ نہ ہوتا میں بھی شریف زادی ہوتی تو کیا یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل سکتے۔ ہرگز نہیں لیکن میں بدنام ہوں۔ کمزور ہوں بیکس ہوں۔ ذلیل ہوں۔ مجھے سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔

برآمدہ میں بجلی کی روشنی تھی۔ رامیندر کے چہرہ پر ندامت یا خجالت کا نام بھی نہ تھا۔ غصہ کی کرختگی اب بھی ان کے چہرہ پر مسلط تھی۔ شاید اُن آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اب بھی سلوچنا کے مجروح دل کو تشفی ہوتی۔ لیکن وہاں تو ابھی تک تلوار کھچی ہوئی تھی۔

سلوچنا پھر اُلٹے قدم آئی۔ کنور صاحب کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید روتے روتے سو گئے تھے۔ سلوچنا نے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ کر سچی عقیدت کے آنسو بہائے۔ ہاں مجھ بدنصیب کے لئے انہوں نے کتنی ذلتیں اٹھائیں۔ کتنی تکلیفیں سہیں۔ اپنی ساری زندگی مجھ پر نثار کر دی۔ اور اس کا یہ حسرت ناک انجام۔!

سلوچنا نے پھر بچی کو دیکھا۔ مگر اس کا گلاب کا سا شگفتہ چہرہ دیکھ کر بھی اس کے دل میں ممتا نے جوش نہ مارا۔ اُس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

یہ اس ذلت کی یادگار رہے۔ جو اتنے دنوں مجھے بھوگنی پڑی۔ میں اس کے لئے کیوں اپنی جان آفت میں ڈالوں۔ اگر اس کے باپ کو اس کی محبت ہے تو پالے۔ اور ایک دن وہ بھی اس طرح ذلیل ہو۔ جس طرح آج میرے دادا کو ذلیل ہونا پڑ رہا ہے۔

اس کے دل میں خیال آیا صبح رامیندر سو کر اٹھیں گے تو مجھے روتے دیکھ کر ان کا دل کتنا خوش ہوگا۔! نہیں میں انہیں یہ خوشی نہ ہونے دوں گی۔ جان دینا ایسا کیا مشکل ہے۔ اور پھر زندہ رہوں تو کس امید پر؟ اس طرح رو رو کر دن کاٹنے کے لئے نہیں۔ یوں جینا نہیں چاہتی۔ بہت جی چکی۔ اب دن بدن اور زیادہ درگت ہوگی۔!

ایشور! اب کی اگر جنم دینا تو کسی بھلے آدمی کے گھر جنم دینا۔ اس دنیا سے اور اس زندگی سے جی بھر گیا........

جہاں زہرہ کا مزار تھا۔ اس کے بغل میں ایک دوسرا مزار ہے۔ زہرہ کے مزار پر گھاس جم گئی ہے۔ جابجا سے چونہ گر گیا ہے۔ لیکن دوسرا مزار بہت صاف ستھرا اور آراستہ ہے۔ اس کے چاروں طرف گملے رکھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سرو کے درخت ہیں اور مزار تک جانے کے لئے ان درختوں کے بیچ سے روشیں بنی ہوئی ہیں۔ شام ہوگئی ہے۔

ایک آدمی ایک تین سال کی بچی کو گود میں لئے ہوئے آیا۔ اور اس مزار کی خاکروبی کرنے لگا۔ لڑکی دوڑ کر تتلیاں پکڑنے لگی۔ اس آدمی نے جھاڑو لگائی۔ پھر کنوئیں سے پانی کھینچ کھینچ کر سینچنے لگا۔ روشوں میں جو پتیاں پڑی تھیں۔ وہ چن کر صاف کیں۔......... یہ سلوچنا کا مزار ہے۔

اس کی آخری وصیت تھی کہ میری لاش جلائی نہ جاوے مجھے میری ماں کے پہلو میں سلادیا جائے۔

کنور صاحب تو سلوچنا کے بعد چھ مہینے سے زیادہ نہ چل سکے۔ رامیندر رسم قدیم نبھاتے جاتے ہیں۔

شوبھا اب تین سال کی ہوگئی ہے۔ اور اُسے یقین ہے کہ اس کی ماں ایک دن اسی مزار سے نکلے گی۔



ابھاگن

(۱)

پرشرام ۔ وہیں وہیں، وہیں دالان میں ٹھہرو۔
مریادا ۔ کیوں کیوں، مجھ میں کچھ چھوت لگ گیا؟
پرشرام ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنے دنوں کہاں رہیں؟ کس کے ساتھ رہیں؟ کس طرح رہیں۔؟ اور پھر یہاں کس کے ساتھ آئیں۔؟ تب .... سوچوں گا"!
مریادا ۔ کیا ان باتوں کے پوچھنے کا یہی وقت ہے۔؟ پھر موقع نہ ملیگا؟
"ہاں یہی بات ہے۔ تم اشنان کر کے ندی سے تو میرے ساتھ ہی نکلی تھیں۔ میرے پیچھے پیچھے کچھ دور تک آئیں بھی۔ میں پھر پھر کر تمہیں دیکھتا جاتا تھا پھر یکایک تم کہاں غائب ہو گئیں"؟
"تم نے دیکھا نہیں۔ ناگے سادھوؤں کی ایک ٹولی سامنے سے آ گئی۔ سب لوگ ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ میں بھی ریلے میں پڑ کر جانے کدھر چلی گئی۔ جب ذرا بھیڑ کم ہوئی تو تمہیں ڈھونڈھنے لگی۔ پر تم کہیں نظر نہ آئے"۔
"اچھا تب"؟

"تب میں ایک کنارے بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ سوجھ ہی نہ پڑتا تھا، کہاں جاؤں، کس سے کہوں۔ شام تک وہیں بیٹھی روتی رہی۔"

"اتنا طول کیوں دیتی ہو۔؟ وہاں سے پھر کہاں گئیں"؟

"شام کو ایک آدمی نے آ کر پوچھا تمہارے گھر کے لوگ کھو تو نہیں گئے ہیں۔؟ میں نے کہا ہاں۔ تب اُس نے تمہارا نام، پتہ، ٹھکانہ پُوچھا۔ اس نے سب ایک کتاب پر لکھ لیا اور مجھ سے بولا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

"وہ کون آدمی تھا"؟

"وہاں کی سیوا سمتی کا کوئی والنٹیر تھا۔"

"تو تم اس کے ساتھ ہو لیں"؟

"اور کیا کرتی۔ وہ مجھے سیوا سمتی کے دفتر میں لے گیا۔ وہاں ایک شامیانے میں لمبی ڈاڑھی والا آدمی بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ وہی ان والنٹیروں کا سردار تھا۔ اور بھی کتنے ہی خدام وہاں کھڑے تھے۔ اُس نے میرا پتہ ٹھکانہ ایک رجسٹر میں لکھ کر مجھے ایک علیحدہ شامیانہ میں بھیج دیا۔ جہاں اور بھی کئی کھوئی ہوئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تم نے سردار سے اُسی وقت کیوں نہ کہا کہ مجھے گھر پہنچا دو۔"

میں نے ایک بار نہیں سیکڑوں بار کہا۔ مگر وہ یہی کہتے رہے۔ کہ جب تک میلہ ختم نہ ہو جائے اور سب کھوئی ہوئی عورتیں جمع نہ ہو جائیں۔ میں تمہیں بھیجنے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ میرے پاس نہ اتنے آدمی ہیں نہ اتنے روپے۔"

"روپے کی تمہیں کیا کمی تھی۔ کوئی ایک سونے کی چیز بیچ دیتیں تو کافی روپے مل جاتے۔"

"آدمی تو نہیں تھے۔"

"تم نے یہ کہا تھا کہ خرچ کا تردد نہ کیجئے۔ میں اپنے زیور فروخت کرکے دیدوں گی۔"

"نہیں ــــ! یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"تمہیں اس وقت بھی زیور اتنے عزیز تھے۔"؟

"اور سب عورتیں کہنے لگیں، گھبرائی کیوں جاتی ہو۔؟ یہاں کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔ ہم بھی جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔ مگر کیا کریں مجبوری ہے میں بھی خاموش ہو رہی۔"

"اور سب عورتیں کنوئیں میں گر پڑتیں۔"؟

"جانتی تو تھی کہ یہ لوگ دہرم کے ناتے میری حفاظت کر رہے ہیں۔ کچھ میرے غلام نہیں ہیں۔ پھر ضد کس منہ سے کرتی؟ یہ بات بھی ہے کہ بہت سی عورتوں کو وہاں دیکھ کر میری دلجمعی ہو گئی۔"

"ہاں اس سے بڑھ کر دلجمعی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اچھا وہاں کتنے دن اس دلجمعی اور اطمینان کا لطف اٹھاتی رہیں۔ میلہ تو دوسرے ہی دن اٹھ گیا ہوگا۔"

"رات بھر میں عورتوں کے ساتھ اسی شامیانے میں رہی۔"

"اچھا تم نے مجھے تار کیوں نہ دلوا دیا۔"

"میں نے سمجھا جب یہ لوگ خود پہنچانے کے لئے کہتے ہیں۔ تو تار کیوں دوں۔"؟

"خیر رات بھر تم وہیں رہیں۔ نوجوان والنٹیر بار بار اندر آتے جاتے ہوں گے۔"؟

"صرف ایک بار ایک آدمی کھانے کے لئے پوچھنے آیا تھا۔ جب ہم

سبھوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو وہ چلا گیا۔ اور پھر رات بھر کوئی نہ آیا۔ میں تو برابر جاگتی رہی۔"

"یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ وہاں اتنے نوجوان تھے۔ اور کوئی اندر نہ گیا۔ سمتی کے لوگ آسمان کے فرشتے نہیں ہوتے۔ خیر۔ وہ ڈڑمیل تو ضرور ہی دیکھ بھال کرنے آیا ہوگا"؟

"ہاں وہ آتے تھے۔ مگر دروازہ ہی پر سے پوچھ کر لوٹ جاتے تھے۔ ہاں جب ایک عورت کے پیٹ میں درد ہونے لگا تو دو تین بار دوا پلانے آئے تھے۔"

"نکلی نہ وہی بات، میں ان بدمعاشوں کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ خاص کر تلک اور مالا والے ڈڑمیلوں کی حرکتوں سے تو میں خوب واقف ہوں۔ تو یہ حضرت کئی بار دوائیں دینے گئے۔ کیوں تمہارے پیٹ میں تو درد نہیں ہونے لگا تھا"؟

"تم ایک بزرگ اور نیک آدمی سے خواہ مخواہ بدظن ہو رہے ہو۔ وہ بیچارے ایک تو میرے باپ کے برابر تھے۔ دوسرے برابر آنکھیں نیچی کئے رہتے تھے"!

"ہاں! وہاں سب دیوتا ہی دیوتا جمع تھے۔ خیر! تم رات بھر وہاں رہیں۔ دوسرے دن کیا ہوا"؟

"دوسرے دن بھی وہیں رہی۔ ایک والنٹیر سب عورتوں کو ساتھ لے کر خاص خاص متبرک مقامات کی سیر کرانے لے گیا۔ دوپہر کو لوٹ کر ہم سب نے کھانا کھایا۔"

"تو وہاں تم نے سیر سپاٹا بھی خوب کیا۔ کوئی تکلیف نہ ہونے پائی۔

دعوت کے بعد گانا بجانا ہوا ہوگا" ؟

"گانا بجانا تو نہیں ہوا، ہاں سب اپنا اپنا دکھڑا روتی رہیں۔ شام تک میلہ اُکھڑ گیا تو دو سیوک ہم لوگوں کو لے کر اسٹیشن آئے۔"

"مگر تم تو آج ساتویں دن آ رہی ہو اور وہ بھی اکیلی" ؟

"اسٹیشن پر ایک حادثہ ہو گیا" !

"ہاں وہ تو میں سمجھ ہی رہا تھا۔ کیا حادثہ ہوا" ؟

"جب ہمارے ساتھ کا سیوک ٹکٹ لینے جا رہا تھا۔ تو ایک آدمی نے آ کر اُس سے کہا: یہاں گوپی ناتھ کی دھرم شالا میں ایک بابو جی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اُن کی عورت کھو گئی ہے۔ اُن کا بھلا سا نام ہے۔ یاد نہیں آتا۔ گورے گورے لمبے خوبصورت آدمی ہیں۔ لکھنؤ جھوائی ٹولے میں مکان ہے۔ تمہارا حلیہ اس نے ایسا ٹھیک بیان کیا کہ مجھے اُس پر یقین آ گیا۔ میں سامنے آ کر بولی۔ تم بابو کو جانتے ہو۔ وہ ہنس کر بولا۔ جانتا نہیں ہوں تو تمہیں تلاش کیوں کرتا پھرتا ہوں۔ تمہارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے۔ سب عورتیں کہنے لگیں۔ چلی جاؤ۔ تمہارے شوہر گھبرا رہے ہوں گے۔ والنیٹر نے اُس سے دو چار باتیں پوچھ کر مجھے اُس کے ساتھ کر دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کسی شیطان کے پنجہ میں پھنسی جا رہی ہوں۔ دل میں خوش تھی کہ اب بابو کو دیکھوں گی۔ تمہارے درشن پاؤں گی۔ شاید اسی اشتیاق نے مجھے گمراہ کر دیا۔"

"تو تم اس آدمی کے ساتھ چل دیں۔ وہ کون تھا" ؟

"کیا بتلاؤں کون تھا۔ کوئی دلال تھا۔"

"تمہیں یہ بھی نہ سوجھی کہ انہیں جا کر بابو جی کو بھیج دو۔"

"مصیبت آتی ہے تو عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔"

"دیکھو کوئی آرہا ہے"؟

"میں غسل خانہ میں چھپی جاتی ہوں۔"

"آؤ بھابی۔ کیا ابھی سوئیں نہیں۔ دس تو بجے ہوں گے"؟

"باسدیو کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا بھیا۔ کیا سو گیا"؟

"ہاں ابھی روتے روتے سو گیا ہے۔"

"کچھ مرجادا کی خبر بھی ملی۔ اب ملے بھی تو تمہارے کس کام کی۔ گھر سے نکلی ہوئی عورت تھان سے بھاگی ہوئی گھوڑی ہے جس کا کچھ بھروسہ نہیں۔"

"کہاں سے کہاں میں اُسے لے کر نہانے گیا۔"

"ہونہار ہے بھیا ہونہار! اچھا تو میں جاتی ہوں۔"

مرجادا باہر آکر بولی "ہونہار نہیں تمہاری چال ہے۔ باسدیو کو پیار کرنے کے بہانے تم اس گھر پر سکہ جمانا چاہتی ہو۔ تمہیں خوب سمجھتی ہوں۔"

پرشرام "بکواس۔ وہ دلال تمہیں کہاں لے گیا"؟

مرجادا "میرے مالک! مجھ سے یہ نہ پوچھئے۔ مجھے کہتے شرم آتی ہے"

"یہاں آتے تو اور بھی شرم آنی چاہیئے تھی۔"

"میں ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے کسی کو اپنا جسم چھونے بھی نہیں دیا۔"

"دلال کا حلیہ بیان کر سکتی ہو"؟

"سانولا سا ٹھنگنا آدمی تھا۔ نیچا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔"

"گلے میں تعویذ بھی تھی"؟

"ہاں ہاں تھی۔"

"وہ دھرم شالہ کا مہتر تھا۔ میں نے اُس سے تمہارے گم ہو جانے کا

ذکر کیا تھا۔ اُس بدمعاش نے یہ سوانگ رچا۔"

"مجھے تو وہ کوئی برہمن معلوم ہوتا تھا۔"

"نہیں وہ مہتر تھا۔ تو وہ تمہیں اپنے گھر لے گیا؟"

"ہاں! اُس نے مجھے تانگے پر بٹھایا اور ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹے سے مکان کے اندر لے جاکر بولا۔ تم یہیں بیٹھو۔ تمہارے بابو جی یہیں آئیں گے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ مجھے دھوکا دیا گیا۔ رونے لگی۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بڑھیا آئی۔ اور مجھے پھسلانے لگی۔ میں نے اُسے بہت پھٹکارا اور رات بھر روتی رہی۔ دوسرے دن پھر دونوں مجھے بہکانے لگے۔ کہنے لگے رو رو کر مر بھی جاؤ گی، مگر یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا۔ تمہارا ایک گھر چھوٹ گیا۔ ہم تمہیں اُس سے کہیں اچھا گھر دیں گے۔ جہاں تم سونے کے کور کھاؤ گی۔ اور ہیروں سے لد جاؤ گی۔ جب میں نے دیکھا یہاں سے کسی طرح نہیں نکل سکتی تو میں نے ایک چال چلی۔"

"خیر سن چکا۔ میں تمہارا ہی کہنا مانے لیتا ہوں کہ تم نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ پر مجھے اب تم سے نفرت ہو رہی ہے۔ تم میرے لئے اب وہ ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ جو پہلے تھیں۔ اس گھر میں تمہارے لئے جگہ نہیں ہے۔"

مرجا والے نے رو کر کہا "سوامی جی! یہ ستم نہ ڈھائیے۔ یوں کُند چھری سے میرا گلا نہ ریتئے۔ میں آپ کی وہی لونڈی ہوں جو پہلے تھی۔ سوچئے میری کیا حالت ہوگی۔

میں یہ سب سوچ چکا اور فیصلہ کر چکا۔ آج ایک ہفتہ سے یہی سوچ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو۔ میں برادری کی پروا نہیں کرتا۔ چھوت چھات کو میں پہلے ہی خیرباد کہہ چکا ہوں۔ دیوی دیوتاؤں پر، مذہب کے رسوم پر مجھے ذرا

بھی اعتقاد نہیں۔ پر جس عورت پر دوسروں کی نگاہیں پڑ چکیں۔ جو ایک ہفتہ تک نہ جانے کہاں اور کس حالت میں رہی۔ اُسے قبول کرنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ اگر یہ ظلم ہے، ستم ہے۔ تو ایشور کی جانب سے ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔"

"میری بے کسی پر آپ کو ذرا بھی رحم نہیں آتا؟"

"جہاں نفرت ہے۔ وہاں رحم کہاں؟ میں تمہاری پرورش کا بار اُٹھانے کو تیار ہوں۔ جب تک زندہ رہوں گا۔ تمہیں نان نفقہ کی تکلیف نہ ہونے دونگا۔ پر اب تم میری بیوی، نہیں ہو سکتیں۔"

"میں اپنے بیٹے کا منہ نہ دیکھوں اگر کسی نے میرے جسم کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

"تمہارا کسی غیر مرد کے ساتھ ایک لمحہ بھی تخلیہ میں رہنا تمہاری عصمت میں داغ لگانے کو کافی ہے۔ یہ عجیب و غریب رشتہ ہے۔ رہے تو ابد تک رہے ٹوٹے تو ایک پل میں ٹوٹ جائے۔ تمہیں بتاؤ کسی مسلمان نے مجھے زبردستی اپنا جھوٹا کھلا دیا ہوتا تو تم مجھے قبول کرتیں۔؟"

"وہ...... وہ...... تو دوسری بات ہے...... یعنی......"

"نہیں وہ بھی یہی بات ہے۔ جہاں جذبات کا تعلق ہے۔ وہاں بحث اور دلیل سے کام نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کہدے کہ تمہارے گھڑے کو مہتر نے چھو لیا ہے۔ تو تم وہ پانی ہرگز نہ پیو گی۔ اپنے دل سے سوچیں تمہارے ساتھ انصاف کر رہا ہوں، یا ظلم۔؟"

"میں تمہاری چھوئی ہوئی چیزیں نہ کھاتی۔ تم سے الگ رہتی۔ پر تمہیں گھر سے تو نہ نکال سکتی تھی۔ مجھے اسی لئے دُتکار رہے ہو نہ کہ تم گھر کے مالک ہو اور سمجھتے ہو میں اس کی پرورش کرتا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔"

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" ؟

"ہاں ۔! آخری ۔"

"جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا۔" ؟

"جانتا بھی ہوں' اور نہیں بھی جانتا۔"

"مجھے باسدیو کو لے جانے دو گے۔" ؟

"باسدیو میرا بیٹا ہے۔"

"اسے ایکبار پیار کر لینے دو گے۔" ؟

"خوشی سے نہیں۔ ہاں تمہارا جی چاہے تو دُور سے دیکھ سکتی ہو۔"

مرجاوا دو تین منٹ تک سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی۔ جیسے اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی ساری بساط، ساری کائنات، سینہ کے اندر سے ٹٹول کر نکال رہی ہو۔ جیسے اُسے شبہ ہو رہا ہو کہ یہ وہی میرا گھر ہے۔' یہ وہی میرا شوہر ہے۔ یہ وہی میرا لڑکا ہے۔ یا کوئی خواب ہے۔ کوئی طلسم، کوئی سراب۔!!

دفعتاً اس نے آپ ہی آپ کہا۔" تو جانے دو۔.......... بچے کو بھی نہ دیکھوں گی۔ سمجھ لوں گی کہ میں بیوہ بھی ہوں، اور بانجھ بھی........ تقدیر! لے چل، جہاں تیرا جی چاہے۔!!

جہاد

(۱)

بہت پرانی بات ہے۔ ہندوؤں کا ایک قافلہ مغرب کے غیر مہماں نواز، مرتفع، سنگین علاقہ سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ دوپہر کی دھوپ آگ سی برسا رہی تھی۔ مگر اس قافلہ کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ کچھ گرسنہ صورت بچے ہیں۔ کچھ خستہ حال بوڑھے۔ کچھ ژولیدہ مو لڑکیاں اور کچھ ہمت یاس کے پتلے جوان۔ یہ وہ خانماں برباد لوگ ہیں۔ جو اپنا سب کچھ ایمان پر صدقہ کرکے کسی ایسے ملجا کی تلاش میں سرگرم سفر ہیں۔ جہاں رام اور رحیم میں امتیاز نہ ہو۔ جہاں اختلافِ زبان کفر نہ ہو، جہاں عقائد کا فرق مخاصمت کی بنا نہ ہو۔ ہفتوں سے انہیں دانہ نصیب نہیں ہوا۔ جن کی جان ہتھیلیوں پر ہو انہیں بھوک اور پیاس کہاں۔ جان کا خوف نہیں، خوف ہے بے عصمتی کا، بے حرمتی کا، تشدد کا۔ ہر دم یہ خطرہ لگا ہوا ہے۔ کہ پیچھے سے فدایانِ جہاد کا کوئی غول نہ آرہا ہو۔ اس وقت بھی دو جوان بندوقیں کندھوں پر رکھے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ ان میں ایک کشیدہ قامت۔ خوبرو، قوی الجثہ جوان ہے۔ جس کی آنکھوں سے خود داری اور غرور کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ گویا اس کی ہر ایک حرکت پر

آسمان کے دیوتا نعرہ تحسین کر رہے ہیں۔ دوسرا میانہ قد، اکہرے بدن کا کمرو آدمی ہے۔ جس کی صورت بیکسی کی تصویر ہے۔ گویا دنیا میں اس کے لئے کوئی امید نہیں۔ گویا وہ شمع صفت رو رو کر دن کاٹنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔
اس کا نام دھرم داس ہے۔ اس کا خزان چند۔

چلتے چلتے یہ لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے جہاں ایک چھوٹا سا کنوال تھا۔ کنواں دیکھتے ہی ان کی ہمتیں مچل گئیں۔ آگے قدم نہ اٹھے۔ تن بر تقدیر ہو کر لوگوں نے وہیں پڑاؤ کر دیا۔ ایک ابھری ہوئی چٹان کے سایہ میں چھوٹی سی بستی آباد ہو گئی۔

دھرم داس نے بندوق کندھے سے اتار کر ایک چٹان پر بیٹھتے ہوئے خزان چند سے کہا۔ تم نے اپنے لئے کیا طے کیا۔؟ کوئی لاکھ سوا لاکھ کا اثاثہ ہوگا تمہارا۔؟

خزان چند نے مایوسانہ انداز سے کہا: لاکھ سوا لاکھ کا تو نہیں۔ ہاں پچاس ساٹھ ہزار کا ضرور تھا؛

"تو اب کیا کرو گے"؟

"جو کچھ سر پر آئے گی جھیلوں گا۔ دو چار رشتہ دار راولپنڈی میں ہیں۔ شاید وہ کچھ امداد کریں۔ تم نے کیا سوچا ہے"؟

"مجھے کیا غم! اپنے دونوں ہاتھ موجود ہیں۔ وہاں بھی انہیں کا سہارا تھا۔ اور آگے بھی انہیں کا سہارا ہے۔"

"اگر آج اور خیریت سے گزر جائے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔"

"میں تو منا رہا ہوں کہ ایک آدھ شکار نظر آ جائے۔ ایک درجن بھی آ جائیں تو بھون کر رکھ دوں۔"

یکایک چٹانوں کی آڑ سے ایک نازنین ہاتھ میں لوٹا ڈورے کر نکلی اور سامنے کنوئیں کی طرف چلی۔ حسن اس کے قدموں پر نثار ہو رہا تھا۔ دونوں نوجوان اُس کی طرف بڑھے۔ خزان چند تو چند قدم چل کر رُک گیا۔ دھرم داس نے حسینہ کے ہاتھ سے لوٹا اور ڈورے لیا۔ اور خزان چند کی طرف فاتحانہ نگاہ سے دیکھتا ہوا۔ کنوئیں کی طرف چلا۔ خزان چند نے پھر بندوق سنبھالی اور اپنی خفت مٹانے کے لئے آسمان کی طرف تاکنے لگا۔ اس طرح کی شکست اُسے بار ہا مل چکی تھی۔ شاید وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ شیاما کا منظور نظر دھرم داس ہے۔ خزان چند کی ساری دولت دھرم داس کے مردانہ حسن کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ کنایتہً ہی نہیں علانیہ شیاما کئی بار خزان چند سے بے اعتنائی کر چکی تھی۔ مگر وہ بدنصیب مایوس ہو کر بھی نہ جانے کیوں اُس پر نثار ہونے کو تیار رہتا تھا۔ تینوں ہی ایک بستی کے رہنے والے۔ ایک ساتھ کے کھیلنے والے تھے۔ شیاما یتیم تھی۔ اس کی خالہ نے اُسے پالا تھا۔ اور اب بھی خالہ ہی اُس کی کفیل تھی۔ خالہ کی تمنا تھی کہ خزان چند اس کا داماد ہو۔ لڑکی کی زندگی فارغ البالی میں بسر ہو۔ زندگی کے آخری ایام میں اُسے بھی ایک سہارا ہو۔ لیکن شیاما دھرم داس کی جانب مائل تھی۔ اُسے کیا خبر تھی۔ کہ جس خزان چند کو وہ پیروں سے ٹھکرا رہی ہے۔ وہی اُس کی چھوٹی سی کشتی کا ناخدا ہے۔ خزان چند ہی ضعیفہ کا منیم، خزانچی، وکیل، سب کچھ تھا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ شیاما اُسے اس زندگی میں نہیں مل سکتی۔ شاید اس کی دولت کا یہ صرف نہ ہوتا تو وہ اُسے لٹا کر فقیر ہو جاتا۔

(۲)

دھرم داس پانی لے کر لوٹ ہی رہا تھا کہ اُسے پچھم کی جانب سے کئی سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُس نے گنا پانچ تھے۔ اُن کی بندوقوں کی نالیاں دھوپ میں صاف چمک رہی تھیں۔ دھرم داس پانی لئے ہوئے دوڑا۔ کہیں راستہ ہی میں سواروں سے مڈھ بھیڑ نہ ہو جائے۔ لیکن کندھے پر بندوق اور ایک ہاتھ میں لوٹا ڈور لئے وہ بہت تیز نہ دوڑ سکتا تھا۔ فاصلہ دو سو گز سے زائد نہ تھا۔ راستہ میں پتھروں کے ڈھیر ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کہیں پیر نہ پھسل جائے۔ ادھر سوار ہر لمحہ قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ عربی گھوڑوں سے اس کا مقابلہ ہی کیا۔ اس پر منزلوں کا دھاوا مارے ہوئے۔ مشکل سے پچاس قدم چلا ہوگا۔ کہ سوار اُس کے سر پر آپہنچے۔ اور اُسے گھیر لیا۔ دھرم داس ہمت کا دھنی تھا۔ پر موت کو سامنے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر گر پڑی۔ پانچوں اُسی کے علاقہ کے محسودی تھے۔

ایک پٹھان نے کہا:۔ اُڑا دو سر مردود کا۔ دغا باز کافر۔!

دوسرا بولا نہیں نہیں۔ ...... ٹھہرو ...... اگر یہ اس وقت بھی اسلام قبول کرے تو ہم اسے معاف کر سکتے ہیں۔ کیوں دھرم داس۔ تمہیں اس دغا کی کیا سزا دی جائے؟ ہم نے تمہیں رات بھر کا وقت فیصلہ کرنے کے لئے دیا تھا۔ مگر تم رات ہی کو ہم سے دغا کرکے بھاگ نکلے۔ اس دغا کی سزا تو یہی ہے۔ کہ تم اسی وقت واصل جہنم کر دیئے جاؤ۔ لیکن ہم تمہیں پھر ایک موقعہ دیتے ہیں۔ یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر تم نے اب بھی کفر ترک نہ کیا تو تمہیں دن کی روشنی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

دھرم داس نے ہچکچا کر جواب دیا۔ جس بات کو عقل نہیں تسلیم کرتی

اُسے کیونکر.............
پہلے سوار نے طیش میں آکر کہا۔ مذہب کو عقل سے کوئی تعلق نہیں۔!
تیسرا۔ کفر ہے! کفر ہے!!
پہلا۔ اُڑا دو سر مردُود کا۔ دھواں اُس پار
دوسرا۔ ٹھہرو، ٹھہرو! مار ڈالنا مشکل نہیں۔ جلانا مشکل ہے۔
تمہارے اور ساتھی کہاں ہیں دھرم داس۔؟
دھرم داس۔ سب میرے ساتھ ہیں۔
دوسرا۔ کلام شریف کی قسم، اگر تم سب خدائے پاک اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ تو کوئی تمہیں تیز نگاہ سے دیکھ بھی نہ سکے گا۔
دھرم داس۔ آپ لوگ سوچنے کے لئے اور کچھ موقعہ نہ دیں گے۔؟
اس پر پانچوں سوار چلا اُٹھے۔ نہیں نہیں..... ہم تمہیں نہ جانے دینگے یہ آخری موقعہ ہے۔
اتنا کہتے کہتے پہلے سوار نے بندوق سنبھالی اور نال کو دھرم داس کے سینہ کی طرف کرکے بولا۔ "بس بولو..... کیا منظور ہے؟"
دھرم داس سر سے پاؤں تک کانپ کر بولا۔ اگر میں اسلام قبول کر لوں تو میرے ساتھیوں کو تو کوئی تکلیف نہ دی جائے گی۔"؟
دوسرا۔ اگر تم ضمانت کرو کہ وہ لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔
پہلا۔ ہم اس شرط کو نہیں مانتے۔ تمہارے ساتھیوں سے ہم خود نپٹ لیں گے۔ تم اپنی کہو۔ کیا چاہتے ہو؟ ہاں..... یا..... نہیں۔؟
دھرم داس نے زہر کا گھونٹ پی کر کہا: "میں خدا پر ایمان لاتا ہوں،"
پانچوں نے ہم آواز ہو کر کہا:۔ الحمدللہ! الحمدللہ!! اور باری باری

سے دھرم داس سے بغلگیر ہوئے۔

(۳۱)

شیاما دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ وہ دل میں پچھتا رہی تھی۔ کہ میں نے انہیں کیوں پانی لانے کو بھیجا۔ اگر معلوم ہوتا کہ تقدیر یوں گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تو وہ پیاسوں مر جاتی۔ پر دھرم داس کو نہ جانے دیتی۔ شیاما سے کچھ فاصلہ پر خزان چند بھی کھڑا تھا۔ شیاما نے اس کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ اب اُن کی جان بچتی نہیں نظر آتی۔

خزان چند۔ بندوق بھی ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

شیاما۔ نہ جانے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ارے غضب! وہ ظالم اُن کی طرف بندوق تان رہا ہے۔

خزان چند۔ ذرا اور قریب آجائیں تو میں بندوق چلاؤں۔ اتنی دور کی زد اس میں نہیں ہے۔

شیاما۔ ارے! دیکھو وہ سب انہیں گلے لگا رہے ہیں۔ یہ ماجرا کیا ہے۔؟ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

"کہیں انھوں نے اسلام تو نہیں قبول کر لیا"؟

"شائد! یہ تو دھرم داس کی ذات سے بعید ہے"

"میں سمجھ گئی۔ ٹھیک یہی بات ہے۔ بندوق چلاؤ"

"دھرم داس بیچ میں ہیں۔ کہیں اُنہیں نہ لگ جائے"

"کوئی ہرج نہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ پہلا نشانہ دھرم داس ہی پر پڑے بے غیرت! بے شرم! جان کے لیے اپنا دھرم چھوڑ دیا۔! ایسی بیحیائی کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر۔ کیا سوچتے ہو۔؟ کیا تمہارے ہاتھ پاؤں

بھی بھول گئے۔؟ لاؤ بندوق مجھے دے دو۔ میں اس بے غیرت کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔"

"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وھرم داس ...."

"تمہیں کبھی یقین نہ آئے گا۔ لاؤ بندوق مجھے دیدو۔ کھڑے تاکتے ہو۔ کیا وہ سر پر آجائیں گے۔ تب بندوق چلاؤ گے؟ کیا تمہیں بھی یہی منظور ہے۔ کہ اسلام پر ایمان لاکر جان بچاؤ۔ اچھی بات ہے۔ جاؤ! شیاما اپنی حفاظت آپ کرسکتی ہے۔ مگر اسے اب منہ نہ دکھانا۔"

خزان چند نے بندوق چلائی۔ گولی ایک سوار کی پگڑی کو اڑاتی ہو گئی۔ نکل گئی۔ جہادیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ دوسری گولی آئی۔ وہ ایک گھوڑے کی چھاتی پر بیٹھ گئی۔ گھوڑا وہیں گر پڑا۔ جہادیوں نے پھر اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ اور آگے بڑھے۔ تیسری گولی آئی۔ ایک پٹھان لوٹ گیا۔ پر اس کے قبل کہ چوتھی گولی آئے۔ چاروں پٹھان خزان چند کے سر پر پہنچ گئے اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

ایک سوار نے خزان چند کی طرف بندوق تان کر کہا۔ اڑا دو اس مردود کو۔ اس سے خون کا بدلہ لینا ہے۔

دوسرا۔ نہیں، نہیں۔ یہ دلیر آدمی ہے۔ خزان چند! تمہارے اوپر دغا، خون اور کفر، یہ تین الزام ہیں اور تمہیں قتل کر دینا عین ثواب ہے۔ لیکن ہم تمہیں ایک موقعہ اور دیتے ہیں۔ اور اگر تم اب بھی خدا اور رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ تو ہم تمہیں سینہ سے لگانے کو تیار رہیں۔ اس کے سوا تمہارے گناہوں کا اور کفارہ نہیں ہے۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔ بولو کیا منظور ہے۔؟

چاروں پٹھانوں نے کمروں سے تلواریں نکال لیں۔ اور خزان چند

کے سر پر تان دیں۔ گویا 'نہیں' کا لفظ منہ سے نکلتے ہی اُس کی گردن زمین پر تڑپ رہی ہو گی۔

خزان چند کے چہرہ پر ایک مردانہ شکوہ جلوہ افروز ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں شوقِ شہادت سے منور ہو گئیں۔ متین لہجہ میں بولا۔ تم ایک ہندو سے یہ سوال کر رہے ہو۔؟ کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ جان کے خوف سے اُس کے ایمان میں لغزش آ جائے گی۔؟ ہندو کو اپنے معبود تک پہنچنے کے لئے کسی نبی، ولی یا پیغمبر کی ضرورت نہیں۔

چاروں پٹھانوں نے چلا کر کہا۔ کُفر! کُفر۔!

خزان چند۔ اگر تم اسے کُفر سمجھتے ہو تو سمجھو۔ میں اپنے کو تم سے زیادہ خدا پرست سمجھتا ہوں۔ میں اِس مذہب کا پیرو ہوں جس کی بنیاد آزادی عقل پر ہے۔ انسان میں عقل ہی نُورِ حقیقی ہے۔ ہمارا ایمان ہماری عقل کا مطیع ہے۔

چاروں پٹھانوں کے منہ سے نکلا۔ کُفر! کُفر! اور چاروں تلواریں ایک ساتھ خزان چند کی گردن پر پڑ گئیں۔ لاش زمین پر پھڑکنے لگی۔ دھرم داس سر جُھکائے کھڑا رہا۔ وہ دل میں خوش تھا۔ کہ اب خزان چند کی ساری دولت میرے ہاتھ لگے گی۔ اور شیاما کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھاؤں گا۔ مگر تقدیر کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ شیاما اب تک ایک ازخود رفتگی کے عالم میں کھڑی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ جونہی خزان چند زمین پر گرا۔ وہ ایک جنون کی حالت میں دوڑی اور اُسے گود میں لے کر آنچل سے سیلاب خون کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس کے سارے کپڑے خُون سے تر ہو گئے۔ اُس نے اس سے کہیں خوبصورت شلواریں پہنی تھیں۔ پر اس خون سے رنگی ہوئی شلوار کی شان ناقابل بیان

تھی ۔ بیل بوٹوں والی شلواریں اُس کے حسن کو چمکاتی تھیں ۔ یہ خون آلود شلوار اس کی رُوح کو منور کر رہی تھی ۔

ایسا معلوم ہوا گویا خزان چند کی بجھتی ہوئی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں ۔ اُن آنکھوں میں کتنی رُوحانیت، کتنی مسرت، کتنا ولولہ جھلک رہا تھا ۔ زندگی میں جس نے پریم کی بھیک بھی نہ پائی ۔ وہ مرنے پر لازوال دولت کا مالک بنا ہوا تھا ۔

(۴)

دھرم داس نے شیاما کا ہاتھ پکڑ کر کہا : شیاما ہوش میں آؤ ۔ تمہارے سارے کپڑے خون سے تر ہو گئے ہیں ۔ اب رونے سے کیا حاصل! یہ لوگ ہمارے دوست ہیں ۔ ہمیں کوئی ایذا نہ پہنچائیں گے ۔ ہم پھر گھر چلیں گے ۔ اور زندگی کے دن آرام سے بسر کریں گے ۔

شیاما نے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا ۔ تمہیں اپنا گھر بہت پیارا ہے ۔ تو جاؤ ۔ میری فکر مت کرو ۔ میں اب نہ جاؤں گی ۔ ہاں اگر کچھ میری محبت باقی ہے ۔ تو ان لوگوں سے کہہ دو اسی تلوار سے میرا ابھی خاتمہ کر دیں ۔

دھرم داس رقت آمیز لہجہ میں بولا ۔ شیاما! یہ تم کیا کہتی ہو ۔ تم بھول گئیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں ۔ مجھے خود خزان چند کی موت کا رنج ہے ۔ مگر شُدنی کو کون ٹال سکتا تھا ۔

شیاما ۔ اگر یہ شدنی تھی تو یہ بھی شدنی ہے کہ میں ساری عمر اس پاک رُوح کی یاد میں بسر کروں ۔ جس کی میں نے زندگی میں کبھی قدر نہ کی ۔

یہ کہتے کہتے شیاما کا دفورِ اشک جواب تک نفرت اور حقارت کے نیچے دبا ہوا تھا ۔ اُبل پڑا اور وہ خزان چند کے سرد اور بےجس ہاتھوں کو

گلے میں ڈال کر رونے لگی۔

چاروں پٹھان کھڑے وفا اور ایثار کا یہ ایمان انگیز جلوہ دیکھ رہے تھے۔ آخر ان پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ ایک نے دھرم داس سے کہا: تم اس پارسا خاتون سے کہو۔ ہمارے ساتھ چلے۔ اس کا ہم دل سے احترام کریں گے۔ ہماری ذات سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

دھرم داس کے سینہ میں حسد کی آگ دہک رہی تھی۔ وہ حسینہ جسے وہ اپنی سمجھے بیٹھا تھا اس وقت اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ بولا 'شیاما! تم چاہے اس لاش پر آنسوؤں کی ندی بہا دو پر یہ زندہ نہ ہوگی۔ اور نہ خزان چند اب تمہاری وفا کی قدر کر سکتا ہے۔ یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ میں اور لوگوں کو بھی جا کر سمجھاتا ہوں۔ یہ خان لوگ ہماری حفاظت کا ذمہ لے رہے ہیں۔ ہماری جائدادیں۔ مکانات، سب مل جائیں گے۔ خزان چند کی دولت کے مالک بھی ہمیں لوگ ہوں گے۔ اب دیر نہ کرو۔ رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں۔ شیاما نے دھرم داس کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر کہا۔ اور اس واپسی کی قیمت کیا دینی ہوگی؟ وہی جو تم نے دی ہے۔؟ دھرم داس اس طنز کو نہ سمجھ سکا۔ بولا۔ میں نے تو کوئی قیمت نہیں دی۔ میرے پاس تھا ہی کیا۔

شیاما۔ یہ نہ کہو۔ تمہارے پاس وہ خزانہ تھا۔ جو تمہیں رشیوں نے عطا کیا تھا۔ جس کی حفاظت رگھو اور منو۔ رام اور کرشن۔ بدھ اور شنکر نے کی تھی۔ اس لاثانی ورثہ کو تم نے آج حقیر جان کے لئے کھو دیا۔ ایسی واپسی تم کو مبارک ہو۔ تم جاؤ۔ جن تلواروں نے بیر خزان چند کی زندگی کا فیصلہ کیا انہیں نے میری محبت کا بھی فیصلہ کر دیا۔ زندگی میں میں نے اس کے ساتھ

جو بیوفائی اور بے اعتنائی کی ۔ اب مرنے کے بعد اُس کا کفارہ ادا کروں گی۔ وہ دھرم پر مرنے والا بیر تھا ۔ دھرم کو بیچنے والا نامرد نہیں ۔ اگر تم میں اب بھی کچھ حمیت ہے ۔ تو اس لاش کی کریا کرم کرنے میں میری مدد کرو ۔ اور تمہارے آقاؤں کو یہ بھی گوارا نہ ہو تو جانے دو ۔ میں سب کچھ کر لوں گی ۔

دلیر پٹھانوں کے دل درد سے تڑپ اُٹھے ۔ انسانیت جذبۂ جہاد پر غالب آئی ۔ دیکھتے دیکھتے لکڑیوں کا انبار لگ گیا ۔ دھرم داس خفت سے سر جھکائے بیٹھا تھا ۔ اور چاروں پٹھان لکڑیاں کاٹ رہے تھے ۔ چتا تیار ہو گئی ۔ اور جن بے درد ہاتھوں نے خزان چند کی جان لی تھی ۔ انہیں نے اس کی لاش کو چتا پر رکھا ۔ شیاما نے آگ لگائی ۔ شعلے ہوا میں بلند ہو گئے ۔ گویا اگنی دیوتا اپنی آتشیں زبانوں سے اس دھرم ویر کا جس گا رہے ہوں ۔

(۵)

پٹھانوں نے خزانچند کی ساری دولت لا کر شیاما کو دیدی ۔ اُس نے بہت انکار کیا ۔ مگر کون سنتا تھا ۔ شیاما نے وہیں دامن کوہ میں کنوئیں کے قریب ایک چھوٹا سا جھونپڑا کھڑا کر دیا ۔ اور حق و فا نبھانے لگی ۔ اس کی خالہ تو اس کے ساتھ رہ گئی ۔ اور سب لوگ واپس گئے ۔ کیونکہ اب قبول اسلام کی شرط نہ تھی ۔ خزان چند کی شہادت نے جذبۂ جہاد کو فرو کر دیا تھا ۔ دھرم داس بھی وہیں رہنا چاہتا تھا ۔ مگر پٹھانوں نے اُسے نہ چھوڑا ۔ ساتھ لے گئے ۔ دوسرے دن مسجد میں ملاؤں کا ہجوم ہوا ۔ لوگ دھرم داس کو اس کے گھر بلانے گئے ۔ مگر اُس کا وہاں پتہ نہ تھا ۔ چاروں طرف تلاش ہوئی ۔ کہیں سُراغ نہ ملا ۔

سال بھر گزر گیا ۔ شام کا وقت تھا ۔ شیاما اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی مستقبل کے شیریں خواب دیکھ رہی تھی ۔ ماضی جاں گداز تھی ۔ حال دل

دل شکن۔ ساری آرزوئیں مستقبل سے وابستہ تھیں۔ اور مستقبل بھی وہ جس کا اس زندگی سے تعلق نہ تھا۔ آسمان پر سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ اور سامنے کی پہاڑیاں سکوتِ زرّیں کے غلاف میں لپٹی ہوئی اُس کے سُنہرے مستقبل کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ درختوں کے برگ ہائے لرزاں سے کچھ اس طرح سرسراہٹ کی آواز نکل رہی تھی گویا کوئی روح اُن کے غم میں بیٹھی ہوئی سسکیاں بھر رہی ہو۔

دفعتہً ایک خستہ حال، نیم برہنہ آدمی آکر جھونپڑے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ کتا زور سے بھونک اُٹھا۔ شیا ما نے چونک کر دیکھا۔ اور چلا اُٹھی ......دھرم داس ـــ!

دھرم داس نے وہیں زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ہاں شیاما! .... میں بدنصیب دھرم داس ہی ہوں۔ سال بھر سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے گرفتار کرنے کے لئے انعام کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اور سارا علاقہ میرے درپے ہے۔ اس زیست سے تنگ آگیا ہوں۔ پر موت بھی نہیں آتی۔

شیاما نے کوئی جواب نہ دیا۔ دھرم داس ایک لمحہ کے بعد پھر بیکسانہ انداز سے بولا کیوں شیاما، کیا ابھی تمہارا دل میری طرف سے صاف نہیں ہوا؟ تم نے میری خطا معاف نہیں کی۔؟

شیاما نے بے اعتنائی سے کہا: میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

"میں اب بھی ہندو ہوں۔ میں نے اسلام نہیں قبول کیا ہے۔"

"جانتی ہوں۔"!

"یہ جان کر بھی تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا"!

شیاما نے سخت نگاہوں سے دیکھا۔ اور پُرجوش انداز سے بولی۔

تمہیں مجھ سے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی ! میں اُس شہید کی بیاہتا ہوں۔ جس نے اپنے قوم کی لاج رکھی ہے۔ اپنے دھرم پر جان دی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ مر گیا؟ یہ تمہاری غلطی ہے۔ وہ زندہ جاوید ہے ! میں اس وقت بھی اس کا منور چہرہ دیکھ رہی ہوں۔ تم نے اپنی قوم کو بدنام کیا ہے۔ میرے سامنے سے دور ہو جاؤ ؎

دھرم داس نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے سے اُٹھا۔ ایک لمبی سانس لی۔ اور ایک طرف چل دیا۔

صبح شیاما پانی بھرنے جا رہی تھی۔ تو اسے راستہ میں ایک لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔ دو چار گدھ اُس پر منڈلا رہے تھے۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ قریب جا کر دیکھا اور پہچان گئی۔

اُس کی آنکھوں سے اشک کے کئی قطرے زمین پر گر پڑے۔ وہ کدورت جو کسی سرطان کی طرح اس کے دل پر مسلط تھی۔ جس نے اُس کی زلیست غم کو بھی بحیثیت بنا رکھا تھا۔ جس نے ماضی کو بھی نفرت سے ملوث کر رکھا تھا۔ وہ آج اس طرح مٹ گئی۔ جیسے برف پگھل جائے۔

دیوی

(۱)

بپن بابو کے لئے عورت دنیا کی سب سے حسین شے تھی۔ وہ شاعر تھے اور ان کے شاعرانہ تخیل کے لئے نسوانی حسن اور شباب کا ذکر ہی سب سے دلآویز مشغلہ تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تب ہی سے انھوں نے اس حسینہ کا تصور کرنا شروع کیا۔ جو ان کے دل کی رانی ہوگی۔ اس میں طلوع سحر کی شگفتگی ہوگی۔ پھول کی نزاکت، کندن کی چمک، بسنت کی فرحت، کوئل کی آواز، وہ سارے شاعرانہ اوصاف سے مزین ہوگی۔ وہ اسی تصور کے دلدادہ تھے۔ اپنی غزلوں میں اسی کو مخاطب کرتے۔ دوستوں سے اسی کا چرچا کرتے۔ اور ہمیشہ اسی خیال میں مست رہتے تھے۔ وہ دن بھی قریب آ گیا تھا۔ جب ان کی آرزوئیں ہرے ہرے پتوں سے لہرائیں گی۔ اس باغ میں بہار کے دن آئیں گے۔ کالج کا آخری امتحان ختم ہو گیا تھا۔ اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔

(۲)

شادی طے ہو گئی۔ بپن بابو نے عروس کو ایک نظر دیکھنے کی بہت ضد کی۔ لیکن جب ان کے ماموں نے یقین دلایا کہ لڑکی نہایت حسین ہے تو

خاموش ہو گئے۔ دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ دلہن زیوروں سے لدی ہوئی منڈپ میں لائی گئی تو اس کے ہاتھ پاؤں نظر آئے کتنی نازک اور خوبصورت انگلیاں تھیں! اعضا کا تناسب کتنا دلکش تھا۔ بپن باغ باغ ہو گئے۔ دوسرے دن رخصتی ہو گئی۔

بپن بابو دیدار کے لئے بیقرار تھے۔ بار بار اپنے گھوڑے کو دلہن کی پالکی کے پاس لاتے تھے لیکن درشن نہ ہوتے تھے۔ پالکی پر موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر ہو گیا۔ کہاروں نے ایک درخت کے سایہ میں پالکی اُتار دی۔ اور حقہ چلم کرنے کے لئے کنوئیں پر چلے گئے۔ بپن کو منہ مانگی مراد ملی۔ چپکے سے دلہن کے پاس جا پہنچے۔ وہ پالکی سے سر نکالے۔ گھونگھٹ ہٹائے باہر جھانک رہی تھی۔ بپن نے اُسے دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ نفرت۔ غصہ۔ اور مایوسی نے جیسے ان کے دل کو کچل دیا۔ یہ وہ حُسن و نزاکت کی دیوی نہ تھی جس کی وہ برسوں سے پرستش کر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑے منہ، چپٹی ناک اور پھولے ہوئے رخساروں والی مکروہ صورت عورت تھی۔ جس پر صنفِ نازک کا کسی طرح بھی اطلاق نہ ہو سکتا تھا۔ بپن کی ساری مستی رخصت ہو گئی۔ آہ! اس کو جاگوانا گو میرے ہی گلے پڑنا تھا۔ کیا اس کے لئے دنیا میں، اور کوئی شوہر نہ ملتا تھا۔ انہیں اپنے ماموں پر غصہ آیا۔ جس نے عروس کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے۔ مگر خیریت ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں نہ تھے۔ بپن سوچنے لگا۔ میں اس عورت سے کیسے بولوں گا۔؟ کیسے اس کے ساتھ یہ زندگی بسر کروں گا۔ اس کی طرف تو تاکنے ہی سے نفرت ہوتی ہے۔ ایسی مکروہ صورتیں بھی دنیا میں ہیں اس کی اُسے خبر نہ تھی۔ کیا منہ ایشور نے بنایا ہے۔ کیا آنکھیں ہیں۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔۔۔!

(۳)

بپن زندگی سے بیزار تھا۔ وہ اپنے ماموں سے لڑا۔ سُسر کو ایک طولانی عتاب نامہ لکھا۔ ماں باپ سے ردوکد کی۔ اور آخر گھر سے بھاگ جانے کے منصوبے باندھنے لگا۔ آشا پر اُسے رحم آتا تھا۔ وہ اپنے تئیں سمجھاتا کہ اس میں اُس غریب کی کیا خطا ہے۔ اس نے زبردستی تو مجھ سے شادی نہیں کی۔ لیکن یہ رحم اور تحمل اس نفرت پر غالب نہ آسکتا تھا۔ جو آشا کو دیکھتے ہی اُس کی رگ رگ میں سرایت کر جاتی تھی۔ آشا اپنے اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی۔ طرح طرح کے بال سنوارتی۔ گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرتی۔ لیکن بپن کو یہ شُتر غمزے معلوم ہوتے تھے۔ کئی کئی دن گھر میں نہ آتا۔ وہ یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کا بیاہ ہو گیا ہے۔

ایک دن کھانا کھانے کے وقت آشا نے اس سے کہا۔ اب تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ کیا میرے کارن گھر چھوڑ دیجئے گا۔؟

بپن نے منہ پھیر کر کہا:۔ گھر ہی پر تو رہتا ہوں۔ آج کل نوکری کی تلاش ہے۔ اسی لئے دوڑ دھوپ زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

آشا۔ کسی ڈاکٹر سے میری صورت کیوں نہیں بنوا دیتے۔ سنتی ہوں آج کل منہ سدھارنے والے ڈاکٹر پیدا ہو گئے ہیں۔

بپن۔ کیوں ناحق چڑھاتی ہو۔ کھانے دو گی یا نہیں۔؟

آشا۔ آخر اس مرض کی دوا کون کرے گا۔؟

بپن نے جھنجلا کر کہا:۔ اس مرض کی دوا نہیں ہے۔ جو کام ایشور سے نہ ہو سکا وہ آدمی کیا کرے گا۔

آشا۔ یہ تو تمہیں سوچو کہ ایشور کی غلطی کی مجھے سزا دے رہے ہو۔

دُنیا میں کون ایسا آدمی ہے۔ جسے اچھی صورت بُری لگتی ہو۔ لیکن تم نے سُنا ہے کہ کسی عورت نے اپنے شوہر کو محض بدصورت ہونے کے باعث چھوڑ دیا؟ شاید دوسرے ملکوں میں عورتیں اتنی صورت پرست ہوں۔ لیکن یہاں تو نہیں ہیں۔

بپن نے بگڑ کر کہا۔ کیوں ناحق سر کھا رہی ہو۔ میں تم سے بحث تو نہیں کر رہا ہوں۔ دل پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ دلیلوں کا ہی اس پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ میں تمہیں کچھ کہتا تو نہیں ہوں۔ پھر کیوں مجھ سے حجت کرتی ہو۔؟

آشا یہ جھڑکی سن کر چلی گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ انھوں نے ہمیشہ کے لئے میری طرف سے اپنا دل سخت بنا لیا ہے۔

(۴)

بپن تو روز سیر سپاٹے کرتے۔ کبھی کبھی رات رات بھر غائب رہتے۔ ادھر آشا فکر اور غم سے گھلتے گھلتے بیمار پڑ گئی۔ لیکن بپن بھول کر بھی اُسے دیکھنے نہ جاتے۔ تیمارداری تو دور رہی۔ اتنا ہی نہیں، وہ دل میں مناتے تھے کہ یہ مر جائی تو گلا چھوٹتا۔ اب کی دفعہ خوب دیکھ بھال کر اپنی پسند کی شادی کرتا۔

اب وہ اور بھی کھیل کھیلے۔ پہلے آشا سے کچھ دبتے تھے۔ کم سے کم یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی میری حرکات پر نگاہ رکھنے والا بھی ہے۔ اب وہ خیال بھی غائب ہو گیا۔ یہاں تک نوبت بڑھی کہ مردانے کمرے ہی میں احباب کے جمگھٹ ہونے لگے۔ لیکن نفس پرستی صرف دولت کا ہی ستیاناس نہیں کرتی۔ اس سے کہیں زیادہ قوائے ذہنی و جسمانی کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ بپن کے

چہرے پر زردی چھا گئی۔ جسم لاغر ہو گیا۔ پسلیوں کی ہڈیاں نکل آئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ بناؤ سنوار کرتے۔ روز تیل ملتے خط صاف کرتے۔ کپڑے بدلتے، پر چہرہ پر وہ چمک اور سرخی نہ تھی۔ جو صحت کی برکت ہے۔ رنگ و روغن سے کیا ہو سکتا تھا۔

ایک دن آشا برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ادھر ہفتوں سے اس نے بپن کو نہ دیکھا تھا۔ آج انہیں دیکھنے کو جی چاہا۔ اسے خوف تھا کہ وہ نہ آئیں گے۔ پھر بھی وہ اس خواہش کو دور نہ کر سکی۔ بپن کو بلا بھیجا۔ بپن کو بھی اس پر کچھ رحم آ گیا۔ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ آشا نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔ وہ اتنے لاغر ہو گئے تھے۔ کہ پہچاننا مشکل تھا۔ بولی، کیا تم بھی بیمار رہو؟ مجھ سے بھی زیادہ گھل گئے ہو۔؟

بپن نے بے دلی سے کہا:۔ اونہہ، زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ کہ زندہ رہنے کی فکر کروں۔

آشا۔ زندہ رہنے کی فکر نہ کرنے سے بھی کوئی اتنا دبلا نہیں ہو جاتا۔ تم اپنی کوئی دوا کیوں نہیں کرتے۔؟

یہ کہہ کر اس نے بپن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیا۔ بپن نے ہاتھ چھڑا لینے کی کوشش نہ کی۔ ان کا مزاج آج بہت نرم ہو گیا تھا۔ غصہ یا وحشت یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آشا کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

بپن چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے:۔ میری دوا اب موت کرے گی۔ میں تمہیں جلانے کے لئے نہیں کہتا۔ ایشور جانتا ہے میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ مگر اب میں زیادہ نہ جیوں گا۔ مجھے کسی خوفناک بیماری کے آثار نظر آتے ہیں

ہیں۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ کہ میں تمہاری کچھ خدمت نہ کرسکا۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ غشی سی آجاتی ہے۔

یہ کہتے کہتے وہ یکایک کانپ اُٹھے۔ سارے جسم میں رعشہ آگیا۔ غش کھا کر چارپائی پر گر پڑے۔ اور ہاتھ پاؤں ٹپکنے لگے۔ اعضا میں تشنج ہونے لگا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ جسم پسینہ سے تر ہوگیا۔

آشا کی بیماری غائب ہوگئی۔ وہ مہینوں تک بستر نہ چھوڑ سکتی تھی۔ پر اس وقت اُس کے نحیف اعضا میں ایک برقی قوت دوڑ گئی۔ اُس نے تیزی سے اُٹھ کر پتی کو سنبھالا اور ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ گھر بھر میں ہلچل پڑ گئی۔ باہر خبر ہوئی۔ دوستوں نے دوڑ کر ڈاکٹر کو بلایا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ پتی نے آنکھیں نہ کھولیں۔ شام ہوتے ہوتے اُن کا منہ ٹیڑھا ہوگیا۔ اور جسم کا بایاں حصہ بے جان ہوگیا۔ ہلنا تو دُور رہا۔ منہ سے بات تک نکلنی مشکل ہوگئی۔ یہ غشی نہ تھی۔ فالج کا دورہ تھا۔

(۵)

فالج کے مریض کی تیمارداری آسان نہیں ہے۔ اُس پر آشا خود مہینوں سے بیمار تھی۔ لیکن اس مرض کے سامنے وہ اپنی بیماری بھول گئی۔ اُس کی بیماری جسمانی نہیں، روحانی تھی۔ روح کا جسم سے تعلق ہے۔ اس لئے جسم پر اُس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ دو ہفتہ تک پتی کی حالت بہت نازک رہی۔ زندگی اور موت میں برابر کشمکش ہوتی رہی۔ آشا دن کے دن اور رات کی رات ان کی خدمت میں لگی رہتی۔ وقت پر دوا پلانا۔ ان کے ذرا ذرا اشاروں کو سمجھنا۔ اور کھانے پینے کے متعلق ڈاکٹر کی حرف بحرف تعمیل کرنا اُسی کا کام تھا۔ اپنا سر

:ردسے پھٹا کرتا۔ بخار سے جسم پھنکا جاتا۔ پر اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔

آخر بپن کی حالت کچھ سنبھلی۔ اُن کا بایاں پیر تو مفلوج ہو گیا۔ چہرہ کی کجی بھی بدستور قائم تھی۔ پر توتلی زبان میں کچھ بولنے لگے تھے۔ ان کا مردانہ حُسن خاک میں مل گیا تھا۔ چہرہ اتنا ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی ربڑ کے کھلونے کو کھینچ کر بڑھا دے۔ بیٹری کی مدد سے ذرا دیر کے لئے بیٹھ یا کھڑے تو ہو جاتے تھے۔ لیکن چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی۔

ایک دن لیٹے لیٹے انہیں کیا جانے کیا خیال آیا۔ آئینہ لے کر اپنا مُنہ دیکھنے لگے۔ ایسی مکروہ صورت انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ خود ڈر گئے۔ غمناک لہجہ میں بولے:۔

"آشا۔۔! بھگوان نے مجھے غرور کی سزا دیدی۔ یہ اُسی بدسلوکی کا بدلہ ہے۔ جو میں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ اب اگر میری طرف دیکھ کر تم نفرت سے مُنہ پھیر لو تو مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تم مجھے اس کمینہ پن ...."

آشا نے اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں تو آپ کو اب بھی اُسی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ مجھے تو آپ میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔

بپن۔ واہ! بندر کا سا منہ نکل آیا ہے۔ تم کہتی ہو کوئی فرق ہی نہیں۔ میں اب کبھی باہر نہ نکلوں گا۔ ایشور نے مجھے وہی سزا دی جس کا میں مستحق تھا۔

(۶)

بہت علاج معالجہ کیا گیا۔ مگر بپن کا منہ نہ سیدھا ہوا۔ ہاں پیروں میں اتنی طاقت آگئی کہ اب وہ چلنے پھرنے لگے۔

آشا نے اُن کی بیماری میں کچھ منتیں مانی تھیں ۔ آج وہی تقریب تھی ۔ محلہ کی عورتیں جمع تھیں ۔ گانا بجانا ہو رہا تھا ۔ ایک سہیلی نے پوچھا ۔ کیوں آشا ایک بات پوچھوں بُرا تو نہ مانوگی ۔ اب تو تمہیں اُن کا منہ ذرا بھی اچھا نہ لگتا ہوگا ۔

آشا نے متین انداز سے کہا ۔ مجھے تو پہلے سے کہیں اچھا لگتا ہے ۔

"چلو باتیں بناتی ہو" !

"نہیں بہن ! سچ کہتی ہوں ۔ صورت کے بدلے مجھے اُن کا دل مل گیا ۔ جو صورت سے کہیں قیمتی ہے ۔"

بپن اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ کئی دوست جمع تھے ۔ تاش ہو رہا تھا ۔

کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو آنگن میں کھلتی تھی ۔ ایک دوست نے اُسے چپکے سے کھولدیا اور جھانک کر بولے ۔ آج تو تمہارے یہاں پریوں کا اچھا جمگھٹا ہو رہا ہے ۔

بپن ۔ بند کردو ، کوئی دیکھ لے گا ۔

"ذرا ٹھہرو بھئی ۔ دیکھنے دو کیسی اچھی اچھی صورتیں ہیں ۔ تمہیں ان سبھوں میں کون سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے ؟"

بپن نے اُڑتی ہوئی نظروں سے آنگن کی طرف دیکھ کر کہا ۔ وہی جو تھال میں پھول رکھ رہی ہے ۔

"واہ ری آپ کی نگاہ ! سُبحان اللہ ! کیا صورت کے ساتھ تمہاری نگاہ بھی بدل گئی ۔ مجھے تو وہ سب سے بدصورت معلوم ہوتی ہے ۔

"اس لئے کہ تم اُس کی صرف ظاہری صورت دیکھ رہے ہو۔ اور میں اُس کا باطن دیکھ رہا ہوں۔"

" اچھا ۔۔! تو یہی جناب کی اہلیہ ہیں۔"

"جی ' ہاں ۔۔! یہ وہی دیوی ہے۔ جس پر میں ہزاروں پریوں کو قربان کرسکتا ہوں۔"

حسرت

(۱)

رات بھگت مال پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ کیسے کیسے عارف کامل تھے۔ جن کے لئے خدا کی بندگی ہی سب کچھ تھی۔ جو اسی میں محو رہتے تھے۔ ایسی معرفت بڑے ریاض سے نصیب آتی ہے۔ کیا میں وہ ریاض نہیں کرسکتی؟ اس زندگی میں میرے لئے اور کیا ہے۔؟ جسے زیوروں سے اُلفت ہو وہ جانے۔ یہاں تو انہیں دیکھ کر آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ جو زر و مال پر جان دیتا ہو وہ جانے۔ یہاں تو اس کے ذکر ہی سے بخار سا چڑھ جاتا ہے۔ کل پگلی سوشیلا نے کتنے اُمنگوں سے میرا سنگار کیا تھا۔ کتنی محبت سے میرے بالوں میں پھول گونتھے تھے۔ کتنا منع کرتی رہی۔ نہ مانی۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ جتنی دیر اُس کے ساتھ ہنسی تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ دیر تک روئی۔ دُنیا میں ایسا بھی کوئی آدمی ہے جو اپنی بیوی کی آرائش اور سنگار دیکھ کر سر سے پاؤں تک جل اُٹھے! کون ایسی عورت ہے۔ جو اپنے شوہر کے منہ سے یہ الفاظ سُنے "تم میری عاقبت بگاڑوگی۔ اور کچھ نہیں۔ تمہارے رنگ ڈھنگ کہے دیتے ہیں"۔ اور اُس کا دل زہر کھا لینے کو نہ چاہے۔ مگر دُنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔ میں نیچے

چلی گئی۔ اور بھگت مال پڑھنے لگی۔ اب کرشن ہی کی سیوا کروں گی۔ انہیں کو اپنا سنگار دکھاؤں گی۔ وہ تو دیکھ کر نہ جلیں گے۔ وہ تو میرے دل کا حال جانتے ہیں۔!

(۲)

ایشور! میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں، تم علیم ہو! میرے دل کا حال جانتے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ اُن کے اشارہ پر چلوں۔ انہیں میرے کسی فعل سے میرے کسی برتاؤ سے شکایت نہ ہو۔ وہ بے قصور ہیں۔ میرے ماں باپ کی بھی کوئی خطا نہیں۔ میری تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہوا لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں انہیں گھر میں آتے دیکھتی ہوں تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ چہرہ پر مُردنی سی چھا جاتی ہے۔ دل میں ایک گرمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاید دشمن کو دیکھ کر بھی کسی کے دل میں اتنی تپش نہ ہوتی ہوگی۔ وہ دو ایک دن کے لئے کہیں چلے جاتے ہیں۔ تو دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھ جاتا ہے ہنستی بھی ہوں، بولتی بھی ہوں۔ زندگی میں کچھ مزہ آنے لگتا ہے لیکن اُن کے آنے کی خبر پاتے ہی پھر وہی مُردنی، وہی حسرت، وہی تپش! دل کی حالت ایسی کیوں ہے؟ کہہ نہیں سکتی! مجھے تو ایسا گمان ہوتا ہے۔ کہ شاید زندگی سابق میں میرے اور ان کے درمیان قلبی منافرت تھی۔ اُسی منافرت کا انتقام لینے کے لئے انہوں نے مجھ سے شادی کی ہے۔ ہمارے دلوں پر وہی دیرینہ جذبات غالب ہیں۔ نہیں تو وہ مجھے دیکھ دیکھ کر کیوں جلتے۔ اور میں ان کی صورت سے کیوں بیزار رہتی۔؟ شادی کا تو یہ منشا نہیں ہوا کرتا۔ میں اپنے گھر اس سے کہیں خوش تھی۔ شاید میں اپنے گھر زندگی بھر آرام سے رہتی۔ مگر اس رواج کا بُرا ہو۔ جو لڑکیوں کو کسی نہ کسی مرد کے گلے باندھ دینا لازمی سمجھتا ہے۔

اُسے کیا خبر کہ کتنی بدنصیب عورتیں اس کے نام کو رو رہی ہیں۔ ارمانوں اور تمناؤں سے بھرے ہوئے کتنے دل اُس کے بیرحم پیروں تلے روندے جا رہے ہیں۔ عورت کے لئے اُس کا شوہر کتنے شیریں تخیلات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ مرد میں جو کچھ جامد ہے، مستحسن ہے۔ قابلِ ستائش ہے۔ اُس کی زندہ تصویر اس لفظ کی یاد آتے ہی اُس کی نظروں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے لیکن میرے لئے یہ لفظ کیا ہے۔؟ جگر کی ایک خلش، پہلو میں چبھنے والی ایک پھانس، آنکھوں میں کھٹکنے والی کرکری، دل کو تڑپانے والا کلمہ سخت۔ سوشیلا کو ہمیشہ بشاش دیکھتی ہوں۔ ہمیشہ شگفتہ۔ وہ کبھی اپنی عُسرت کا گلہ نہیں کرتی۔ گہنے نہیں ہیں۔ کپڑے نہیں ہیں۔ بھاڑے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے۔ اپنے ہاتھوں گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ پھر بھی اس کے ماتھے پر کبھی میل نہیں دیکھتی۔ اگر اپنے بس کی بات ہوتی تو آج اپنی دولت کو اُس کے افلاس سے بدل لیتی۔ اپنے پیارے شوہر کو مسکراتے ہوئے گھر میں آتے دیکھ کر اُس کی ساری فکر، ساری بے دلی، کافور ہو جاتی ہے۔ سینہ میں پھریریاں سی اُڑنے لگتی ہیں۔ اُن کی ایک ہم آغوشی میں وہ کیفیت ہے۔ جس پر تینوں لوک کی دولت کو قربان کر دوں۔!

(۳)

آج مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا۔ آخر تم نے مجھ سے کس لئے شادی کی تھی۔؟ یہ سوال مہینوں سے میرے دل میں تڑپ رہا تھا۔ پر ضبط کرتی چلی آتی تھی۔ آج پیالہ لبریز ہو گیا۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔ جیسے کسی نے اُن کی پگڑی اُتار لی ہو۔ کھسیں نکال کر بولے "گھر سنبھالنے کے لئے، گرہستی کا بوجھ اٹھانے کے لئے۔ اور نہیں کیا عیش اڑانے کے لئے۔ گھرنی کے

بغیر یہ گھر آپ کو بھوت کا ڈیرا سا معلوم ہوتا تھا۔ نوکر چاکر گھر کی چیزیں غائب کر دیتے تھے۔ جو چیز جہاں رہتی تھی۔ وہیں پڑی رہ جاتی تھی۔ کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ تو اب معلوم ہوا کہ میں اس گھر کی حفاظت کرنے کے لئے لائی گئی ہوں۔ مجھے اس گھر کی چوکیداری کرنی چاہیئے اور اپنی قسمت کو سراہنا چاہیئے۔ کہ یہ ساری جائداد میری ہے۔ خاص چیز دولت ہے۔ میں تو محض خزانہ کا سانپ ہوں۔ ایسے گھر میں آج ہی آگ لگ جائے۔ سب کچھ جل کر خاک سیاہ ہو جائے۔ اب تک تو میں تقاضائے بشری سے یہاں کی نگرانی کرتی تھی۔ اتنی تو نہیں جتنی وہ چاہتے ہیں۔ پر کچھ نہ کچھ ضرور کرتی تھی۔ لیکن اب کسی چیز کو چھونے کی قسم کھاتی ہوں۔ یہ میں جانتی ہوں کوئی آدمی گھر کی حفاظت کے لئے شادی نہیں کرتا۔ اور ان حضرت نے مجھے چڑھانے کے لئے یہ بات کہی۔ لیکن سوشیلا ٹھیک کہتی ہے۔ عورت کے بغیر انہیں گھر سُونا سُونا لگتا ہوگا۔ جیسے پنجرے سے چڑیا اڑ گئی ہو یہ ہے ہم لوگوں کی خوش نصیبی۔ !

(۴)

معلوم نہیں مجھ پر اتنا شبہ کیوں ہوتا ہے۔ جب سے تقدیر اس گھر میں لائی ہے۔ انہیں برابر اپنی طرف شبہ آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پاتی ہوں۔ اس کی وجہ؟ ذرا بال سنوارے اور اُن کے تیوروں پر بل پڑے۔ ذرا گھر کی کے سامنے کھڑی ہوئی اور انہیں بخار چڑھا۔ کہیں آتی نہیں، کہیں جاتی نہیں۔ کسی سے بولتی نہیں۔ پھر بھی اتنا شبہ۔ یہ ذلت اب نہیں سہی جاتی۔ مجھے یہ اتنی چھچھوری سمجھتے ہیں! سوشیلا ہاٹ بازار بھی جاتی ہے۔ میلے ٹھیلے بھی دیکھتی ہے۔ باغ باغیچوں میں بھی گھومتی ہے۔ اس کا شوہر خوش ہوتا ہے۔ یہاں بدگمانی کی جاتی ہے۔ شاید یہ حضرت سمجھتے ہیں۔ کہ میں پنجرے سے نکل بھاگنا چاہتی

ریہیم چا

ہوں۔ اپنے اختیار کے باہر کوئی کام کر بیٹھنے سے ہمارے دل کی یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ فقیر مسند شاہی پر بیٹھ کر کبھی چین کی نیند نہیں سو سکتا۔ اُسے ذرد ذرا سے بھی بیوفائی کی بو آئے گی۔ میں سمجھتی ہوں جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کا یہی حال ہوتا ہے۔

آج سوشیلا کے اصرار سے میں ٹھاکر جی کی جھانکی دیکھنے جا رہی تھی۔ اب یہ معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ کہ پھوہڑ بہو بن کر باہر نکلنا اپنی ہنسی اُڑانا ہے۔ لیکن آپ اُسی وقت نہ جانے کدھر سے ٹپک پڑے۔ اور میری طرف سخت نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ کہاں کی تیاری ہے۔؟

میں نے کہدیا۔ ٹھاکر جی کی جھانکی دیکھنے جا رہی ہوں۔ یہ سنتے ہی بتوریاں بدل کر بولے۔ تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو عورت اپنے شوہر کی خدمت نہیں کر سکتی۔ اُسے دیوتاؤں کے درشن سے ثواب کے بدلے عذاب ہوتا ہے۔ مجھ سے اُڑنے چلی ہے۔! کل کی چھوکری! میں عورتوں کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔

ایسا غصہ آیا کہ بس اب کیا کہوں۔ اسی وقت کپڑے اُتار ڈالے۔ اور ٹھان لی۔ کہ اب کبھی درشن کرنے نہ جاؤں گی۔ اس بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہے۔ ان کی بدگمانی کا جواب تو یہی تھا کہ اسی وقت گھر سے چل کھڑی ہوتی۔ پھر دیکھتی یہ میرا کیا کر لیتے۔ مگر صبر عورت کی خمیر ہے۔

انہیں میری دل گرفتگی اور انقباض پر تعجب ہوتا ہے۔ شاید مجھے دل میں احسان فراموش سمجھتے ہیں۔ اتنی کثیر جائداد اور اتنی دولت دیکھ کر مجھے پھولا نہ سمانا چاہیئے تھا۔ آٹھوں پہر ان کا جس گاتے رہنا چاہیئے تھا۔ میں یہ تو کرتی نہیں۔ اُلٹے اور منہ لٹکائے رہتی ہوں۔ ہے یہ تعجب کی بات یا نہیں۔ کبھی

کبھی مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ یہ کیا جانیں کہ عورت کی زندگی میں کوئی ایسی بھی چیز ہے۔ جسے کھو کر اُس کی نظروں میں جنت بھی دوزخ ہو جاتی ہے۔

(۵)

تین دن سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، بچنے کی کوئی امید نہیں۔ گو نیا ہو گیا ہے۔ پر مجھے نہ جانے کیوں مطلق غم نہیں ہے۔ میں اتنی سنگدل کبھی نہ تھی۔ میرے دل کا درد نہ جانے کہاں چلا گیا۔ کسی بیمار کو دیکھ کر میرا دل رقت سے پگھل جاتا تھا۔ میں کسی کا رونا نہیں سُن سکتی تھی۔ وہی میں ہوں۔ کہ آج تین دن سے اُنہیں بغل کے کمرے میں پڑے کراہتے سنتی ہوں۔ اور ایک بار بھی دیکھنے نہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو کا ذکر ہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ان سے میرا کوئی ناتا نہیں۔ مجھے کوئی بے وفا سمجھے۔ دغا شعار سمجھے، بے عصمت سمجھے، پر مجھے تو یہ کہنے میں ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ ان کی بیماری سے مجھے حاسدانہ مسرت ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ میں اسے شادی کے پاکیزہ نام سے موسوم نہ کروں گی۔ یہ قید ہی ہے۔ میں اتنی فراخ دل نہیں ہوں کہ جس نے مجھے قید میں ڈال رکھا ہو اُس کی پُوجا کروں۔ جو مجھے لات مارے اس کے پیروں کو چوموں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے ایشور انہیں میرے ساتھ یہ بے رحمی کرنے کی سزا دے رہے ہیں۔ میں بے حجاب ہو کر کہتی ہوں کہ میری ان کے ساتھ شادی نہیں ہوئی۔ عورت کسی کے گلے باندھ دیئے جانے سے ہی بیاہتا نہیں ہو جاتی وہی تعلق شادی کہلانے کا مستحق ہے۔ جس میں کم سے کم ایکبار تو دل نشہ محبت سے مخمور ہو جائے۔ سنتی ہوں۔ حضرت اپنے کمرے میں پڑے پڑے مجھے کوسا کرتے ہیں۔ اپنی بیماری کا سارا بخار مجھ پر نکالتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کی پروا نہیں۔ جس کا جی چاہے یہ جائداد لے جائے۔ دولت لے جائے...... مجھے

کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

(۶)

آج تین مہینے ہوئے ہیں بیوہ ہو گئی۔ کم سے کم لوگ یہی کہتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہے سمجھے، پر میں تو اپنے کو جو کچھ سمجھتی ہوں وہ سمجھتی ہوں۔ میں نے چوڑیاں نہیں توڑیں۔ کیوں توڑ دوں۔؟ مانگ میں سیندور پہلے کبھی نہ ڈالتی تھی۔ اب بھی نہیں ڈالتی۔ بوڑھے بابا کی تکفین اُن کے سپوت بیٹے نے کی۔ میں پاس تک نہ پھٹکی۔ گھر میں لوگ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کوئی میری مانگ چوٹی دیکھ کر ناک سکوڑتا ہے۔ کوئی میرے زیوروں کو دیکھ کر آنکھیں مٹکاتا ہے۔ میرے ہونٹوں کی سُرخی پر کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ انہیں چڑانے کے لئے میں اور بھی خوشرنگ ساڑیاں پہنتی ہوں۔ اور بھی بنتی سنورتی ہوں۔ مجھے غم کیوں ہو۔ میں تو قید سے چھوٹ گئی۔ ادھر کئی دن تک سوشیلا کے گھر گئی۔ چھوٹا سا مکان ہے۔ نہ کوئی آرائش۔ نہ سجاوٹ۔ نہ کوئی فرنیچر۔ چارپائیاں تک نہیں۔ پر سوشیلا کتنے چین سے رہتی ہے۔ اس کی زندگی پر کیوں نہ رشک آئے۔ جب دیکھو آنکھیں مسکراتی رہتی ہیں۔ ہونٹوں پر ہلکا تبسم کھیلتا رہتا ہے۔ باتوں سے پریم کے پھول جھڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خوشی، چاہے کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہو۔ دل پر ہمیشہ کے لئے ایک نقش چھوڑ جاتی ہے۔ اُسے کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کی یاد آخر تک رُوح کو معطر کرتی رہتی ہے۔ دل کے تاروں کو آخر تک مرتعش رکھتی ہے۔

ایک دن میں نے سوشیلا سے کہا۔ اگر تیرا شوہر تجھے چھوڑ کر پردیس چلا جائے تو تو شاید روتے روتے مر جائے۔

سوشیلا نے متین انداز سے جواب دیا۔ نہیں بہن! مروں گی نہیں۔

ان کی یاد میری رُوح کو تازہ رکھے گی۔ چاہے انہیں برسوں لگ جائیں۔
میں بھی ویسی ہی محبت کی پیاسی ہوں۔ اسی خلش، اسی تڑپ کے لئے میں بھی بے چین ہوں۔ میں بھی ایسی ہی کوئی چوٹ چاہتی ہوں۔ جس سے دل کے تار ہمیشہ بجتے رہیں۔

(۷)

رات روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ نہ جانے کیوں دل بھر بھر آتا تھا اپنی زندگی ایک کف دست ریگستان سی، بے برگ و بار معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں بگولوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہیں ہریالی نہیں۔ کہیں تازگی نہیں۔ گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ جی ایسا بے چین ہو رہا تھا کہ کہیں اُڑ جاؤں۔ آج کل سیر تماشے کی جانب بھی دل راغب نہیں ہوتا۔ کیا چاہتی ہوں۔ میں خود نہیں جانتی۔ لیکن میں جو نہیں جانتی وہ میرے ایک ایک عضو کو معلوم ہے۔ میں اپنے تخیلات کی زندہ تصویر ہوں۔ میرا ایک ایک عضو میرے دردِ نہاں کا آئینہ بنا ہوا ہے۔

(۸)

میرے دل کا اضطراب اُس حد تک پہنچ گیا ہے۔ جب آدمی کو بدنامی کی نہ شرم رہتی ہے اور نہ خوف۔ جن حریص ماں باپ نے مجھے کنوئیں میں ڈھکیلا۔ جس بے رحم نے میری مانگ میں سیندور ڈالنے کا سوانگ کیا۔ اُن کے لئے میرے دل سے بار بار بد دُعا نکلتی ہے۔ میں انہیں شرمندہ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے منہ میں کالکھ لگا کر ان کا منہ کالا کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی جان دے کر انہیں قتل کرانا چاہتی ہوں۔ میری بیکسی غائب ہو گئی ہے۔ میرے دل میں انتقام کا شعلہ دہک رہا ہے۔
گھر کے سب آدمی سو رہے تھے۔ میں چپکے سے نیچے اُتری، دروازہ

کھولا اور گھر سے نکلی جیسے کوئی آدمی گرمی سے بے تاب ہو کر گھر سے نکلے۔ اور کسی کھلی ہوئی جگہ کی طرف دوڑے۔ اُس مکان میں میرا دم گھُٹ رہا تھا۔

سڑک پر سناٹا تھا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ دفعتًا ایک بڑھیا نظر آئی۔ میں ڈری کہیں چڑیل نہ ہو۔ اُس نے میرے قریب آکر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور بولی:۔

"کس کی راہ دیکھ رہی ہو بیٹی"؟

میں نے چڑ کر کہا:۔ "موت کی"۔

بڑھیا۔ تمہارے نصیب میں تو ابھی زندگی کے بڑے سکھ لکھے ہیں۔ اندھیری رات گزر گئی۔ صبح کا اُجالا نظر آ رہا ہے۔

میں نے کہا:۔ "اندھیرے میں بھی تمہاری آنکھیں اتنی تیز ہیں۔ کہ نوشتہ تقدیر پڑھ لیتی ہو"؟

بڑھیا۔ آنکھوں سے نہیں بیٹا! عقل سے پڑھتی ہوں۔ دھوپ میں چونڈے نہیں سفید کئے ہیں۔ تمہارے بُرے دن گئے۔ اور اچھے دن آ رہے ہیں ہنسو مت بیٹا، یہی کام کرتے اتنی عمر گذر گئی۔

اسی بڑھیا کی بدولت جو عورتیں ندی میں ڈوبنے جا رہی تھیں۔ وہ آج سکھ سے سیج پر سو رہی ہیں۔ جو زہر کا پیالہ پینے کو تیار تھیں، وہ آج دودھ کی کلیاں کر رہی ہیں۔

اسی لئے اتنی رات گئے نکلتی ہوں کہ اپنے ہاتھوں کسی بدنصیب کا بھلا ہو جائے تو کر دوں۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے صرف یہی آرزو ہے کہ اپنے ہاتھوں کسی کی بھلائی ہو جائے۔ جنہیں دولت کی آرزو

ہے۔ انہیں دولت، جنہیں اولاد کی آرزو ہے، انھیں اولاد۔ بس اور کیا کہوں۔ وہ منتر بتادیتی ہوں کہ ساری تمنائیں پوری ہو جائیں۔

میں نے کہا:۔ مجھے نہ دولت کی آرزو ہے۔ نہ اولاد کی۔ میری تمنا تمہارے بس کی بات نہیں۔

بڑھیا ہنسی، بیٹی جو تم چاہتی ہو وہ میں جانتی ہوں۔ تم وہ چیز چاہتی ہو۔ جو دنیا میں نایاب ہے۔ جو دولت و ثروت کو حقیر سمجھتی ہے۔ اور روکھی روٹیوں میں مگن رہتی ہے۔ جو کبھی اتنی مضبوط ہے۔ کہ ساری دنیا کی طاقت اُسے جیت نہیں سکتی۔ اور کبھی اتنی کمزور کہ ایک لفظ اُسے جڑ سے کھود سکتا ہے۔ تم محبت کی پیاسی ہو۔ میں تمہیں اس کشتی پر بٹھا سکتی ہوں۔ جو تمہیں منزل مقصود پر پہنچا دے۔

میں نے اشتیاق سے کہا:۔ تمہارا گھر کہاں ہے اماں،؟

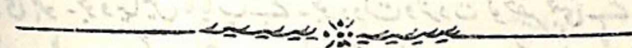
بڑھیا۔ بہت نزدیک ہے بیٹی! تم چلو تو میں اپنی آنکھوں پر بٹھا کر لے چلوں۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ امید کی دیوی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

اس کے بعد کیا ہوا اِس کا ذکر نہ کروں گی۔ اس بڑھیا نے مجھے دغا دی۔

میں سوشیلا بننا چاہتی تھی۔ وہ تقدیر میں نہ تھا۔ لیکن اس گری ہوئی حالت میں بھی، میں اُس سے کہیں زیادہ خوش ہوں جتنی اس وقت تھی۔ جب میں سہاگن تھی۔ ہنستی تو نہیں لیکن روتی بھی نہیں۔ ہاں ایک حسرت ہمیشہ دل پر چھائی ہوئی رہتی ہے۔

سوشیلا کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ کتنی پاکیزہ تھی اس کی زندگی! اس مسرت کی ایک چٹکی میرے لئے اکسیر ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ چٹکی کون دے گا۔ مجھے تو اب ایسا کوئی دیوتا یا دلی نہیں دکھائی دیتا۔ سوشیلا کو دیکھ کر اب شاید میرا سر خود بخود جھک جائے گا۔



چکمہ

(۱)

پنڈت بالک رام شاستری کی بیوی مایا کو بہت دنوں سے ایک ہار کی تمنا تھی۔ اور وہ سیکڑوں ہی بار پنڈت جی سے اُس کا تقاضا کر چکی تھی۔ مگر پنڈت جی ہمیشہ حیلے حوالے کرتے رہتے تھے۔ یہ تو صاف صاف نہ کہتے میرے پاس روپے نہیں ہیں ...... اس سے وقارِ شوہری پر حرف آتا تھا...... دلیلوں کی پناہ لیا کرتے تھے۔ زیور ایک روگ ہے۔ ایک تو دھات خالص نہیں ملتی۔ اُس پر سُنار روپئے کے آٹھ آنے کر دیتا ہے۔ اور سب سے بڑی علت یہ ہے کہ گھر میں زیور رکھنا چوروں کو بیعانہ دینا ہے۔ لمحہ بھر کی آرائش کے لئے اتنا درد سر خریدنا جاہلوں کا کام ہے۔ بیچاری مایا منطق نہ پڑھی ہوئی تھی۔ ان اعتراضوں کے سامنے لاجواب ہو جاتی۔ پڑوسنوں کے زیور دیکھ دیکھ کر اس کا جی للچایا کرتا تھا۔ مگر اپنا قصہ غم کس سے کہے؟ اگر پنڈت جی ذرا جفاکش ہوتے تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ پر وہ آلسی آدمی تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ کھانے اور سونے میں صرف کرتے تھے۔ بیوی کے طعنے منظور تھے۔ اقرباء سے آنکھیں چُرانی منظور تھیں۔ مگر نیند کی مقداریں

لمی غیر ممکن تھی۔

(۲)

ایک دن پنڈت جی پاٹھ شالا سے آئے تو دیکھا کہ مایا کے گلے میں ایک ہار براج رہا ہے۔ ہار کی چمک سے اس کے چہرہ پر ایک عجیب رونق آگئی تھی۔ پوچھا یہ ہار کس کا ہے۔؟

مایا بولی:۔ پڑوس میں جو بابو جی رہتے ہیں۔ اُنہیں کی عورت کا ہے۔ آج اُن سے ملنے گئی تھی۔ یہ ہار دیکھا تو بہت پسند آیا۔ تمہیں دکھانے کے لئے پہن کر چلی آئی۔ بس ایسا ہی ایک ہار مجھے بنوا دو۔

پنڈت۔ غیر کی چیز ناحق مانگ لائیں۔ کہیں گم ہو جائے تو تاوان تو دینا ہی پڑے۔ بدنامی اوپر سے ہو۔

مایا۔ میں تو ایسا ہی ہار لوں گی۔ بیس تولے کا ہے۔

پنڈت۔ پھر وہی ضد!

مایا۔ جب سبھی پہنتی ہیں تو میں ہی کیوں نہ پہنوں۔

پنڈت۔ سب کنوئیں میں گر پڑیں تو تم بھی گر پڑو گی۔؟ اس ہار کے بنوانے میں ۶۰۰ روپئے لگیں گے۔ اگر ایک روپیہ سیکڑہ بھی سُود رکھ لیا جائے۔ تو پانچ سال میں ۶۰۰ کے ایک ہزار ہو جائیں گے لیکن پانچ برس میں ہار مشکل سے ۳۰۰ کا رہ جائے گا۔ اتنا بڑا نقصان اُٹھا کر ہار پہننے میں کیا مزہ ہے۔ یہ ہار واپس کر دو۔ کھانا کھاؤ اور آرام سے لیٹو۔

یہ کہتے ہوئے پنڈت جی باہر چلے گئے۔

(۳)

رات کو یکایک مایا نے شور مچا کر کہا.... چور! چور! گھر میں چور۔

مجھے گھسیٹے لئے جاتا ہے۔

پنڈت جی ہک بکا کر اُٹھے اور بولے:۔ کہاں؟ کہاں؟ دوڑو.....!
دوڑو! چور..... چور.....!

مایا۔ میری کوٹھری میں گیا ہے۔ میں نے اُس کی پرچھائیں دیکھی۔

پنڈت۔ لالٹین لاؤ۔ ذرا میری لکڑی بھی اٹھا تی لانا۔

مایا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔

کئی آدمی باہر سے بولے:۔ کہاں ہے پنڈت جی؟ کوئی سیند پڑی
ہے کیا۔؟

مایا۔ نہیں سیند نہیں پڑی۔ کھپریل پر سے اُترے ہیں۔ میری نیند
کھلی تو کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ہائے رام! یہ تو ہار ہی لے گیا۔ پہنے
پہنے سو گئی تھی۔ موئے نے گردن سے نکال لیا! ہائے رام۔!

پنڈت۔ تم نے ہار اُتار کیوں نہ دیا تھا۔؟

مایا۔ میں کیا جانتی تھی کہ آج ہی یہ غضب پڑے گا۔! ہائے رام!
اب کیسے منہ دکھاؤں گی

پنڈت۔ اب ہائے ہائے کرنے سے کیا ہوگا۔؟ اپنی تقدیر کو
روؤ۔ اسی لئے کہا کرتا تھا۔ کہ سب دن برابر نہیں جاتے۔ نہ جانے کب کیا
ہو جائے۔ اب آئی سمجھ میں میری بات؟ یا اب بھی شبہ ہے۔ دیکھ لو اور کچھ
تو نہیں لے گیا۔؟

پڑوسی لالٹین لے کر آپہنچے۔ گھر کا کونا کونا دیکھا۔ کڑیاں دیکھیں۔
اگواڑا پچھواڑا دیکھا۔ جائے ضرور میں جھانکا۔ مگر کہیں چور کا پتہ نہ تھا۔

ایک پڑوسی۔ کسی گھر کے بھیدیئے کا کام ہے۔!

دوسرا ۔ بنا گھر کے بھیدیئے کے کبھی چوری ہوتی ہی نہیں ۔ اور کچھ تو نہیں لے گیا ۔؟

مایا ۔ اور کچھ تو نہیں لے گیا ۔ برتن سب پڑے ہوئے ہیں ۔ صندوق بھی بند ہے ۔ نگوڑے کو لے ہی جانا تھا تو میری چیز لے جاتا ۔ پرائی چیز ٹھہری ۔ اب کیا ہو گا بھگوان ۔؟

پنڈت ۔ گہنے کا مزہ مل گیا نہ ۔؟

مایا ۔ ہائے رام ! یہ اچھیں پڑا تھا ۔ اور تم جلے پر نمک چھڑکتے ہو ۔ اچھا گئے میرے گھر کا ایک ایک تنکا چن لیتے تو مجھے رنج نہ ہوتا ۔ ابھی بیچاری نے نیا ہار بنوایا تھا ۔

پنڈت ۔ خوب معلوم ہے بہن تو لے کا تھا ۔؟

مایا ۔ بیس ہی تو لے تو کہتی تھیں ۔

پنڈت ۔ بڑھیا بیٹھ گئی اور کیا ۔

مایا ۔ کہدوں گی گھر میں چوری ہو گئی ۔ کیا جان لیں گے ۔؟ اب اُن کے لئے کوئی چوری کرنے تھوڑے ہی جائے گا ۔

پنڈت ۔ تمہارے گھر سے چیز گئی تمہیں دینی پڑے گی ۔ انہیں اس سے کیا مطلب کہ چور اُٹھا کر لے گئے یا تم نے رکھ لیا ۔ پتیائیں گی ہی نہیں ۔

مایا ۔ تو اتنے روپے کہاں سے آئیں گے ۔؟ ہانڈی بھر ہوتے ہوں گے ۔

پنڈت ۔ کہیں نہ کہیں سے تو آئیں گے ہی ۔ نہیں تو لاج کیسے رہے گی ۔ مگر تم نے کی بہت بڑی غلطی ۔

مایا ۔ بھگوان سے مانگے کی چیز بھی نہ دیکھی گئی ۔ میرے سر شیطان

سوار ہو تو پہنیں تو گھڑی بھر گلے میں ڈال لینے سے ایسا کونسا سکھ مل گیا۔ یہ ہول ہی اچھا گئی۔

پنڈت۔ اب پچھتانے اور اپنے کو کوسنے سے کیا فائدہ۔ چپ ہوکے بیٹھو۔ پڑوسن سے کہدینا گھبراؤ نہیں۔ تمہاری چیز جب تک لوٹا نہ دیں گے ہمیں چین نہ آئے گا۔

(۲)

پنڈت بالک رام کو اب شب و روز ہار کی فکر ستانے لگی۔ یوں اگر ٹال ٹال دیتے تو کوئی بات نہ تھی۔ پڑوسن کو صبر کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ برہمن سے تاوان کون لیتا۔ لیکن پنڈت جی برہمتی کی شان کو اتنے سستے داموں نہ بیچنا چاہتے تھے۔ ان کی آرام طلبی غائب ہوگئی۔ اور فکر زر میں منہمک ہوگئے۔

چھ مہینے تک انہوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کرلیا۔ پہلے پاٹھ شالے سے آکر آرام کرتے تھے۔ براہمنوں کے لئے آمدنی کے جو ایک سو ایک دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے وہ کسی کی طرف رُخ نہ کرتے تھے۔ پر اب پاٹ شالے سے آکر ایک جگہ بھاگوت کی کتھا کہنے جاتے۔ وہاں سے لوٹ کر گیارہ بجے رات تک بیٹھے زائچے، برس پھل، وغیرہ بنایا کرتے علی الصباح مندر میں درگا پاٹھ کرنے جاتے۔ مایا ان کی یہ مصروفیت دیکھ کر دل میں پچھتاتی کہ میں نے کہاں سے کہاں یہ جال چلی۔ کہیں بیمار پڑ جائیں۔ تو لینے کے دینے پڑیں۔ اُن کے جسم کو لاغر ہوتے دیکھ کر اُسے اب اُن کے صحت کی فکر ہونے لگی۔ اس طرح پانچ مہینے گزر گئے۔

ایک دن شام کو وہ چراغ بتی کرنے جارہی تھی۔ کہ پنڈت جی آئے۔

جیب سے ایک کیس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور بولے۔ لو آج تمہارے قرض سے سبکدوش ہو گیا۔

مایا نے کیس کھولا تو اس میں سونے کا ہار تھا۔ اُس کی چمک دمک، وضع قطع دیکھ کر اس کے دل میں گُدگُدی ہونے لگی۔ چہرہ پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی۔ خائف نظروں سے دیکھ کر بولی۔ خوش ہو کر دے رہے ہو یا ناراض ہو کر، ؟

پنڈت ۔ اس سے کیا مطلب۔ قرض تو چکانا ہی پڑے گا۔ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے۔

مایا ۔ یہ قرض نہیں ہے۔

'اور کیا ہے ؟ بدلا ہی'

'بدلا بھی نہیں ہے'

'پھر کیا ہے'

'تمہاری...... نشانی۔'

'تو کیا قرض ادا کرنے کے لئے دوسرا ہار بنوانا پڑے گا' ؟

'نہیں۔ جی! وہ ہار چوری نہیں گیا تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ شور مچایا تھا'

'سچ' !

'ہاں...... سچ کہتی ہوں'

'میری قسم' ؟

'تمہارے چرن چھو کر کہتی ہوں'

'تو تم نے مجھے چکمہ دیا' ؟

دہاں :-
اخیر کسی طرح تمہاری مراد تو بر آئی۔ مگر ایشور کے لئے پھر ایسا چکمہ نہ دینا۔

جنّت کی دیوی

(۱)

لیلا نے جس دن سُسرال میں قدم رکھا اُسی دن سے اس کا امتحان شروع ہوا۔ وہ سبھی کام جس کی اُس کے گھر تعریف ہوتی تھی۔ یہاں ممنوع تھے۔ اُسے بچپن سے تازہ ہوا پر جان دینا سکھلایا گیا تھا۔ یہاں منہ کھولنا بھی گناہ تھا۔ بچپن سے سکھایا گیا تھا کہ روشنی ہی زندگی ہے۔ یہاں روشنی ہوّا تھی۔ کمروں میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ روشنی اندر نہ آجائے گی! مجال کیا کہ بہو اپنی اندھیری کوٹھری کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے۔ یا کبھی چھت پر ٹہل سکے۔ ساس جی دنیا سر پر اُٹھا لیتیں۔ انہیں بکنے کا مرض تھا۔ دال میں ذرا سا نمک کا زیادہ ہونا۔ اُن کی زبان کو دن بھر مصروف رکھنے کے لئے کافی تھا۔ موٹی تازی خاتون تھیں چھینٹ کا گھیر دار لہنگا پہنے۔ پاندان بغل میں رکھے۔ گہنے سے لدی ہوئی۔ سارے دن بردے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ کیا مجال کہ گھر کے اندر ان کی مرضی کے خلاف ایک پتی بھی ہلے! بہو کی نئی نئی عادتیں دیکھ کر جلتی رہتی تھیں۔ اب کاہے کو آبرو رہے گی۔ نہ جانے اس کے دیس میں کون لوگ بستے ہیں! گہنے نہیں پہنتی۔ رنگین کپڑے نہیں بھاتے۔ یہ بھی کوئی اچھے لچھن ہیں۔ لیلا کے پیچھے سیتا سرن

پر بھی پھٹکار پڑتی ۔ تجھے چاندنی میں سونا اچھا لگتا ہے کیوں ؟ تو بھی اپنے کو مرد کہے گا ۔؟ وہ مرد کیا کہ عورت اس کے کہنے میں نہ رہے ! دن بھر گھر میں گھسا رہتا ہے ۔ منہ میں زبان نہیں ہے یا سمجھاتا کیوں نہیں ۔؟

سیتا سرن کہتا ۔ اماں جب کوئی میرے سمجھانے سے مانے تب تو ۔!

ماں ۔ مانے گی کیوں نہیں ۔ مرد کو چاہیئے کہ کڑی نگاہ سے دیکھے ۔ تو عورت کانپ اُٹھے ۔

سیتا سرن ۔ تم تو سمجھاتی ہی رہتی ہو ۔

ماں ۔ میری اُسے کیا پروا ۔ سمجھتی ہوگی ۔ بڑھیا چار دن میں مر جائیگی ۔ تب تو میں مالکن ہو ہی جاؤں گی ۔

سیتا سرن مسکرایا ۔ شاید اماں کا بس ہوتا تو وہ مرنے کے بعد بھی بہو کو مالکن نہ ہونے دیتیں ۔ مرتیں ہی کیوں ۔؟

گرمی کے دن تھے ۔ اور شام کا وقت ۔ باہر ہوا چلتی تھی ۔ اندر جسم پھنکا جاتا تھا ۔ لیلا اندر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی ۔ کہ سیتا سرن نے آکر کہا ۔ یہاں تو بڑی گرمی ہے ۔ باہر بیٹھو ۔

لیلا ۔ یہ گرمی اُن طعنوں سے ٹھنڈی ہے ۔ جو ابھی سننے پڑیں گے ۔

سیتا سرن ۔ آج اگر وہ بولیں تو میں بھی بگڑ جاؤں گا ۔

لیلا ۔ تب تو میرا گھر میں رہنا بھی مشکل ہو جائے گا ۔

سیتا سرن ۔ بلا سے ۔ الگ رہیں گے ۔

لیلا ۔ میں تو مر بھی جاؤں تو الگ ہونے کا نام نہ لوں ۔

سیتا سرن نے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا ۔ تمہیں اس گھر میں آکر بہت دکھ سہنا پڑا لیلا ۔ میں تمہارے لائق نہ تھا ۔ تم نے پہلے جنم

میں ضرور کوئی پاپ کیا تھا۔

لیلا نے شوہر کے ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے شرما کر کہا! یہاں نہ آتی تو تم کہاں ملتے۔؟

(۲)

پانچ سال گزر گئے۔ لیلا دو بچوں کی ماں ہو گئی۔ لڑکے کا نام جانکی سرن، لڑکی کا کامنی۔ دونوں بچے گھر کو گلزار کئے رہتے تھے۔ لڑکی دادا سے ملتی تھی۔ لڑکا دادی سے۔ دونوں شوخ اور شریر تھے۔ گالی دے بیٹھنا۔ منہ چڑا دینا۔ تو اُن کی معمولی حرکت تھی۔ دن بھر کھاتے۔ اور آئے دن بیمار پڑے رہتے لیلا نے خود تو سبھی آفتیں جھیل لی تھیں۔ لیکن لڑکوں کی عادت کا بگڑنا اسے بہت بُرا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی سنتا کون تھا۔ بچوں کی ماں ہو کر اب گھر میں اس کی کوئی ہستی ہی نہ تھی۔ جو کچھ تھے بچے تھے۔ اُسے کسی بچے کو ڈانٹنے کا مجاز نہ تھا۔ ساس پھاڑ کھاتی تھی۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کی صحت اب اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ زچہ خانہ میں اُسے وہ سبھی مظالم سہنے پڑے جو جہالت، رسم اور ضعیف الاعتقادی نے زچہ کی حفاظت کے لئے گھڑ رکھے ہیں۔ اس کال کوٹھری میں جہاں نہ ہوا کا گزر تھا۔ نہ روشنی کا، نہ صفائی کا۔ چاروں طرف عفونت، سیل اور گندگی بھری ہوئی تھی۔ اس کا نازک جسم گھل گیا۔ ایک بار جو کسر رہ گئی تھی۔ وہ دوسری بار پوری ہو گئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں دھنس گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا بدن میں خون ہی نہیں رہا۔ صورت ہی بدل گئی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ایک طرف آم پکے۔ دوسری طرف خربوزے۔ ان دونوں پھلوں کی ایسی اچھی فصل پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اب کی ان میں اتنی مٹھاس

نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔ کہ کتنا ہی کھاؤ جی نہ بھرے۔ منت سرن کے علاقہ سے خربوزے اور آم کے ٹوکرے بھرے چلے آتے تھے۔ سارا گھر خوب اُچھل اُچھل کھاتا تھا۔ بابو صاحب پُرانی ہڈی کے آدمی تھے۔ سویرے ایک سیکڑے آموں کا ناشتہ کرتے۔ پھر پنسیری بھر خربوزے چٹ کر جاتے۔ مالکن بھی اُن سے پیچھے رہنے والی نہ تھیں۔ ایک وقت کا کھانا بند کر دیا۔ اناج سڑنے والی چیز نہیں۔ آج نہیں کل خرچ ہو جائے گا۔ آم اور خربوزے تو ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ شُدنی تھی اور کیا۔ یونہی ہر سال دونوں چیزوں کی ریل پیل ہوتی تھی۔ پر کسی کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوتی تھی کبھی معدہ میں گرانی معلوم ہوئی تو ہڑ کی پھنکی مار لی۔ ایک دن منت سرن کے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ آپ نے اس کی پرواہ نہ کی۔ آم کھانے بیٹھ گئے سیکڑا پورا کر کے اُٹھے ہی تھے کہ قے ہوئی۔ گر پڑے۔ پھر تو تِل تِل پر قے اور دست ہونے لگے۔ ہیضہ ہو گیا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ پر اس کے آنے کے پہلے بابو صاحب چل بسے۔ لوگ لاش کو سپردِ خاک کر کے لوٹے تو مالکن کو بھی قے اور دست ہو رہے تھے۔ پھر دوڑ دھوپ شروع ہوئی لیکن سورج نکلتے نکلتے وہ بھی سدھار گئیں۔ میاں بیوی میں کبھی مفارقت نہ ہوئی تھی۔ سنسار سے بھی ساتھ ساتھ رخصت ہوئے۔ صبح کو شوہر۔ شام کو بیوی۔

لیکن مصیبت کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ تیسرے دن دونوں بچے دادا دادی کے لئے روتے روتے بیٹھک میں جا پہنچے۔ وہاں ایک آلے پر ایک خربوزہ کٹا ہوا پڑا تھا۔ دو تین قلمی آم بھی کٹے رکھے تھے۔ ان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ کاشی نے ایک تپائی پر چڑھ کر دونوں چیزیں اُتار لیں۔ اور دونوں نے مل کر کھائیں۔ شام ہوتے ہوتے دونوں کو ہیضہ ہو گیا۔ اور دونوں ماں باپ کو

رونا چھوڑ چل دیئے۔

تین دن پہلے جہاں چاروں طرف چہل پہل تھی وہاں اب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی کے رونے کی آواز بھی نہ سُنائی دیتی تھی۔ روتا بھی کون؟ لے دے کے کُل دو آدمی رہ گئے تھے۔ اور انہیں رونے کی بھی سُدھ نہ تھی۔

(۳)

لیلا کی صحت پہلے بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اب تو وہ اور بھی بے جان ہو گئی۔ بچوں ہی میں اُس کی جان بستی تھی۔ جب وہ ہی نہ رہے تو مرنا اور جینا برابر تھا۔ رات دن یہی منایا کرتی کہ بھگوان یہاں سے لے چلو لیکن بُلانے سے موت کب آتی ہے۔؟

سیتا سرن پہلے تو بہت رویا دھویا۔ یہاں تک کہ گھر چھوڑ کر بھاگا جاتا تھا لیکن جُوں جُوں دن گزرتے تھے۔ طبیعت سنبھلتی جاتی تھی۔ اولاد کا غم تو کچھ ماں ہی کو ہوتا ہے۔ پہلے ہی کی طرح دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق ہونے لگا۔ یاروں نے اور بھی چنگ پر چڑھا یا۔ سیر سپاٹے ہونے لگے۔ کہاں تو لیلا کو روتے دیکھ بیقرار ہو جاتا تھا۔ کہاں اب اُسے غمگین اور اُداس دیکھ کر جھنجھلا اُٹھتا۔ زندگی رونے ہی کے لئے تو نہیں ہے۔ ایشور نے لڑکے دیئے تھے۔ ایشور ہی نے چھین لئے۔ کیا لڑکوں کے پیچھے اپنی جان بھی دیدیں۔ لیلا اُس کے منہ سے یہ باتیں سنکر حیرت میں آجاتی۔ باپ کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔!

ہولی کے دن تھے۔ مردانے میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ احباب کی دعوت کے سامان کئے گئے تھے۔ اندر لیلا زمین پر پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ تیوہاروں کے دن اُسے رونے ہی کٹتے تھے۔ آج بچے ہوتے تو اچھے اچھے کپڑے

پہنے کیسے اُچھلتے پھرتے ! بچے ہی نہ رہے تو کہاں کی تیج اور کہاں کا تیوہار ۔
یکایک سیتنا سرن نے آکر کہا ۔ کیا دن بھر روتی ہی رہو گی ؟ ذرا کپڑے تو بدل ڈالو ۔ آدمی بن جاؤ ۔ یہ کیا گت بنا رکھی ہے ۔ !

لیلا نے کہا :۔ تم جاؤ اپنی محفل میں بیٹھو ۔ تمہیں میری کیا فکر پڑی ہے ۔

سیتنا سرن ۔ کیا دنیا میں اور کسی کے لڑکے نہیں مرتے ؟ تمہارے ہی سر یہ مصیبت پڑی ہے ۔ !

لیلا ۔ یہ بات کون نہیں جانتا ۔ اپنا اپنا دل ہی تو ہے ۔

سیتنا سرن ۔ میرے ساتھ بھی تو تمہارا کچھ فرض ہے ۔ ؟

لیلا نے تعجب سے شوہر کی طرف دیکھا ۔ گویا اس کا مطلب نہیں سمجھی ۔ پھر منہ پھیر کر رونے لگی ۔

سیتنا سرن ۔ میں اب اس نحوست کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں ۔ اگر تمہارا اپنے دل پر قابو نہیں ہے تو میرا بھی اپنے دل پر قابو نہیں ہے ۔ میں زندگی بھر ماتم نہیں منا سکتا ۔

لیلا ۔ تم راگ رنگ میں مگن رہتے ہو ۔ میں منع تو نہیں کرتی ۔ میں روتی ہوں تو کیوں نہیں رونے دیتے ۔ ؟

سیتنا سرن ۔ میرا گھر رونے کے لئے نہیں ہے ۔

لیلا ۔ اچھی بات ہے ۔ تمہارے گھر میں نہ روؤں گی ۔

(۴)

لیلا نے میکے کی تیاری شروع کی ۔ ماں باپ کیا ایک ٹکڑا روٹی نہ دیں گے ؟ لیکن ذرا ہی دیر میں اُس کا خیال پلٹ گیا ۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ اس وقت یہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں ۔ ان کے سر راگ رنگ کا بھوت سوار ہے ۔ ادھر

میں گئی۔ اُدھر یہ گھر مٹی میں ملا۔ مُفت خورے پیچھے پڑے ہی ہوئے ہیں۔
دو چار مہینہ میں وارا نیارا ہو جائے گا۔ اگر انہیں کوئی بیماری ہو جاتی۔ تو کیا
اس حالت میں انہیں چھوڑ کر میں چلی جاتی۔؟ کبھی نہیں۔ میں دل وجان سے
ان کی خدمت کرتی۔ مانا انہیں ظاہری بیماری نہیں ہے۔ مگر دل کی بیماری تو
اُس سے بھی زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ جو آدمی رونے کی جگہ ہنسے اور ہنسنے کی
جگہ روئے اُس کے دیوانہ ہونے میں کیا شبہ ہے۔؟

ہاں! مجھے اپنا غم بھول جانا ہوگا۔...... روؤں گی....... رونا تو
میری تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ مگر ہنس ہنس کر۔ اپنی تقدیر سے لڑوں گی۔ جو
جاتے رہے اُن کے نام کو رونے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں۔ لیکن جو ہے اُسے
نہ جانے دوں گی۔

آ...... اے ٹوٹے ہوئے دل! آج تیرے ٹکڑوں کو جمع کر کے ایک
مزار بناؤں اور اپنے غم کو اسی میں دفن کر دوں۔!

لیلا ساری رات بیٹھی دل سے یہی باتیں کر رہی تھی۔ اُدھر مردانے میں
دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ سیتا سرن نشہ میں چور، کبھی گاتا تھا، کبھی تالیاں بجاتا
تھا۔ اُن کے قہقہوں سے دیواریں ہلی جاتی تھیں۔

پچھلے پہر محفل میں سناٹا چھا گیا۔ لیلا نے سوچا شاید لوگ سو گئے۔
معلوم نہیں دروازہ بند کیا یا کُھلا ہی چھوڑ دیا۔ شاید لوگ کہیں چلے گئے۔
کوئی سُنک سوار ہوئی ہوگی۔ جاکر دہلیز سے مردانے کمرہ میں جھانکا۔
احباب رخصت ہو گئے تھے۔ صرف ایک حسینہ مسند پر جلوہ افروز تھی۔ اور
سیتا سرن اس کے سامنے جُھکا ہوا۔ اُس سے بہت دھیرے دھیرے
باتیں کر رہا تھا۔ حسینہ کے چہرہ پر آنکھوں میں شرارت آمیز تغافل تھا۔

سیتا سرن شگفتگی اور از خود رفتگی کی تصویر۔ ایک بھولا بھالا دل ایک فریب شعار نازنین کے ہاتھوں لٹتا جاتا تھا۔ لیلا کی دولت اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سارقہ اٹھائے لیے جاتی تھی۔ لیلا کے جسم میں رعشہ آگیا۔ ایسی وحشت سوار ہوئی کہ اسی وقت جا کر اس فاحشہ کو دھتکار دوں اور ٹکڑے ٹکڑے نکال دوں۔ نسائیت کا وہ تار جو عرصہ سے مفلوج ہو رہا تھا یکبارگی مرتعش ہو اٹھا۔ پر لیلا نے ضبط کیا۔ اور اُلٹے پاؤں اندر لوٹ آئی۔

آفتاب کی زر نگار شعاعیں کمرہ میں آئیں تو لیلا کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا! آج کئی مہینوں کے بعد لیلا نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اُس کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ غم نے اُس کی صورت ہی تبدیل کر دی تھی۔ اُس حسینہ کے سامنے وہ ایسی لگتی تھی۔ جیسے تر و تازہ گلاب کے سامنے جوہی کا پھول۔

(۵)

سیتا سرن کا خمار دوپہر کو ٹوٹا تو سامنے لیلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اُس کی انوکھی چھب آنکھوں میں سما گئی۔ ایسے خوش ہوئے گویا ایک مدت کے فراق کے بعد اُس سے وصال ہوا ہو۔ اُنہیں کیا معلوم تھا۔ کہ یہ رُوپ بھرنے کے پہلے لیلا نے کتنے آنسو بہائے ہیں۔ بالوں میں یہ پھول گوندھنے کے پہلے آنکھوں سے کتنے موتی پرو دیئے ہیں۔ اُن کا پشیمان دل اُس کی دلجوئی کرنے کے لئے بیقرار ہو اٹھا۔ جوش محبت سے مخمور ہو کر لیلا کو گلے لگا لیا۔ اور مسکرا کر بولے:۔ آج تو تم مسلح ہو کر آئی ہو لیلا۔ کہاں بھاگوں۔؟

لیلانے اپنے دل کی طرف انگلی دکھا کر کہا۔ یہاں آ بیٹھو! بہت بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ اب تمہیں باندھ کر رکھوں گی۔

باہر سے کسی دوست کے آنے کی خبر آئی۔ سیتا سرن چلنے لگے تو لیلا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں نہ جانے دوں گی۔

سیتا سرن۔ ابھی آتا ہوں۔

لیلا۔ مجھے ڈر لگتا ہے تم کہیں چل نہ دو۔

سیتا سرن۔ نہیں لیلا۔ تم نے مجھے باندھ لیا۔ اب ہل نہیں سکتا۔

سیتا سرن باہر آئے تو دوست صاحب بولے۔ اب تک سوتے ہی رہے کیا۔ اس وقت تو وہاں چلنے کی ٹھہری تھی نہ؟

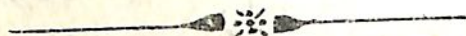
سیتا سرن نے بے نیازی کی شان سے کہا۔ چلنے کو تو تیار ہوں لیکن لیلا جانے نہیں دیتی۔

دوست۔ نرے گاؤدی ہی رہے۔ آ گئے بیوی کے پنجے میں۔

سیتا سرن۔ ہاں بھئی آ گیا۔ اُس نے گھر سے نکال دیا تھا۔ تب چھاؤں ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ اب اُس نے دروازہ کھول دیا ہے۔ اور کھڑی بلا رہی ہے۔

دوست۔ اجی یہاں وہ لطف کہاں! گھر کو لاکھ سجاؤ تو کیا باغ ہو جائے گا۔

سبٹا سرن ۔ کبھی گھر باغ تو نہیں ہو سکتا مگر سورگ ہو سکتا ہے ۔ مجھے اس وقت اپنی فردائیگی پر جتنی ندامت ہو رہی ہے ۔ وہ میں ہی جانتا ہوں ۔ جب غم میں اُس نے اپنی دلربائیوں کو لٹا دیا ۔ اپنی خوشیوں کو فنا کر دیا ۔ اُسی غم کو میرا ایک اشارہ پا کر فراموش کر دیا ۔ جانتے ہو کیوں ؟ اسی لئے کہ میں بہک نہ جاؤں ۔ وہ جنت کی دیوی ہے ۔ اور مجھ جیسے شوریدہ سروں کی حفاظت کرنے ہی کے لئے بھیجی گئی ہے ۔



عفو

(۱)

مسلمانوں کو اسپین پر حکومت کرتے کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔ کلیساؤں کی جگہ مسجدیں بنتی جاتی تھیں۔ گھنٹوں کی خوش آیند نغمے جان صداؤں کی جگہ مؤذن کی گرجنتا پر روحانی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ غرناطہ اور الحمرہ میں زمانہ کی بیج رفتاری پر ہنسنے والے محلات بن چکے تھے جن کے کھنڈر اب تک تماشائیوں کو اپنی شان ماضیہ کی جھلک دکھاتے ہیں۔ معزز عیسائی مرد و عورت حضرت مسیحؑ کا دامن چھوڑ کر اسلامی اخوت کے سایہ میں کھنچے چلے آتے تھے۔ اور مورخوں کے لئے آج تک یہ امر باعث حیرت ہے کہ عیسائیوں کا نام و نشان وہاں کیوں کر باقی رہ گیا۔

اُن عیسائی سرداروں میں جنہوں نے اب تک اسلام کی دعوت نہ قبول کی تھی۔ اور اسلامی جبروت کا لوہا نہ مانا تھا۔ جواب بھی اپنے ملک میں سوراجیہ قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک سوداگر داؤد بھی تھا۔ داؤد عالم اور دلیر تھا۔ بلا کا خود دار، وہ اپنے علاقہ میں اسلام کو قدم نہ جمانے دیتا تھا۔ اس کا گھر مصیبت زدہ عیسائی فدائیوں کے لئے واحد

جائے امن تھا۔ اُس کا سب کچھ اُن پر نثار تھا۔ مسلمان لوگ داؤد سے خائف رہتے تھے۔ اور مذہبی قوت سے اُس پر فتح نہ پا کر اُسے زور شمشیر سے مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ مگر داؤد موقع و محل سمجھتا تھا۔ کھلے میدان میں کبھی اُن کا مقابلہ نہ کرتا تھا۔ ہاں جہاں کہیں عیسائیوں کو اسلام کے آگے سر جھکاتے دیکھتا بے خوف و خطر جا پہنچتا اور بحث یا التجا سے انہیں اپنے مذہب پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیتا۔

بالآخر مسلمانوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اس کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا۔ اسلامی فوجوں نے اُس کے علاقہ کو محصور کر لیا۔ اور اس کا سامان رسد بند کر دیا۔ داؤد کچھ دنوں تک تو اپنے مضبوط قلعہ میں بند رہا۔ مگر جب قلعہ میں پانی بھی نہ رہا تو اُسے مجبوراً جابری کے لئے اپنے متعلقین کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ ایک دن موقع پا کر وہ رات کو قلعہ سے نکلا۔ اور اسلامی دارالخلافہ غرناطہ میں آکر روپوش ہو گیا۔ اُس کی جانبازیوں نے نو مسلم عیسائیوں میں بھی اس کے معتقد پیدا کر دیئے تھے۔ دنیا پروری اُن پر چاہے قائم نہ رہ سکے۔ حمیت سے بے بہرہ نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ہمدردوں کے درمیان داؤد پچھلے دنوں کے انتظار میں زندگی بسر کرنے لگا۔ مسلمانوں کے مخبر اس کا سراغ لگانے کے لئے بہت سر مارتے تھے۔ اُس کی گرفتاری کے لئے انعامات کثیر مشتہر کئے جاتے تھے۔ مگر داؤد کا پتہ نہ چلتا تھا۔

(۲)

ایک روز تنہائی سے اُکتا کر داؤد غرناطہ کے ایک باغ میں سیر کرنے چلا گیا۔ شام ہو گیا تھی۔ مسلمان لمبی عبائیں پہنے۔ بڑے بڑے عمامے سر پر باندھے کمر میں تلوار لٹکائے۔ روشوں پر ٹہل رہے تھے۔ عورتیں سفید

برقع والے، زر دوزی کی جوتیاں پہنے بنچوں اور کرسیوں پر متمکن تھیں۔ داؤد سب سے الگ ہری بھری گھاس پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ مبارک دن آئے گا۔ جب ہمارا وطن ان ظالموں کے پنجے سے چھٹکارا پا جاوے گا۔ گزرے ہوئے زمانہ کا خیال کر رہا تھا۔ جب عیسائی عورت مرد ان روشوں پر ٹہلتے ہوں گے۔ جب یہ مقام عیسائیوں کے شیریں نغموں سے گونجتا ہوگا۔

دفعتاً ایک مسلمان نوجوان آ کر داؤد کے پاس بیٹھ گیا اور اس کو سر سے پیر تک حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ کیا ابھی تک تمہارا دل اسلامی نور سے منور نہیں ہوا۔؟ داؤد نے متانت سے کہا۔ اسلام کا نور پہاڑ کی چوٹیوں کو منور کر سکتا ہے۔ تاریک گھاٹیوں میں اس کا گذر نہیں ہو سکتا۔

اس مسلمان عربی کا نام جمال تھا۔ یہ بات سنکر تیز لہجہ میں بولا اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔؟

داؤد۔ اس سے میرا مطلب یہی ہے کہ عیسائیوں میں اونچے طبقہ کے لوگ جاگیر اور اقتدار کے لالچ اور سزا کے خوف سے اسلام کی پناہ لے سکتے ہیں۔ مگر کمزور اور غریب عیسائیوں کے لئے اسلام میں وہ آسمان کی بادشاہت کہاں ہے، جو انہیں حضرت مسیح کے دامن میں نصیب ہوگی۔ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے ہوئی ہے۔ خدمت خلق کے سہارے نہیں۔

جمال اپنے مذہب کی توہین سنکر تلملا اٹھا۔ گرم ہو کر بولا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اسلام کی طاقت اس کی اندرونی اخوت اور مساوات ہے تلوار نہیں۔

داؤد۔ اسلام نے مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا ہے۔ اس میں اس کی ساری مسجدیں غرق ہو جائیں گی۔

جمال۔ تلوار نے ہمیشہ سچائی کی حفاظت کی ہے۔

داؤد نے اسی استقلال کے لہجہ میں کہا جس کو تلوار کا سہارا لینا پڑے وہ سچائی ہی نہیں۔

جمال قومی غرور سے دیوانہ ہو کر بولا۔ جب تک جھوٹ کے ماننے والے رہیں گے۔ اس وقت تک تلوار کی ضرورت بھی رہے گی۔

داؤد۔ تلوار کا منہ تاکنے والی سچائی ہی جھوٹی ہے۔

عرب نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ خدا کی قسم اگر تم بلا ہتھیار کے نہ ہوتے تو تمہیں اسلام کی توہین کرنے کا مزہ چکھا دیتا۔

داؤد نے اپنے سینہ میں چھپی ہوئی کٹار کو نکال کر کہا۔ نہیں میں غیر مسلح نہیں ہوں۔ مسلمانوں کا جس روز اتنا اعتبار کروں گا۔ اُس روز عیسائی نہ رہوں گا۔ تم اپنے دل کے حوصلے نکال لو۔

دونوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑا۔ عرب کی بھاری تلوار عیسائی کی ہلکی کٹار کے سامنے سُست پڑ گئی۔ ایک سانپ کی طرح پھن سے چوٹ کرتی تھی۔ تو دوسری ناگن کی طرح اُڑتی تھی۔ ایک لہروں کی طرح لپکتی تھی۔ دوسری پانی کی مچھلیوں کی طرح چمکتی تھی۔ دونوں بہادروں میں کچھ دیر تک وار ہوتے رہے۔ دفعتاً ایک بار ناگن اُچھل کر عرب کے سینے میں جا پہنچی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

(۲)

جمال کے گرتے ہی لوگ چاروں طرف سے دوڑے اور داؤد کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگے۔ داؤد نے دیکھا کہ لوگ تلواریں لئے دوڑے چلے آ رہے ہیں جان لے کر بھاگا۔ مگر جدھر جاتا تھا۔ سامنے باغ کی دیوار راستہ میں حائل ہو جاتی تھی۔ دیوار بلند تھی اُسے پھاندنا مشکل تھا۔ یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔

کہیں پناہ کی امید نہیں۔کہیں چھپنے کی جگہ نہیں۔ادھر عربوں کی خون کی پیاس لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی تھی۔یہ صرف ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش نہ تھی۔قومی ہتک کا انتقام مقصود تھا۔ایک مفتوح عیسائی کی یہ ہمت کہ عرب پر ہاتھ اُٹھائے۔ایسا اندھیر!

جس طرح تعاقب کرنے والے کتوں کے سامنے گلہری اِدھر اُدھر دوڑتی ہے۔کسی درخت پر چڑھنے کی بار بار کوشش کرتی ہے۔مگر ہاتھ پیر پھول جانے کے سبب بار بار گر پڑتی ہے۔وہی حالت داؤد کی بھی تھی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا دم پھول گیا۔پیر من من بھر کے ہو گئے۔کئی بار دل میں آیا کہ ان سب پر ٹوٹ پڑے اور جان جتنی مہنگی فروخت کر سکے کرے۔مگر دشمنوں کی تعداد دیکھ کر حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔

لینا...!دوڑنا......!پکڑنا......!کا شور برپا تھا۔کبھی کبھی پیچھا کرنے والے اتنے قریب آجاتے تھے۔کہ معلوم ہوتا تھا۔اب لڑائی کا خاتمہ ہوا۔وہ تلوار پڑی۔مگر پیروں کی ایک حرکت، ایک ہی گردش، اُسے خون کی پیاسی تلواروں سے بال بال بچا لیتی تھی۔

داؤد کو اب اس لڑائی میں کھلاڑیوں کا سا لطف آنے لگا۔یہ یقینی تھا کہ اس کی جان نہیں بچ سکتی۔مسلمان رحم کرنا نہیں جانتے۔اِس لئے اُس کو اپنے داؤں پیچوں میں مزہ آرہا تھا۔کسی وار سے بچ کر اب اُسے یہ خوشی نہ ہوتی تھی کہ اس کی جان بچ گئی۔بلکہ یہ خیال مسرت بخش تھا کہ اُس نے قاتل کو کیسا زچ کیا۔

دفعتاً اس کو اپنے داہنی جانب باغ کی دیوار کچھ نیچی نظر آئی۔اس کے پیروں میں ایک نئی طاقت عود کر آئی۔رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا۔وہ ہرن کی طرح اس طرف دوڑا۔اور ایک جست میں باغ کے اس پار پہنچ گیا۔زندگی اور موت

میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ پیچھے موت تھی اور آگے زندگی کی وسیع فضا، جہاں تک نظر جاتی تھی۔ جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ زمین پتھریلی تھی۔ کہیں اونچی، کہیں نیچی۔ جگہ جگہ پتھر کی سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ داؤد ایک سل کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔

دم بھر میں تعاقب کرنے والے بھی آپہنچے اور اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں، گڑھوں میں، سلوں کے نیچے تلاش کرنے لگے۔ ایک عرب اسی چٹان پر آکر کھڑا ہو گیا جس کے نیچے داؤد چھپا ہوا تھا۔ داؤد کا دل دھڑک رہا تھا کہ اب جان گئی۔ عرب نے ذرا نیچے کو جھانکا اور زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اتفاق، صرف اتفاق پر اس کی زندگی کا انحصار تھا۔ داؤد نے سانس روک لی۔ بالکل ساکت ہو گیا۔ ایک نگاہ پر اس کی زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی اور موت میں کتنی قربت ہے۔!

مگر عربوں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ہوشیاری سے سلوں کے نیچے دیکھتے وہاں تو قاتل کے پکڑنے کی عجلت تھی۔ داؤد کے سر سے آئی بلا ٹل گئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھال کر آگے بڑھ گئے۔

(۴)

اندھیرا ہو گیا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے اور ستاروں کے ساتھ داؤد بھی چٹان کے نیچے سے نکلا۔ لیکن دیکھا تو اس وقت بھی چاروں طرف ہلچل مچی ہوئی ہے۔ دشمنوں کی جماعت مشعلیں لئے جھاڑیوں میں گھوم رہی ہے۔ ناکہ ناکہ پر پہرا ہے۔ کہیں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہیں، داؤد ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر سوچنے لگا اب کیونکر جان بچے۔ اُسے اپنی جان کی ایسی پرواہ نہ تھی۔ وہ زندگی کے دُکھ سکھ سب اُٹھا چکا تھا۔ اگر اسے زندگی کی تمنا تھی۔ تو صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا۔ میرے ہموطن پست ہمت ہو جائیں گے۔ یا مستقل

ارادہ کے ساتھ میدان جنگ میں اڑے رہیں گے۔

جب رات زیادہ گزر گئی۔ اور دشمنوں کی کوشش انتقام میں کچھ کمی نظر نہ آئی۔ تو داؤد خدا کا نام لے کر جھاڑیوں سے نکلا۔ اور دبے پاؤں، درختوں کی آڑ میں۔ آدمیوں کی نظر بچاتا ہوا۔ ایک طرف کو روانہ ہوا۔ وہ ان جھاڑیوں سے نکل کر آبادی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ویرانی کسی کی آڑ نہیں کرسکتی۔ بستی کی گھنی آبادی خود ہی ایک آڑ ہے۔

کچھ دُور تک تو داؤد کے راستہ میں کوئی رُکاوٹ نہ پیدا ہوئی جنگلی درختوں نے اس کی حفاظت کی۔ مگر جب وہ ناہموار زمین سے نکل کر ہموار زمین پر آیا۔ تو ایک عرب کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے للکارا۔ داؤد بھاگا۔ قاتل بھاگا جاتا ہے! یہ آواز ہوا میں ایک ہی بار گونجی اور ایک لمحہ میں عربوں نے چاروں طرف سے اس کا تعاقب کیا۔ سامنے بہت دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ بہت فاصلہ پر ایک دُھندلا سا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں! وہ اس چراغ کی طرف اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ گویا وہاں پہنچتے ہی امان پا جائے گا۔ امید اُسے اڑائے لئے جاتی تھی۔ عربوں کا گروہ پیچھے رہ گیا۔ مشعلوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ صرف ستارے اس کے ساتھ دوڑے چلے آتے تھے۔ بالآخر وہ پُرامید چراغ سامنے آگیا۔ ایک چھوٹا سا پھوس کا جھونپڑا تھا۔ ایک بوڑھا عرب زمین پر بیٹھا ہوا۔ رحل پر قرآن رکھے اسی چراغ کی دُھندلی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ داؤد آگے نہ جا سکا۔ اس کی ہمت نے جواب دیدیا۔ وہ وہیں بیدم ہوکر گر پڑا۔ راستہ کا تکان گھر پہنچنے پر محسوس ہوتا ہے۔

عرب نے اٹھ کر پوچھا تو کون ہے۔؟

داؤد۔ ایک غریب عیسائی۔ مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ اب آپ

ہی پناہ دیں تو میری جان بچ سکتی ہے ۔

عرب ۔ خدائے پاک تیری مدد کرے گا تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے ۔ ؟

داؤد ۔ خوف ہے کہ کہدوں تو کہیں آپ بھی میرے خون کے پیاسے نہ ہوجائیں ۔

عرب ۔ جب تو نے میری پناہ لی تو تجھ کو مجھ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہئے ہم مسلمان ہیں جسے ایک بار اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں ۔ اس کی تمام عمر حفاظت کرتے ہیں ۔

داؤد ۔ میں نے ایک مسلمان نوجوان کا خون کرڈالا ہے ۔

بوڑھے عرب کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا ۔ بولا اس کا نام ؟

داؤد ۔ اس کا نام جمال تھا ۔

عرب سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا ۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں ۔ گردن کی رگیں تن گئیں ۔ چہرہ پر سفاکانہ سُرخی کی جھلک نظر آئی ۔ نتھنے پھڑکنے لگے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں سخت جدوجہد ہو رہی ہے ۔ اور وہ ارادے کی انتہائی قوت سے کام لے کر اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ دو تین منٹ تک وہ اُسی اضطراب کی حالت میں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاکتا رہا ۔ آخر اس کے روندھے ہوئے حلق سے یہ الفاظ نکلے ۔

" نہیں نہیں ! پناہ لینے والے کی حفاظت کرنی ہی پڑے گی ۔ آہ ظالم ! تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں ۔ ؟ میں اُسی نوجوان کا بدنصیب باپ ہوں ۔ جسے آج تو نے اپنی شمشیر سے قتل کیا ہے ۔ تو جانتا ہے تو نے مجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے ؟ تو نے میرے خاندان کا نشان مٹا دیا ۔ میرا چراغ گل کر دیا ۔ آہ ! جمال میرا اکلوتا بیٹا تھا ۔ میری ساری تمناؤں کا مدار ۔ میری آنکھوں کا نور ، مجھ اندھے

رہبریم چالیسی

کی لاٹھی۔ میری زندگی کا سہارا۔ میرے نحیف جسم کی جان تھا۔ ابھی ابھی اسے قبر کی گود میں لٹا کر آیا ہوں۔

آہ! میرا شبیر آج خاک کے نیچے سو رہا ہے۔ ایسا دلبر، ایسا دیندار، ایسا خوش رو جوان، میری قوم میں دوسرا نہ تھا۔ ظالم! تجھے اُس پر تلوار چلاتے ذرا بھی رحم نہ آیا تیرا پتھر کا دل ذرا بھی نہ پسیجا۔ تو جانتا ہے۔ کہ مجھے اس وقت تجھ پر کتنا غصہ آ رہا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تیری گردن پکڑ کر اس طرح دباؤں کہ تیری زبان باہر نکل پڑے۔ تیری آنکھیں کوڑیوں کی طرح نکل کر گر پڑیں۔ مگر نہیں تو نے میری پناہ لی ہے۔ فرض میرے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہے۔ کیونکہ ہمارے رسول پاک نے ہدایت کی ہے۔ کہ جو اپنی پناہ میں آوے اس پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔ میں نہیں چاہتا کہ نبیؐ کے حکم کے خلاف چل کر دُنیا کے ساتھ اپنی عاقبت بھی بگاڑوں۔ دنیا تو نے بگاڑی۔ دین اپنے ہاتھوں بگاڑوں، نہیں۔ ضبط مشکل ہے۔ مگر ضبط کروں گا۔ تاکہ نبیؐ کے سامنے آنکھیں نیچی کرنی پڑیں۔ آ۔ گھر میں آ۔ تیرا پیچھا کرنے والے وہ دوڑے آ رہے ہیں۔ تجھے دیکھ لیں گے۔ تو پھر میری ساری منت و سماجت تیری جان نہ بچا سکے گی۔ تو نہیں جانتا کہ عرب لوگ خون کبھی معاف نہیں کرتے۔"

یہ کہہ کر عرب نے داؤد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے گھر میں لے جا کر ایک کوٹھری میں چھپا دیا۔ وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا۔ کہ عربوں کی ایک جماعت اس کے دروازہ پر آ پہنچی۔ ایک شخص نے پوچھا۔ کیوں شیخ حسن تم نے اِدھر سے کسی کو بھاگتے دیکھا ہے۔؟

"ہاں دیکھا ہے۔"؟

"اُسے پکڑ کیوں نہ لیا۔ وہی تو جمال کا قاتل ہے۔"

"یہ جان کر بھی میں نے اس کو چھوڑ دیا۔"

"این! غضب خدا کا یہ تم نے کیا کہا۔؟ جمال حشر کے روز ہمارا دامن پکڑے گا تو ہم کیا جواب دیں گے۔"

"تم کہہ دینا کہ تیرے باپ نے تیرے قاتل کو معاف کر دیا۔"

"عرب نے کبھی قاتل کو معاف نہیں کیا۔"

"یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ میں اسے اپنے سر کیوں لوں۔؟"

عربوں نے شیخ حسن سے زیادہ حجت نہ کی وہ قاتل کی تلاش میں دوڑے۔ شیخ حسن پھر چٹائی پر بیٹھ کر قرآن پڑھنے لگا۔ لیکن اس کا دل پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ دشمن سے بدلہ لینے کی خواہش عربوں کی جبلی خاصیت تھی۔ خون کا بدلہ خون تھا اس کے لئے خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔ قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے۔ شہر کے شہر ویران ہو جاتے تھے۔ اس بدلہ کی خواہش پر فتح پانا شیخ حسن کے لئے ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ بار بار پیارے بیٹے کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ بار بار اس کے دل میں زبردست تحریک ہوتی تھی کہ داؤد کے خون سے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کروں۔ عرب بہادر ہوتے تھے۔ کٹنا مرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مرنے والے کے لئے وہ آنسوؤں کے چند قطرے بہا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہ مرنے والے کی یاد کو صرف اسی حالت میں تازہ رکھتے تھے۔ جب اُس کے خون کا بدلہ لینا ہوتا تھا۔ آخر شیخ حسن بیقرار ہو کر اُٹھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اب میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اس نے تلوار نیام سے باہر کر لی۔ اور دبے پاؤں اس کوٹھری کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہو گیا جس میں داؤد چھپا ہوا تھا۔ تلوار کو دامن میں چھپا کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ داؤد ٹہل رہا تھا۔ بوڑھے عرب کا غضبناک چہرہ دیکھ کر داؤد

اس کے ارادہ کو تاڑ گیا۔ اُسے بوڑھے سے ہمدردی ہوگئی۔ اس نے سوچا یہ مذہب کا قصور نہیں، قوم کا قصور نہیں۔ میرے لڑکے کو کسی نے قتل کر دیا ہوتا۔ تو شائد میں بھی اس کے خون کا پیاسا ہو جاتا۔ یہی انسانی خاصہ ہے۔

عرب نے کہا۔...... تمہیں معلوم ہے کہ بیٹے کی موت کا کتنا غم ہوتا ہے؟

داؤد۔ اس کا تجربہ تو نہیں ہے۔ مگر اندازہ کر سکتا ہوں۔ اگر میری جان سے آپ کے اُس غم کا ایک حصہ بھی کم ہو سکے تو لیجئے یہ سر حاضر ہے میں اسے شوق سے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ آپ نے داؤد کا نام سُنا ہوگا۔؟

عرب۔ کیا پیٹر کا بیٹا۔؟

داؤد۔ جی ہاں! میں وہی بدنصیب داؤد ہوں۔ میں صرف آپ کے بیٹے کا قاتل نہیں، بلکہ اسلام کا دشمن ہوں۔ مجھے قتل کر کے آپ جمال کے خون کا انتقام ہی نہ لیں گے۔ بلکہ قوم و مذہب کی سچی خدمت بھی انجام دیں گے۔

شیخ حسن ایک لمحہ تک سکوت میں کھڑا رہا۔ پھر بولا۔ داؤد! میں نے تمہیں معاف کیا۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں عیسائیوں کو کافی اذیتیں پہنچی ہیں۔ مسلمانوں نے ان پر بڑے بڑے مظالم کئے ہیں۔ اُن کی آزادی چھین لی ہے۔ لیکن یہ اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا قصور ہے۔ فتح کے غرور نے مسلمانوں کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ ہمارے پاک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج عمل کر رہے ہیں۔ وہ خود عفو و رحم کے بلند ترین معیار تھے۔ میں اسلام کے نام کو بٹا نہ لگاؤں گا۔ میری اونٹنی لے لو اور راتوں رات جہاں تک بھاگ سکو، بھاگ جاؤ، کہیں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہرنا۔ عربوں کو تمہاری بو بھی مل گئی تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔ جاؤ تمہیں خدائے پاک بخیر و عافیت گھر پہنچا دے۔ بوڑھے شیخ حسن اور اس

(حصہ دوم)

کے بیٹے جمال کے لئے خدا سے دعا کیا کرتا۔

داؤد بخیریت گھر پہنچ گیا۔ مگر اب وہ داؤد نہ تھا۔ جو اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیالات میں ایک گونہ تغیر ہو گیا تھا۔ اب وہ مسلمانوں کی قدر کرتا اور اسلام کا نام عزت سے لیتا تھا۔



بند دروازہ

آفتاب اُفق کی گود سے نکلا۔ بچہ پالنے سے۔ وہی ملاحت، وہی سُرخی، وہی خمار، وہی ضیا۔

میں برآمدہ میں بیٹھا تھا۔ بچے نے دروازہ سے جھانکا۔ میں نے مسکرا کر پکارا۔ وہ میری گود میں آکر بیٹھ گیا۔

اس کی شرارتیں شروع ہوگئیں۔ کبھی قلم پر ہاتھ بڑھایا۔ کبھی کاغذ پر دست درازی کی۔ میں نے گود سے اُتار دیا۔ وہ میز کا پایہ پکڑے کھڑا رہا۔ گھر میں نہ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک چڑیا پھُدکتی ہوئی آئی۔ اور سامنے کے صحن میں بیٹھ گئی۔ بچہ کے لئے تفریح کا یہ نیا سامان تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ چڑیا ذرا بھی نہ ڈری۔ بچہ نے سمجھا اب یہ پردار کھلونا ہاتھ آگیا۔ بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چڑے کو بلانے لگا۔ چڑیا اُڑ گئی۔ مایوس بچہ رونے لگا۔ مگر اندر کے دروازہ کی طرف تاکا بھی نہیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

گرم حلوے کی خوش آیند صدا آئی۔ بچہ کا چہرہ اشتیاق سے کھل

اٹھا۔ خوانچے والا سامنے سے گزرا۔ بچے نے میری طرف التجا کی نظروں سے دیکھا۔ جوں جوں خوانچے والا دور ہوتا گیا۔ نگاہ التجا احتجاج میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب موڑ آ گیا اور خوانچے والا نظروں سے غائب ہو گیا۔ تو احتجاج نے فریاد پرشور کی صورت اختیار کی۔ مگر میں بازار کی چیزیں بچوں کو نہیں کھانے دیتا۔ بچہ کی فریاد نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔ میں نے آئندہ را احتیاط کے خیال سے اور بھی اکڑ کی لی۔ کہہ نہیں سکتا۔ بچے نے اپنی ماں کی عدالت میں اپیل کرنے کی ضرورت سمجھی یا نہیں۔ عام بچے ایسی افتادوں کے موقعہ پر ماں سے اپیل کرتے ہیں۔ شاید اس نے کچھ دیر کے لئے اپیل ملتوی کر دی ہو۔ اس نے دروازہ کی طرف رُخ نہ کیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے اشک شوئی کے خیال سے اپنا فاؤنٹین پن اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ بچہ کو کائنات کی دولت مل گئی۔ اس کے سارے قوار ذہنی اس نئے عقدے کو حل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ دفعتہً دروازہ ہوا سے خود بخود بند ہو گیا۔ "پٹ" کی آواز بچہ کے کانوں میں آئی۔ اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا وہ انہماک فی الفور غائب ہو گیا۔ اُس نے فاؤنٹین پن کو پھینک دیا۔ اور روتا ہوا دروازہ کی طرف چلا۔ کیونکہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔

جلوس

(۱)

کانگرس کا جلوس نکل رہا تھا۔ کچھ نوجوان۔ کچھ بوڑھے۔ کچھ بچے جھنڈیاں اور جھنڈے لئے "بندے ماترم" گاتے ہوئے مال کے سامنے سے نکلے۔ دونوں طرف تماشائیوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ گویا اُن کو اس جھگڑے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ کوئی تماشا ہے۔ اور اُن کا کام صرف کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا ہے۔

شمبھوناتھ نے دکان کی پٹری پر کھڑے ہوکر اپنے ہمسایہ دیندیال سے کہا "سب کے سب موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ آگے سواروں کا دستہ مار مار کر بھگا دے گا۔"

دیندیال نے کہا "مہاتما جی بھی سٹھیا گئے ہیں۔ جلوس سے سوراجیہ مل جاتا۔ تو اب تک کب کا مل گیا ہوتا۔ اور جلوس میں ہیں کون لوگ دیکھا! لونڈے!! لفنگے!!! دیوانے!!! شہر کا کوئی بڑا آدمی نہیں۔"

میکو جوتیوں۔ اور سلیپروں کی بالا گردن میں لٹکائے کھڑا تھا۔ ان دونوں سیٹھوں کی باتیں سنکر ہنس پڑا۔ شمبھو نے پوچھا "کیوں ہنسے میکو۔؟

آج رنگ گہرا معلوم ہوتا ہے۔

میکو۔ ہنسا اس بات پر جو تم نے کہی کہ کوئی بڑا آدمی جلوس میں نہیں ہے۔ بڑے آدمی جلوس میں کیوں آنے لگے۔ اُنہیں اس راج میں کون آرام نہیں ہے بنگلوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹروں پر گھومتے ہیں۔ صاحبوں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ انہیں کون تکلیف ہے۔ مر تو ہم لوگ رہے ہیں۔ جنہیں روٹیوں کا ٹھکانہ نہیں۔ اس وقت کوئی ٹینس کھیلتا ہوگا۔ کوئی چار پیتا ہوگا۔ کوئی گراموفون لئے گانا سنتا ہوگا۔ کوئی پارک کی سیر کرتا ہوگا۔ یہاں آویں پولیس کے کوڑے کھانے کے لئے۔ تم نے بھی اچھی کہی"!

شمبھو۔ تم یہ باتیں کیا سمجھو گے میکو! جس کام میں چار بڑے آدمی شامل ہوتے ہیں۔ اُس کی سرکار پر بھی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ لونڈے لفنگوں کو حاکم لوگ بھلا کیا سمجھتے ہیں۔

میکو نے ایسی نگاہ سے دیکھا۔ جو کہہ رہی تھی "ان باتوں کو ہم بھی سمجھتے ہیں۔" اور بولا۔ بڑے آدمیوں کو ہمیں لوگ بناتے بگاڑتے ہیں۔ یا کوئی اور؟ کتنے ہی لوگ جنہیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ہمارے بنائے بڑے آدمی بن گئے۔ اور اب موٹروں پر نکلتے ہیں۔ اور ہمیں نیچا سمجھتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی تقدیر کی کھوبی ہے۔ کہ جس کی ذرا بھی ترقی ہوئی۔ بس اس نے ہم لوگوں کی طرف سے نگاہ بدلی۔ ہمارا بڑا آدمی تو وہی ہے جو لنگوٹی باندھے ننگے پاؤں گھومتا ہے۔ جو ہمارے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے۔ ہمیں اور کسی بڑے آدمی کی پرواہ نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو ان بڑے آدمیوں نے ہی ہماری مٹی خراب کر رکھی ہے۔ انہیں سرکار نے کوئی اچھی سی جگہ دیدی۔ بس اُس کا دم بھرنے لگے۔

دینڈیال ۔ نیا داروغہ بُرا جلاد ہے ۔ چوراہے پر پہنچتے ہی ہنٹر لے کر پل پڑے گا ۔ پھر دیکھنا سب کیسا دُم دبا کر بھاگتے ہیں ۔ مزا آوے گا ۔

جلوس آزادی کے نشے میں چُور چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ سواروں اور سپاہیوں کا ایک دستہ راستہ روکے کھڑا ہے ۔

یکایک داروغہ بیربل سنگھ گھوڑا بڑھا کر جلوس کے سامنے آ گئے اور بولے ۔ تم لوگوں کو آگے جانے کا حکم نہیں ہے ۔"

جلوس کے بڈھے لیڈر ابراہیم علی نے آگے بڑھ کر کہا "میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کسی قسم کا دنگا فساد نہ ہوگا ۔ ہم دکانیں لوٹنے یا موٹریں توڑنے نہیں نکلے ہیں ۔ ہمارا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے ۔

بیربل سنگھ ۔ مجھے یہ حکم ہے کہ جلوس یہاں سے آگے نہ جانے پاوے ۔

ابراہیم ۔ آپ اپنے افسروں سے ذرا پوچھ نہ لیں ۔

بیربل سنگھ ۔ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا ۔

ابراہیم ۔ تو ہم لوگ یہیں بیٹھے ہیں ۔ جب آپ لوگ چلے جائیں گے تو ہم نکل جائیں گے ۔

بیربل ۔ یہاں کھڑے ہونے کا بھی حکم نہیں ہے ۔ تم کو واپس جانا پڑیگا ۔

ابراہیم نے متانت کے ساتھ جواب دیا "واپس تو ہم نہ جائیں گے ۔ آپ کو یا کسی کو بھی ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ آپ اپنے سواروں سنگینوں اور بندوقوں کے زور سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں ۔ روک لیجئے ۔ مگر آپ ہمیں واپس نہیں کر سکتے ۔

بیربل میٹرک تھا ۔ اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا ۔ اُس کی رگ رگ میں رُعب بھرا ہوا تھا ۔ افسروں کی نگاہ میں اُس کی بڑی عزت تھی ۔ خاصہ

گورا چٹا، نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا صاحب اقبال شخص تھا۔ شاید جس وقت وہ کوٹ پہن کر اوپر سے ہیٹ لگا لیتا تو وہ بھول جاتا تھا۔ کہ میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔ غالباً وہ اپنے کو سلطنت کرنے والی قوم کا جزو سمجھنے لگتا تھا مگر ابراہیم علی کے مردانہ استقلال نے ذرا دیر کے لئے اُسے شش و پنج میں ڈال دیا جلوس کو راستہ دیدیتا ہے۔ تو جواب طلب ہو جائے گا۔ وہیں کھڑا رہنے دیتا ہے تو یہ سب نہ جانے کب تک کھڑے رہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑا ہوا تھا۔ کہ اس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو موٹر پر آتے دیکھا۔ اب پس و پیش کا وقت نہ تھا۔ یہی موقع تھا کارگذاری دکھانے کا۔ اُس نے کمر سے بیٹن نکال لیا۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جلوس پر چڑھانے لگا۔ اُسے دیکھتے ہی اور سواروں نے بھی گھوڑوں کو جلوس پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ابراہیم داروغہ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے سر پر ایک بیٹن ایسے زور سے پڑا کہ اس کی آنکھیں تلملا گئیں۔ کھڑا نہ رہ سکا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت داروغہ کے گھوڑے نے دونوں پاؤں اٹھائے اور زمین پر بیٹھا ہوا ابراہیم اُس کی ٹاپوں کے نیچے آگیا۔ جلوس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ ابراہیم کو گرتے دیکھ کر کئی آدمی اُسے اٹھانے کے لئے لپکے مگر کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ اُدھر سواروں کے ڈنڈے بڑی بے رحمی سے پڑ رہے تھے۔ لوگ ہاتھوں پر ڈنڈوں کو روکتے تھے۔ اور ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دل سے اشتعال کو دور رکھنا اُن کے لئے دمبدم مشکل ہوتا جاتا تھا۔ مگر سلوک اور اصول نے اُن کے جذبات اور حرکات کو بندشوں سے جکڑ رکھا تھا۔

دس بارہ منٹ تک یونہی ڈنڈوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور لوگ خاموش کھڑے رہے۔

(۲)

اِس مار پیٹ کی خبر ایک ہی آن میں بازار میں جا پہنچی۔ ابراہیم گھوڑے سے کچل گئے۔ کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ کتنوں ہی کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ مگر نہ وہ لوگ واپس ہوتے ہیں نہ پولیس اُنہیں آگے جانے دیتی ہے۔

میکو نے جوش میں آکر کہا: "اب تو بھائی یہاں نہیں رہا جاتا۔ میں بھی چلتا ہوں۔"

دینہ یال نے کہا۔ "ہم بھی چلتے ہیں بھائی! دیکھی جائے گی۔"

شمبھو ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ یکایک اُس نے بھی دُکان بڑھائی۔ اور بولا۔ "ایک دن تو مرنا ہی ہے جی، جو کچھ ہونا ہے ہو۔ آخر یہ لوگ سبھی کے لئے تو جان دے رہے ہیں۔" دیکھتے دیکھتے زیادہ تر دکانیں بند ہو گئیں۔ وہ لوگ جو دس منٹ پیشتر تماشا دیکھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور ہزاروں آدمیوں کا ایک جم غفیر جائے وقوع کی طرف چلا یہ متوالا گروہ خونریزی کے نشہ میں بھرے ہوئے آدمیوں کا گروہ تھا۔ جسے اصول اور مسلک کی پرواہ نہ تھی۔ جو مرنے کے لئے ہی نہیں مارنے کے لئے بھی تیار تھے۔ کتنوں ہی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں کتنے ہی جیبوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کسی سے کچھ بولتا تھا نہ پوچھتا تھا۔ بس سب کے سب دل میں ایک مستقل ارادہ کئے لپکے چلے جا رہے تھے۔ گویا کوئی گھٹا اُمڈی چلی آتی ہو۔

اس گروہ کو دُور سے دیکھتے ہی سواروں میں کچھ ہلچل پڑی۔ بیربل سنگھ کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنی موٹر آگے بڑھائی۔ امن اور عدم تشدد کے حامیوں پر ڈنڈے برسانا اور بات تھی۔ لیکن ایک پُر جوش گروہ سے مقابلہ کرنا دوسری بات۔ سوار اور سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔

ابراہیم کی پیٹھ پر گھوڑے نے ٹاپ رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہوش زمین پر پڑے تھے۔ ان آدمیوں کو اشارہ سے بلا کر کہا۔ کیوں کیلاش! کیا کچھ لوگ شہر سے آرہے ہیں۔ ؟

کیلاش نے اُس بڑھتی ہوئی گھٹا کی طرف دیکھ کر کہا "جی ہاں ہزاروں آدمی ہیں"

ابراہیم۔ تو اب خیریت نہیں ہے۔ جھنڈا لوٹا دو۔ ہمیں فوراً واپس چلنا چاہئیے۔ نہیں تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے بھائیوں سے لڑائی نہیں کرنا ہے۔ فوراً واپس چلو۔

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اُٹھ نہ سکے۔

اشارہ کی دیر تھی منتظم فوج کی طرح لوگ حکم پاتے ہی پیچھے پھر گئے!

جھنڈیوں کے بانسوں۔ صافوں اور رومالوں سے فوراً ایک اسٹریچر تیار ہو گیا۔ ابراہیم کو لوگوں نے اُس پر لٹا دیا۔ اور واپس ہوئے۔ مگر کیا وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ ؟ اگر کچھ لوگوں کو انہیں مغلوب سمجھنے میں ہی تسلی ہوتی ہو تو ہو۔ لیکن حقیقت میں انہوں نے ایک معرکتہ الآرا فتح حاصل کی تھی۔ وہ جانتے تھے، ہماری کشمکش اپنے ہی بھائیوں سے ہے۔ جن کے مفاد حالت موجودہ میں ہمارے مفاد سے علیحدہ ہیں۔ ہمیں اُن سے دشمنی نہیں کرنی ہے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں لوٹ مار اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے۔ اور ہماری قومی جدوجہد کا نتیجہ لُٹی ہوئی دکانیں اور ٹوٹے ہوئے سر ہوں۔ اُن کی فتح کا سب سے روشن پہلو یہ تھا۔ کہ انھوں نے پبلک کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ وہی لوگ جو پہلے اُن پر تمسخر کرتے تھے۔ اُن کا استقلال اور اُن کی جرأت دیکھ کر اُن کی امداد کے لئے نکل پڑے تھے۔ ذہنیت کی یہ تبدیلی یہ بیداری

ہی اُن کی اصلی فتح تھی۔

(۳)

تین دن گزر گئے تھے۔ بیربل سنگھ اپنے کمرہ میں بیٹھے چاء پی رہے تھے۔ اور ان کی بیوی مٹھن بائی بچے کو گود میں لئے سامنے کھڑی تھیں۔

بیربل سنگھ نے کہا۔ میں اُس وقت کیا کرتا۔ ؟ پیچھے ڈی۔ ایس۔ پی۔ کھڑا تھا۔ اگر جلوس کو راستہ دے دیتا تو اپنی جان مصیبت میں پھنستی۔

مٹھن بائی نے سر ہلا کر کہا۔ تم کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتے تھے۔ کہ ان پر ڈنڈے نہ چلاتے۔ کیا تمہارا کام آدمیوں پر ڈنڈے چلانا ہے۔ ؟ تم زیادہ سے زیادہ جلوس کو روک سکتے تھے۔ کل کو تمہیں مجرموں کو بید لگانے کا کام دیا جائے۔ تو شاید تمہیں بڑی خوشی ہوگی۔ کیوں۔ ؟

بیربل سنگھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ تم تو بات نہیں سمجھتی ہو۔!

مٹھن بائی۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ ڈی۔ ایس۔ پی پیچھے کھڑا تھا۔ تم نے خیال کیا ہوگا۔ کہ کارگزاری دکھانے کا ایسا موقع پھر کبھی ملے یا نہ ملے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اُس گروہ میں کوئی بھلا آدمی نہ تھا۔ ؟ اُس میں کتنے ہی آدمی ایسے تھے۔ جو تمہارے جیسوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ علم میں تو شائد زیادہ تر تم سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ مگر تم ان پر ڈنڈے چلا رہے تھے۔ اور اُنہیں گھوڑے سے کچل رہے تھے۔ واہ ری جوانمردی۔!

بیربل سنگھ نے بیحیائی کی ہنسی کے ساتھ کہا۔ صاحب نے میرا نام نوٹ کر لیا ہے۔ سچ!

داروغہ نے سمجھا تھا۔ یہ مژدہ جانفزا سنا کر وہ مٹھن بائی کو خوش کر لیں گے۔ شرافت اور اخلاق کی چشم نمایاں اس لفظ صریح کی تاب نہ لا سکیں گی۔

مگر منظن بائی کے چہرہ پر خوشی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ بولی۔ ضرور کر لیا ہوگا۔ اور شاید تمہیں جلد ترقی بھی مل جائے۔ مگر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر ترقی پائی تو کیا پائی۔ ! یہ تمہاری کارگزاری کا انعام نہیں۔ تمہاری غداری کی قیمت ہے۔ تمہاری کارگذاری کا انعام تو اس وقت ملے گا۔ جب تم کسی خونی کو کھوج نکالو گے۔ کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچا لو گے۔

یکایک ایک سپاہی نے برآمدہ میں کھڑے ہو کر کہا "حضور! یہ لفافہ لایا ہوں۔" بیربل سنگھ نے باہر نکل کر لفافہ لے لیا۔ اور اندر کی سرکاری چھٹی نکال کر پڑھنے لگے پڑھ کر اسے میز پر رکھ دیا۔

منظن نے پوچھا۔ کیا ترقی کا پروانہ آ گیا۔؟

بیربل سنگھ نے جھینپ کر کہا۔ تم تو بناتی ہو۔ آج پھر کوئی جلوس نکلنے والا ہے مجھے اس کے ساتھ رہنے کا حکم ہوا ہے۔

منظن۔ پھر تو تمہاری چاندی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ آج پھر ویسے ہی شکار ملیں گے۔ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ دکھانا۔ ڈی۔ ایس۔ پی بھی ضرور آوینگے اس مرتبہ تم انسپکٹر ہو جاؤ گے۔ سچ۔!

بیربل سنگھ نے جبیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ فرض کرو میں جا کر خاموش کھڑا رہوں۔ تو کیا نتیجہ ہوگا۔؟ میں نالائق سمجھا جاؤں گا۔ دوسری جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیجا جائے گا۔ کہیں شبہ ہو گیا۔ کہ مجھے سوراجیوں سے ہمدردی ہے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر برخاست نہ بھی ہوا تو لین کی حاضری تو ہو ہی جائے گی۔ آدمی جس دنیا میں رہتا ہے اسی کا چلن دیکھ کر کام کرتا ہے۔ میں عقلمند نہ سہی پر اتنا جانتا ہوں۔ کہ یہ لوگ ملک اور قوم کو آزاد کرانے کے لئے ہی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں

کہ سرکار اس خیال کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ایسا گدھا نہیں ہوں۔ کہ غلامی کی زندگی پر فخر کروں۔ لیکن حالت موجودہ سے مجبور ہوں۔

باجے کی آواز کانوں میں آئی۔ بیربل سنگھ نے باہر جا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا سوراجیوں کا جلوس آ رہا ہے۔ فوراً اوردی پہنی۔ صافہ باندھا اور جیب میں پستول رکھ کر باہر آئے۔ دم بھر میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ کانسٹبل پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ سب لوگ ڈبل مارچ کرتے ہوئے جلوس کی طرف روانہ ہوئے۔

(۴)

یہ لوگ کوئی پندرہ منٹ میں جلوس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بیشمار گلوں سے "بندے ماترم" کی ایک آواز نکلی گویا بادلوں میں گرج ہوئی ہو۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ اس جلوس میں کسی قدر فرق تھا۔ وہ سوراجیہ کے جشن کا جلوس نہ تھا۔ یہ ایک شہید کے ماتم کا۔ تین دن کے مسلسل بخار اور تکلیف کے بعد آج اس زندگی کا خاتمہ ہو گیا جس نے کبھی عہدے کی خواہش نہیں کی۔ کبھی منصب کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔ کہ میری لاش کو گنگا میں غسل دے کر دفن کیا جائے اور میرے مزار پر سوراجیہ کا جھنڈا نصب کیا جائے۔ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی سارے شہر پر ماتم کا پردہ سا پڑ گیا۔ جو سنتا تھا۔ ایک مرتبہ اس طرح چونک پڑتا تھا۔ گویا کہ اسے گولی سی لگ گئی ہو۔ اور فوراً ان کی زیارت کے لئے بھاگتا تھا۔ سارے بازار بند ہو گئے۔ یکہ اور تانگوں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا جیسے شہر لٹ گیا ہو۔ دیکھتے دیکھتے سارا شہر امنڈ پڑا۔ جس وقت جنازہ اٹھا۔ لاکھ سوا لاکھ آدمی ساتھ تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں

سے سُرخ نہ ہو۔

بیربل سنگھ اپنے کانسٹیبلوں اور سواروں کو پانچ پانچ گز کے فاصلہ پر جلوس کے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود پیچھے چلے گئے۔ پچھلی صفوں میں کوئی پچاس گز تک مستورات تھیں۔ داروغہ نے اُن کی طرف دیکھا۔ پہلی ہی قطار میں سُمتھن بائی نظر آئی۔ بیربل کو اعتبار نہ آیا۔ پھر غور کر کے دیکھا۔ وہی تھی۔ سمتھن نے اُن کی طرف ایکبار دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن اُس کی ایک چتون میں کچھ ایسی لعنت۔ کچھ ایسی شرم۔ کچھ ایسا درد اور کچھ ایسی نفرت بھری ہوئی تھی کہ بیربل سنگھ کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اپنی نگاہ میں کبھی ایسے ہلکے، اتنے کمزور اور اتنے ذلیل نہ ہوئے تھے۔

یکایک ایک عورت نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ کوتوال صاحب! کہیں ہم لوگوں پر ڈنڈے نہ چلا دیجیئے گا۔ آپ کو دیکھ کر ڈر ہو رہا ہے۔

دوسری بولی۔ آپ ہی کے تو کوئی بھائی تھے۔ جنہوں نے اس دن نال کے چوراہے پر ڈنڈوں کی بارش کی تھی۔

سمتھن نے کہا" آپ کے کوئی بھائی نہ تھے۔ آپ خود تھے"

بیسوں منہ سے آوازیں نکلیں۔ اچھا! یہ وہی صاحب ہیں۔!! صاحب۔ آپ کو آداب ہے! یہ آپ ہی کی نوازش کا نتیجہ ہے۔ کہ آج ہم بھی آپ کے ڈنڈے کی زیارت کے لئے آ کھڑی ہوئی ہیں۔"!

بیربل نے سمتھن بائی کی طرف آنکھوں کا بھالا چلایا۔ پر منہ سے کچھ نہ بولے۔

ایک تیسری خاتون نے پھر کہا۔ ہم ایک جلسہ کر کے آپ کو ہار پہنائینگے۔

ایک بڑھیا نے آنکھیں چڑھا کر کہا" میری کوکھ سے ایسا بچہ پیدا ہوتا تو اُس کی گردن مروڑ دیتی"

ایک نوجوان خاتون نے اُس کی سرزنش کرکے کہا "تم آپ بھی خوب کہتی ہیں ماتاجی! کتے تک تو نمک کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ تو آدمی ہیں۔"

بڑھیا نے جھلا کر کہا "آدمی نہیں! پیٹ کے غلام۔ ہائے پیٹ! ہائے پیٹ!!"

اس پر کئی عورتوں نے بڑھیا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور وہ بے چاری شرمندہ ہو کر بولی "ارے تو میں کچھ یہی تھوڑے ہی ہوں۔ مگر ایسا آدمی بھی کیا جو خودغرضی کے پیچھے اندھا ہو جائے۔"

بیربل سنگھ اب اور نہ سن سکے۔ گھوڑا بڑھا کر جلوس سے کئی گز پیچھے چلے گئے۔ مرد طعنے دے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ عورت طعنے دیتی ہے۔ تو ہم خفیف ہو جاتے ہیں۔ بیربل سنگھ کی اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر ان خاتونوں کے سامنے جاتے۔ اپنے افسروں پر غصہ آیا۔ مجھ کو ہی بار بار کیوں ان کاموں پر تعینات کیا جاتا ہے۔ اور لوگ بھی تو ہیں۔ انہیں کیوں نہیں بلایا جاتا۔ کیا میں ہی سب سے گیا گزرا ہوں؟ کیا میں ہی سب سے بے حس ہوں؟ متھی اس وقت مجھے دل میں کتنی قدر بزدل اور ذلیل سمجھ رہی ہوگی۔ شاید اس وقت مجھے کوئی مار بھی ڈالے تو وہ زبان نہ کھولے گی۔ غالباً دل ہی دل میں خوش بھی ہوگی۔ کہ اچھا ہوا۔ ابھی کوئی جا کر صاحب سے کہہ دے کہ بیربل سنگھ کی بیوی جلوس میں نکلی تھی۔ تو کہیں کا نہ رہوں۔ متھی جانتی ہے۔ سمجھتی ہے۔ پھر بھی نکل کھڑی ہوئی۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ کوئی فکر نہیں ہے نہ۔ جبھی تو یہ باتیں سوجھتی ہیں۔ یہاں سبھی بے فکرے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے لڑکے۔ مزدور۔ پیشہ ور۔ انہیں کیا فکر۔ موت تو ہم لوگوں کی ہے۔ جن کے بال بچے ہیں۔ اور کچھ عزت کا خیال ہے۔ سب کی سب میری طرف کیسا گھور رہی ہیں گویا کھا جائیں گی۔

جلوس شہر کی خاص سڑکوں سے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دونوں طرف چھتوں، چھجوں، جنگلوں اور درختوں پر تماشائیوں کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ بیربل سنگھ کو آج اُن کے چہروں پر ایک نئی امنگ، ایک نیا عزم اور ایک نئی شان جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُمنگ بڈھوں کے چہروں پر، عزم نوجوانوں کے، اور شان خاتونوں کے۔ اب اُن کے سفر کی منزل مقصود مفقود نہ تھی۔ گم گشتوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنا نہ تھا۔ پامالوں کی طرح سر جھکا کر رونا نہ تھا۔ آزادی کی سُنہری چھوٹی دور دراز آسمان پر چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ لوگوں کو درمیان کے نالوں اور جنگلوں کی پرواہ نہیں ہے۔ سب اس سُنہری منزل پر پہنچنے کے شوق میں بےچین ہو رہے ہیں۔

گیارہ بجتے بجتے جلوس دریا کے کنارے جا پہنچا۔ جنازہ اُتارا گیا۔ اور لوگ لاش کو گنگا اشنان کرانے کے لئے چلے۔ اس کی سرد، خاموش اور زرد پیشانی پر لاٹھی کی چوٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ سر کے بڑے بڑے بال خون جم جانے سے کسی مصور کے برش کی طرح جمٹ گئے تھے۔ کئی ہزار آدمی اس شہید کی آخری زیارت کے لئے حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیربل سنگھ پیچھے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ لاٹھی کی چوٹ انہیں بھی نظر آئی۔ اُن کی رُوح نے انہیں پُرزور ملامت کی۔ وہ لاش کی طرف نہ دیکھ سکے۔ منہ پھیر لیا۔ جس شخص کی زیارت کے لئے جس کی خاکِ پا کو پیشانی پر لگانے کے لئے۔ لاکھوں آدمی بےتاب ہو رہے ہیں۔ اس کی ہیں نے اتنی بےعزتی کی۔ اُن کی روح اس وقت اعتراف کر رہی تھی۔ کہ اس بےرحمانہ تشدد میں فرض کی ادائیگی کا شمہ بھی نہ تھا۔ صرف خود غرضی تھی۔ کارگزاری دکھانے کا جوش، اور افسروں کو خوش کرنے کی تمنا۔ ہزاروں آنکھیں غصہ سے بھری ہوئی اُن

کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

ایک کانسٹبل نے آکر تعریف کی۔ حضور کا ہاتھ گہرا پڑا تھا۔ ابھی تک کھوپڑی کھلی ہوئی ہے۔

بیربل نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ میں اسے اپنی جوانمردی نہیں، اپنا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔

کانسٹبل نے پھر خوشامد کی۔ بڑا سرکش آدمی تھا، حضور!

بیربل نے غصہ کے ساتھ کہا۔ چُپ رہو۔ جانتے بھی ہو سرکش کسے کہتے ہیں۔ سرکش وہ کہلاتے ہیں۔ جو ڈاکے مارتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں۔ خُون کرتے ہیں۔ انہیں سرکش نہیں کہتے جو ملک کی بہبودی کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لئے گھومتے ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ جن کی مدد کرنی چاہیئے۔ اُن کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ گھمنڈ کرنے اور خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ شرم کرنے اور رونے کی بات ہے۔

غسل ختم ہوا۔ جلوس یہاں سے پھر روانہ ہوا۔

(۵)

لاش کو جب خاک کے نیچے سُلا کر لوگ واپس ہوئے تو دو بج رہے تھے۔ متھن بائی عورتوں کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک آئی۔ پر کوئنس پارک میں آکر ٹھٹھک گئی۔ گھر جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ وہ بڈھا، زخمی، خون آلودہ چہرہ گویا اُس کے دل میں بیٹھا محبت کی بندشوں کو کاٹ رہا تھا۔ شوہر سے اس کا دل اس قدر پھر گیا تھا۔ کہ اب اُسے ملامت کرنے کی بھی اُس کی خواہش نہ تھی ایسے خود غرض آدمی پر خوف کے علاوہ اور کسی چیز کا اثر ہو سکتا ہے۔ اِس کا اُسے یقین ہی نہ تھا۔

وہ بڑی دیر تک پارک میں گھاس پر بیٹھی سوچتی رہی لیکن اپنے طرزِ عمل کا بھی فیصلہ قطعی نہ کر سکی۔ میکے جا سکتی تھی لیکن وہاں سے مہینہ دو مہینہ میں پھر اسی گھر میں آنا پڑے گا۔ نہیں، "میں کسی کی محتاج نہ بنوں گی۔ کیا میں اپنے گزر بسر کو بھی نہیں کما سکتی۔؟" اُس نے خود طرح طرح کی مشکلات کا خیال کیا۔ لیکن آج اُس کے دل میں نہیں معلوم اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ ان فرضی باتوں کا خیال کرنا ہی اُسے اپنی کمزوری معلوم ہوئی۔

یکایک اُسے ابراہیم علی کی بوڑھی بیوہ کا خیال آیا۔ اس نے سنا تھا کہ اُس کے لڑکے پاس نہیں ہیں۔ بیچاری اکیلی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ کوئی تسلّی دینے والا بھی پاس نہ ہوگا۔ وہ اُن کے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ پتہ اُس نے پہلے ہی اپنے ساتھ کی عورتوں سے دریافت کر لیا تھا۔ وہ دل میں سوچتی جاتی تھی۔ میں اُن سے کیسے ملوں گی۔؟ اُن سے کیا کہوں گی۔ انہیں کن لفظوں میں سمجھاؤں گی۔ انہیں خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ ابراہیم علی کے گھر پر پہنچ گئی۔ مکان ایک گلی میں تھا۔ صاف ستھرا لیکن دروازہ پر حسرت برس رہی تھی۔ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر قدم رکھا۔ سامنے برآمدہ میں ایک چارپائی پر وہ بوڑھی بیوہ بیٹھی ہوئی تھی جس کے شوہر نے آج آزادی کی لڑائی میں اپنی قربانی دی تھی۔ اس کے سامنے سادے کپڑے پہنے ایک نوجوان کھڑا آنکھوں میں آنسو بھرے بوڑھی سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ متھن اس نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ بیربل سنگھ تھے۔

اُس نے غصہ میں بھرے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ تم یہاں کیسے آئے؟

بیربل سنگھ نے کہا۔ اُسی طرح جیسے تم آئیں۔ اپنی خطا معاف کرانے آیا ہوں۔

منتھن بائی کے گورے چہرہ پر آج فخر، مسرت اور محبت کی پاکیزہ شگفتگی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہو گئی ہیں۔ اور یا مجھ سے زیادہ نصیبے ور عورت دنیا میں نہیں۔

مگر اس نے اپنی خوشی کو سرد مہری کے پردہ میں چھپا کر سخت لہجہ میں کہا، دنیا میں بعض ایسی خطائیں ہیں جن کی معافی ممکن نہیں۔ دبان خلق کی عدالت تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

بیربل نے ایک بار اس کی طرف پُرسوال نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو منتھی۔"

اس نے فوراً جیب سے پستول نکالا اور اپنے سینہ میں گولی مار لی۔ بوڑھی بیوہ چیخ کر اُسے سنبھالنے دوڑی مگر منتھن بائی اسی شگفتہ انداز سے کھڑی تھی۔

امتحان

(۱)

نادر شاہ کی فوج نے دلّی میں قتل عام کر رکھا ہے۔ راستوں میں خون کے دریا جاری ہیں۔ چاروں طرف قہر برپا ہے۔ بازار بند ہیں۔ اہلِ دلی مکانات کے دروازے بند کئے ہوئے زندگی کی خیریت منا رہے ہیں۔ کسی کی جان سلامت نہیں ہے۔ کہیں مکانوں میں آتشزدگی ہو رہی ہے، تو کہیں بازار لُٹ رہا ہے۔ کوئی کسی کی فریاد نہیں سُنتا۔ رئیسوں کی بیگمات محلوں سے نکالی جا رہی ہیں۔ اور اُن کی بے حُرمتی کی جاتی ہے۔ ایرانی سپاہیوں کی تشنگیٔ خُون کسی طرح نہیں بجھتی۔ انسانی نفس کی سنگدلی، شقاوت اور بہیمیت اپنی غضبناک ترین صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اِسی وقت نادر شاہ بادشاہی محل میں داخل ہوا۔

دِلّی اُن دِنوں عیش و عشرت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سجاوٹ اور تکلفات کے سامانوں سے رئیسوں کے محل پُر رہتے تھے۔ مستورات کو بناؤ سنگار کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ مردوں کو عیش پروری کے سوا دوسری کوئی فکر نہ تھی۔ ریاست کی جگہ شعر و شاعری نے لے لی تھی۔ صوبجات سے دولت کھنچ کھنچ کر دِلّی آتی اور پانی کی طرح بہائی جاتی۔ حُسن فروشوں کی چاندی تھی۔ کہیں تیتروں کے جوڑ

ہوتے تھے۔ کہیں بٹیروں اور بلبلوں کی پالیاں ٹھنتی تھیں۔ تمام شہر خوابِ عشرت میں غرق تھا۔ نادر شاہ شاہی محل میں پہنچا تو وہاں کا سامان دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس کی پیدائش ایک غریب گھر میں ہوئی تھی۔ اُس کی تمام عمر میدان جنگ میں گزری تھی۔ نفس پروری کا اُسے چسکا نہ لگا تھا۔ کہاں میدان جنگ کی سختیاں اور کہاں مجلس نشاط! جدھر آنکھیں اٹھتی تھیں اُدھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

شام ہوگئی تھی۔ نادر شاہ اپنے سرداروں کے ہمراہ محل کی سیر کرتا۔ اور اپنی پسند کی چیزوں پر دست درازیاں کرتا۔ دیوانِ خاص میں آکر کارچوبی مسند پر بیٹھ گیا۔ سرداروں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیدیا۔ اپنے سب ہتھیار کھول کر رکھ دیئے۔ اور محل کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا "میں شاہی بیگمات کا ناچ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم فوراً ان کو نفیس پوشاک اور مرصع زیورات سے آراستہ و پیراستہ کر کے میرے سامنے لاؤ۔ خبردار ذرا بھی توقف نہ ہو۔ میں کوئی عذر یا انکار نہیں سن سکتا۔!

(۲)

داروغہ نے یہ نادر شاہی حکم سنا تو ہوش اُڑ ہو گئے۔ وہ خواتین جن پر کبھی سورج تک کی نگاہ بھی نہ پڑی ہو۔ رقص تو درکنار کیونکر اس محفل میں آئیں گی؟! شاہی بیگمات کی اس قدر بے حرمتی کبھی نہ ہوئی تھی۔

اُف رے انسان بہ صورتِ شیطان! دلّی کو خون سے رنگ کر بھی تجھے سیری نہ ہوئی۔! مگر نادر شاہ کے روبرو ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا گویا کہ موت کو بلانا تھا۔ سر جھکا کر آداب بجالایا اور آکر محل سرا میں سب بیگمات کو نادر شاہی حکم سنا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اطلاع بھی دیدی کہ ذرا بھی تامّل نہ

ہو۔ نادرشاہ ذرا بھی عذر یا حیلہ نہ سنے گا۔ شاہی خاندان پر ایسی مصیبت کبھی نہ پڑی تھی۔ مگر اس وقت فاتح بادشاہ کا حکم بسر و چشم بجا لانے کے سوا جانبری کی کوئی دوسری تدبیر نہ تھی۔

بیگمات نے جونہی یہ حکم سنا اُن کی عقل زائل سی ہوگئی۔ محلسرا میں ماتم چھا گیا۔ ساری چہل پہل غائب ہوگئی۔ صدہا دلوں سے اُس ظالم کے لئے دعائے بد نکلنے لگی۔ کسی نے آسمان کی طرف نگاہ التجا سے دیکھا .... کسی نے خدا اور رسول کو یاد کیا۔ مگر ایک بھی بیگم ایسی نہ تھی جس کی نگاہ کٹار یا تلوار کی طرف گئی ہو۔ اگرچہ ان میں سے متعدد بیگمات کی رگوں میں راجپوتنیوں کا خون حرکت کر رہا تھا۔ مگر نفس پرستی نے "جوہار" کے پرانے جوش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ تن پروری خودداری کو تباہ کر دیتی ہے۔ آپس میں صلاح و مشورہ کرکے ننگ و ناموس کی حفاظت کے لئے کوئی طریقہ تجویز کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ایک ایک لمحہ قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ ناامید ہوکر سبھی بیگمات نے اس ظالم کے سامنے جانے کا تہیہ کیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا جا رہا تھا۔ اور مصیبت زدہ دلوں پر خوشبو کی مالش کی جا رہی تھی۔ کوئی بال گوندھواتی تھی۔ تو کوئی مانگوں میں موتی پردتی تھی۔ ایک بھی ایسے مصمم ارادہ کی بیوی نہ تھی۔ جو خدا پر یا اپنی ضد پر عدول حکمی کرنے کی ہمت کرتی۔

ایک گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ بیگمات پرے کے پرے زیورات سے جگمگاتی۔ اپنے منہ کی رونق سے بیلے اور گلاب کی کلیوں کو لجاتی۔ خوشبو کی لپٹیں اڑاتی۔ چھم چھم کرتی دیوانِ خاص میں آکر نادرشاہ کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

(۳)

نادر شاہ نے ایکبار کنکھیوں سے پریوں کے اس ہجوم کو دیکھا۔ اور تب مسند کے سہارے لیٹ گیا۔ اپنی تلوار اور کٹار سامنے رکھ دی۔ ایک آن میں اُس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اُس نے ایک انگڑائی لی۔ اور کروٹ بدلی ذرا دیر میں اُس کے خراٹوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ ایسا معلوم پڑنے لگا کہ گہری نیند سو گیا ہے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ پڑا سوتا رہا۔ اور بیگمات جیوں کی تیوں سر جھکائے دیوار کی تصویروں کی طرح کھڑی رہیں۔ ان میں دو ایک بیویاں جو ذرا بیخوف تھیں۔ اندرون نقاب سے نادر شاہ کو دیکھ بھی رہی تھیں اور آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں کیسی غضبناک صورت ہے! کتنی خونخوار آنکھیں ہیں! کتنا قوی ہیکل ہے! آدمی کیا ہے دیو ہے!

یکایک نادر شاہ کی آنکھیں کھُلیں۔ پریوں کا ہجوم پیشتر کی طرح کھڑا تھا۔ اُسے جاگتے دیکھ کر بیگموں نے سر نیچے کر لئے اور بدن کو سمیٹ کر بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے سے مل گئیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ اب یہ ظالم ناچنے گانے کو کہے گا۔ تب کیسے کیا ہوگا۔ خدا اس ظالم سے سمجھے! مگر ناچا تو نہ جائے گا۔ چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔ اب اس سے زیادہ ذلت برداشت نہ ہو سکے گی۔!

دفعتاً نادر شاہ کرخت لہجہ میں بولا۔ اے خُدا کی بندیو! میں نے تمہارا امتحان لینے کے لئے بلایا تھا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہاری نسبت میرا جو گمان تھا۔ وہ حرف بحرف سچ نکلا۔ جب کسی قوم کی عورتوں میں غیرت نہیں رہتی تو وہ قوم مُردہ ہو جاتی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم لوگوں میں ابھی کچھ غیرت باقی ہے یا نہیں۔ اسی لئے میں نے تمہیں یہاں بلایا تھا۔ میں تمہاری بے حرمتی

نہیں کرتا چاہتا تھا۔ میں اتنا عیش کا بندہ نہیں ہوں ورنہ آج بھیڑوں کے گلّہ
چَراتا ہوتا۔ نہ اس قدر ہوس پرست ہوں۔ ورنہ آج فارس میں سرود و ستار
کی تانیں سنتا ہوتا۔ جس کا مزہ میں ہندوستانی گانے سے کہیں زیادہ اٹھا سکتا
ہوں۔ مجھے صرف تمہارا امتحان لینا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر سچا ملال ہو رہا ہے۔
کہ تم میں غیرت کا جوہر باقی نہیں رہا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم میرے حکم کو پیروں
تلے کچل دیتیں؟ جب تم یہاں آ گئیں تب بھی میں نے تمہیں ایک موقع اور دیا۔
کہ میں نے نیند کا بہانہ کیا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم میں سے کوئی خدا کی بندی اس کٹار
کو اٹھا کر میرے جگر میں چبھا دیتی۔؟ میں کلام پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ
تم میں سے کسی کو کٹار پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوتی۔ میں ان نازک
ہاتھوں کے سامنے گردن جھکا دیتا۔ پر افسوس ہے کہ آج تیموری خاندان کی ایک
بیٹی بھی یہاں ایسی نہ نکلی جو اپنی حرمت بگاڑنے والے پر ہاتھ اُٹھاتی! اب یہ
سلطنت زندہ نہیں رہ سکتی! اس کی ہستی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ اس کا نشان
بہت جلد دنیا سے نیست و نابود ہو جائے گا۔ تم لوگ جاؤ اور اگر ہو سکے۔ تو
اب بھی سلطنت کو بچاؤ۔ ورنہ اسی طرح ہوس کی غلامی کرتے ہوئے دُنیا سے
رخصت ہو جاؤ۔

سزا

(۱)

شام کا وقت تھا - کچہری برخاست ہو گئی تھی - اہلکار اور چپراسی جیبیں کھنکھناتے گھر جا رہے تھے - خاکروب جگہ جگہ کوڑے ٹٹول رہا تھا - کہ شاید کہیں پیسے دھیلے مل جائیں - کچہری کے برآمدوں میں سانڈوں نے وکیلوں کی جگہ لے لی تھی - درختوں کے نیچے محرروں کی جگہ کتنے بیٹھے نظر آتے تھے - اسی وقت ایک بڈھا آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے لاٹھی ٹیکتا ہوا جنٹ صاحب کے بنگلہ پر پہنچا - اور سائبان میں کھڑا ہو گیا - جنٹ صاحب کا نام مسٹر جی - سنہا تھا -
اردلی نے دور ہی سے للکارا - کون سائبان میں کھڑا ہے ؟ کیا چاہتا ہے ؟

بڈھا - غریب باہمن ہوں بھیا ! صاحب سے بھینٹ ہو گی - ؟

اردلی - صاحب تم جیسوں سے نہیں ملا کرتے - !

بڈھا لاٹھی پر کمر سیدھی کر کے بولا "کیوں بھائی ! ہم سڑے ہیں - یا ڈاکو چور ہیں - یا ہمارے منہ میں کچھ لگا ہوا ہے " ؟

اردلی - بھیک مانگ کر مقدمہ لڑنے آئے ہوگے - ؟

بڈھا - تو کوئی برائی کی ہے ؟ اگر گھر بیچ کر مقدمہ نہیں لڑتے تو

کوئی گناہ کرتے ہیں؟ یہاں تو مقدمہ لڑتے لڑتے عمر گذر گئی۔ لیکن گھر کا پیسہ نہیں خرچا۔ میاں کی جوتی میاں کا سر کرتے ہیں۔ دس بھلے مانسوں سے مانگ کر ایک کو دیدیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گاؤں بھر نام سے کانپتا ہے۔ کسی نے ذرا بھی تڑ پڑ کی اور میں نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ سمجھتے کیا ہو۔!

اردلی۔ کسی بڑے آدمی سے سابقہ نہیں پڑا ابھی!

بڈھا۔ صاحب! کتنے ہی بڑوں کو بڑے گھر بھجوا دیا۔ تم ہو کس پھیر میں۔ سیدھا ہائیکورٹ تک جاتا ہوں۔ کوئی میرے منہ کیا آئے گا بیچارا؟ گانٹھ سے تو کوڑی جاتی نہیں، پھر ڈریں کیوں؟ جس کی جس چیز پر دانت لگائے اپنا کرکے چھوڑا۔ سیدھے سے نہ دیا تو عدالت میں گھسیٹ لائے۔ اور رگید رگید کر مارا۔ اپنا کیا بگڑتا ہے۔ تو صاحب سے اطلاع کرتے ہو کہ میں ہی پکاروں۔؟

اردلی نے دیکھا۔ یہ آدمی یوں ٹلنے والا نہیں۔ تو جا کر صاحب سے اس کی اطلاع کی۔ صاحب نے حلیہ دریافت کیا اور خوش ہو کر کہا۔ فوراً بلا لاؤ۔

اردلی۔ حضور! بالکل خستہ حال ہے۔

صاحب۔ گدڑی ہی میں لعل ہوتے ہیں۔ جا کر بھیجدو۔

مسٹر سنہا ادھیڑ آدمی تھے۔ بہت ہی حلیم۔ بہت ہی دور اندیش۔ باتیں بہت کم کرتے تھے۔ رعونت اور بدمزاجی جو حکومت کا جزو سمجھی جاتی ہے۔ اُن کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ انصاف اور رحم کے فرشتے معلوم ہوتے تھے۔ قیافہ شناس ایسے تھے کہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی پہچان جاتے تھے۔ ڈیل ڈول دیوؤں جیسا اور رنگ آبنوس کا سا۔ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے پیچوان پی رہے تھے۔ بڈھے نے جا کر سلام کیا۔

سنہا۔ تم ہو جگت پانڈے! آؤ بیٹھو! تمہارا مقدمہ تو بہت ہی کمزور

ہے۔ بھلے آدمی! جعل بھی نہ کرتے بنا۔؟

جگت۔ ایسا نہ کہیں حضور! غریب آدمی ہوں مر جاؤں گا۔

سنہا۔ کسی وکیل مختار سے صلاح بھی نہ لے لی۔؟

جگت۔ اب تو سرکار کی پناہ میں آیا ہوں۔

سنہا۔ سرکار کیا مِسل بدل دیں گے۔ یا نیا قانون بنائیں گے۔ تم دھوکا کھا گئے۔ میں کبھی قانون کے باہر نہیں جاتا۔ جانتے ہو نہ! کبھی اپیل سے میری تجویز ردّ نہیں ہوتی۔!

جگت۔ بڑا دھرم ہوگا سرکار! (سنہا کے پیروں پر گنّیوں کی ایک پوٹلی رکھ کر) بڑا دُکھی ہوں سرکار۔!!

سنہا۔ (مُسکرا کر) یہاں بھی اپنی چالبازی سے نہیں چوکتے۔؟ نکالو ابھی اور۔ اوس سے پیاس نہیں بجھتی۔ بھلا دہائی تو پوری کرو۔

جگت۔ بہت تنگ ہوں۔ دین بندھو!

سنہا۔ ڈالو ڈالو کمر میں ہاتھ۔ بھلا میرے نام کی تو عزت رکھو۔

جگت۔ لُٹ جاؤں گا سرکار!

سنہا۔ لٹیں تمہارے دشمن جو علاقہ بیچ کر لڑتے ہیں۔ تمہارے ججمانوں کا بھگوان بھلا کریں۔ تمہیں کس بات کی کمی ہے۔

مسٹر سنہا اس معاملہ میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تھے۔ جگت نے دیکھا کہ یہاں کائیاں پن سے کام نہ چلے گا۔ تو چپکے سے پانچ گنّیاں اور نکالیں لیکن انہیں مسٹر سنہا کے پیروں پر رکھتے وقت اُس کی آنکھوں سے خون نکل آیا۔ یہ اُس کی سالہا سال کی کمائی تھی۔ برسوں پیٹ کاٹ کر۔ تن جلا کر۔ خواہشات کو روک کر۔ جھوٹی گواہیاں دے کر یہ اندوختہ مہیا کیا تھا۔ اُس کا ہاتھوں سے

ذکلنا جان نکلنے سے کم صدمہ کی بات نہ تھی۔

جگت پانڈے کے چلے جانے کے بعد تقریباً نو بجے شب کے جنٹ صاحب کے بنگلہ پر ایک تانگہ آکر رُکا اور اُس پر سے پنڈت ستیہ دیو اُترے جو راجہ صاحب شیوپور کے مختار تھے۔

مسٹر سنہا نے مُسکرا کر کہا۔ آپ شاید اپنے علاقہ میں غریبوں کو نہ رہنے دیں گے۔ اتنا ظلم۔!

ستیہ دیو۔ غریب پرور! یہ کہئے کہ غریبوں کے مارے اب علاقہ میں ہمارا رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ زمیندار کو کچھ نہ کچھ سختی کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر اب یہ حال ہے کہ ہم نے ذرا چوں بھی کی تو انہیں غریبوں کی تیوریاں بدل جاتی ہیں۔ سب مفت میں زمین جوتنا چاہتے ہیں۔ لگان مانگئے تو فوجداری کا دعویٰ کرنے کو تیار!

اب اسی جگت پانڈے کو لیجئے۔ گنگا قسم حضور! سراسر جھوٹا دعویٰ ہے۔ حضور سے کوئی بات چھپی تو رہ نہیں سکتی۔ اگر جگت پانڈے یہ مقدمہ جیت گیا۔ تو ہمیں بوریا بندھنا چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ اب حضور ہی بسائیں تو بس سکتے ہیں۔ راجہ صاحب نے حضور کو سلام کہا ہے۔ اور عرض کی ہے کہ اس معاملہ میں جگت پانڈے کی ایسی خبر لیں کہ وہ بھی یاد کرے۔

مسٹر سنہا نے ابرو سکوڑ کر کہا۔ قانون میرے گھر تو نہیں بنتا۔؟

ستیہ دیو۔ حضور کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔

یہ کہہ کر گنّیوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔ مسٹر سنہا نے گڈی کو آنکھوں سے شمار کر کے فرمایا۔ انہیں میری طرف سے راجہ صاحب کی نذر کر دیجئے گا۔ آخر آپ کوئی وکیل تو کریں گے ہی۔ اُسے کیا دیجئے گا۔؟

ستیہ دیو۔ یہ تو حضور کے اختیار میں ہے جتنی ہی پیشیاں ہوں گی۔ اُتنا ہی صرفہ بڑھے گا۔

سنہا۔ میں چاہوں تو مہینوں لٹکا سکتا ہوں۔

ستیہ دیو۔ بیشک! اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔!

سنہا۔ پانچ پیشیاں بھی ہوئیں تو آپ کے کم سے کم ایک ہزار تو اُڑ ہی جائیں گے۔ آپ یہاں اُس کا آدھا ہی پورا کر دیجئے۔ تو ایک ہی پیشی میں فیصلہ ہو جائے گا۔ آدھی رقم بچ جائے گی۔

ستیہ دیو نے دس گنیاں نکال کر میز پر رکھ دیں اور فخر کے ساتھ بولے۔ حکم ہو تو راجہ صاحب سے کہہ دوں .... آپ اطمینان رکھیں۔ صاحب کی نظر عنایت ہو گئی ہے۔ مسٹر سنہا نے تیز آواز میں فرمایا۔ جی نہیں! یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی شرط پر یہ رقم نہیں لے رہا ہوں۔ میں کروں گا وہی جو قانون کی منشا ہو گی۔ خلاف قانون جو بھر بھی نہیں جا سکتا۔ یہی میرا اصول ہے۔ آپ لوگ میری خاطر کرتے ہیں۔ یہ آپ کی شرافت ہے۔ میں اُسے اپنا دشمن سمجھوں گا۔ جو میرا ایمان خریدنا چاہے۔ میں جو کچھ لیتا ہوں سچائی کا انعام سمجھ کر لیتا ہوں۔

(۳)

جگت پانڈے کو یقین کامل تھا۔ کہ میری جیت ہو گی۔ لیکن تجویز سُنی تو ہوش اُڑ گئے۔ دعویٰ خارج ہو گیا۔ اُس پر خرچ کی چپت علیٰحدہ۔ میرے ساتھ یہ چال! اگر لالہ صاحب کو اس کا مزا نہ چکھا یا تو برہمن نہیں۔ ہیں کس بھیر میں؟ سارا رعب بھلا دوں گا۔ یہاں گاڑھی کمائی کے روپیہ ہیں۔ کون ہضم کر سکتا ہے۔؟ ہڈیاں پھوڑ پھوڑ کر نکلیں گے۔ اسی دروازہ پر سر پٹک کر مر جاؤں گا۔

اُسی دن شام سے جگت پانڈے مسٹر سنہا کے بنگلہ کے سامنے مقیم ہو گئے

وہاں برگد کا ایک گھنا درخت تھا۔ مقدمہ والے وہیں ستّو چبینا کھاتے اور دوپہری اُسی کے سایہ میں گزارتے تھے۔ جگت پانڈے اُن سے مسٹر سنہا کی دل کھول کر ہجو کرتا۔ نہ کچھ کھاتا نہ پیتا۔ بس لوگوں کو اپنی رام کہانی سنایا کرتا۔ جو سُنتا وہ جنٹ صاحب کو چار بُری بھلی سُناتا اور کہتا آدمی نہیں شیطان ہے۔ اس کو تو ایسی جگہ مارے کہ جہاں پانی نہ ملے۔ روپیہ کے روپیہ لئے اوپر سے ڈگری معہ خرچ کر دی۔ یہی کرنا تھا تو روپیہ کاہے کو نگلے تھے! یہ ہے ہمارے بھائی بند۔ دل کا حال۔ یہ اپنے کہلاتے ہیں! ان سے تو انگریز اچھے۔ اسی طرح کی شکائیتیں دن بھر ہوا کرتیں۔ جگت پانڈے کے پاس دن بھر جمگھٹ سا لگا رہتا۔

اس طرح چار دن گزر گئے۔ مسٹر سنہا کو بھی خبر ہوئی۔ دیگر راشی اہلکاروں کی طرح آپ بھی شاندار آدمی تھے۔ ایسے بے فکر رہتے۔ گویا کہ اُن میں یہ بُرائی چھو بھی نہیں گئی ہے چنانچہ وہ قانون سے شمہ بھر بھی نہ ٹلتے تھے۔ تو اُن پر رشوت ستانی کا شک ہو ہی کیوں کر سکتا تھا۔ اور اگر کوئی کرتا بھی تو اُس کی مانتا کون؟ ایسے ہوشیار کھلاڑی کے خلاف کوئی ضابطہ کی کارروائی کیسے ہوتی؟ مسٹر سنہا اپنے افسروں سے بھی خوشامد کا برتاؤ نہ کرتے۔ اس سے حکام بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ مگر جگت پانڈے نے وہ منتر پھونکا تھا جس کا اُن کے پاس کوئی اُتار نہ تھا۔ ایسے بیڈھب آدمی سے آج تک انہیں سابقہ نہ پڑا تھا۔ اپنے نوکروں سے پوچھتے بڈھا کیا کہہ رہا ہے۔؟ نوکر لوگ یگانگت ظاہر کرنے کے لئے جھوٹ کے پُل باندھ دیتے۔ حضور! کہتا تھا! بھوت بن کر لگوں گا میری بیدی بنے تو سہی۔ جس دن مروں گا۔ ایک کے سو جگت پانڈے ہوں گے۔ مسٹر سنہا پکّے منکر تھے۔ مگر ان باتوں کو سُن سُن کر کچھ خوفزدہ سے ہو جاتے۔ اور اُن کی اہلیہ تو تھر تھر کانپنے لگتیں۔ وہ نوکروں سے بار بار کہتیں۔ اُس سے جا کر پوچھو کیا چاہتا ہے۔ جتنے روپیہ چاہے لے لے۔

پریم چالیسی

ہم سے جو مانگے دیں گے۔ بس یہاں سے چلا جائے۔ لیکن مسٹر سنہا آدمیوں کو اشارہ سے روک دیتے تھے۔ انہیں ابھی تک اُمید تھی کہ بڈھا بھوک پیاس سے عاجز آ کر چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ یہ ڈر تھا۔ کہ میں ذرا بھی نرم پڑا۔ اور نوکروں نے مجھے اُلّو بنایا۔

چھٹے دن معلوم ہوا کہ جگت پانڈے کا بول بند ہو گیا ہے۔ اُس سے ہلا تک نہیں جاتا۔ چپ چاپ پڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید آج رات کو دم نکل جائے۔ مسٹر سنہا نے لمبی سانس لی اور انتہائی فکر میں ڈوب گئے۔ اہلیہ نے چشم پُرآب ہو کر کہا: "تمہیں میرے سر کی قسم جا کر کسی طرح اس بلا کو ٹالو۔ بڈھا مر گیا۔ تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ اب روپیہ کا منہ نہ دیکھو دو چار ہزار بھی دینے پڑیں۔ تو دے کر اُسے راضی کرو۔ تمہیں جاتے شرم آتی ہو تو میں چلی جاؤں۔"

سنہا۔ جانے کا ارادہ تو میں کئی دن سے کر رہا ہوں۔ لیکن جب دیکھتا ہوں وہاں جماؤ لگا رہتا ہے۔ چاہے کتنی ہی بڑی آفت کیوں نہ آ پڑے۔ تم دو چار ہزار کو کہتی ہو۔ میں دس پانچ ہزار دینے کو تیار ہوں۔ لیکن وہاں جا نہیں سکتا۔ نہیں معلوم کیسی منحوس گھڑی میں میں نے اُس سے روپیہ لئے تھے۔ جانتا کہ یہ اتنا فساد کھڑا کرے گا۔ تو پھاٹک میں گھسنے ہی نہ دیتا۔ دیکھنے میں تو ایسا سیدھا معلوم ہوتا تھا کہ گئو ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ آدمی پہچاننے میں دھوکا کھایا۔

اہلیہ۔ تو میں ہی چلی جاؤں؟ شہر کی طرف سے آؤں گی۔ اور سب آدمیوں کو ہٹا کر کے علیحدہ باتیں کروں گی۔ کسی کو خبر نہ ہو گی کہ کون ہے۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔؟

مسٹر سنہا نے مشتبہ انداز سے کہا۔ تاڑنے والے تاڑ ہی جائیں گے، چاہے تم کتنا ہی چھپاؤ۔

اہلیہ ۔ تاڑ جائیں گے تاڑ جائیں ۔ اب اُس کو کہاں تک ڈریں ۔ بدنامی ابھی کیا کم ہو رہی ہے جو اور ہو جائے گی ۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم نے روپے لئے ۔ یونہی کوئی کسی پر جان نہیں دیتا ۔ پھر اب بیکار شان کیوں کرو ۔

مسٹر سنہا اب اندرونی خلش کو نہ دبا سکے ۔ بولے ۔ پیاری ! یہ بیکار کی ...... شان نہیں ہے ۔ چور کو عدالت میں بید کھانے سے یا عورت کو رسوائی سے اتنی شرم نہیں آتی ۔ جتنی کسی حاکم کو اپنی رشوت ستانی کا پردہ فاش ہونے سے آتی ہے ۔ وہ زہر کھا کر مر جائے گا ۔ لیکن دنیا کے سامنے اپنا پردہ فاش نہ کرے گا ۔ زندہ کھال کھنچنے یا کولہو میں پیلے جانے کے علاوہ اور کوئی ایسی سزا نہیں ہے ۔ جو اُس سے اپنے جُرم کا اقبال کرا سکے ۔ اس کا تو مجھے ذرا بھی ڈر نہیں ہے ۔ کہ برہمن بھوت بن کر ہمیں ستائے گا ۔ یا ہمیں اس کی بیدی بنا کر پوجنی پڑے گی ۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ گناہ کی سزا بھی اکثر نہیں ملتی ۔ لیکن برہم ہتیا سر پر لیتے ہوئے رُوح تھرّاتی ہے ۔ بس اتنی بات ہے ۔ میں آج رات کو موقع دیکھ کر جاؤں گا ۔ اور اس مصیبت کو ٹالنے کے لئے جو کچھ ہو سکے گا ، کروں گا ۔ اطمینان رکھو ۔!!

(۳)

آدھی رات گزر چکی تھی ۔ مسٹر سنہا گھر سے نکلے اور تنہا جگت پانڈے کو منانے چلے ۔ برگد کے نیچے بالکل سنّاٹا تھا ۔ تاریکی اس قدر تھی گویا کہ رات کی دیوی یہیں سو رہی ہو ۔ جگت پانڈے کی سانس زور زور سے چل رہی تھی ۔ گویا موت زبردستی گھسیٹے لئے جاتی ہو ۔ مسٹر سنہا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے بڈھا کہیں مر تو نہیں رہا ہے ۔؟ پاکٹ لیمپ نکالی اور جگت کے نزدیک جا کر بولے ۔ پانڈے جی ! کہو کیا حال ہے ۔؟

جگت پانڈے نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اُٹھنے کی ناکامیاب کوشش کرکے بولا۔ میرا حال پوچھتے ہو۔؟ دیکھتے نہیں ہو۔ مر رہا ہوں۔

سنہا۔ تو اس طرح کیوں جان دیتے ہو۔؟

جگت۔ تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کیا کروں۔؟

سنہا۔ میری تو یہ خواہش نہیں۔ ہاں تم البتہ میرا سب کچھ تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ آخر میں تمہارے ڈیڑھ سو روپے ہی تو لئے ہیں۔ اتنے روپوں کے لئے تم اتنا ستیاگرہ کر رہے ہو۔

جگت۔ ڈیڑھ سو روپے کی بات نہیں ہے۔ جی! تم نے مجھے مٹی میں ملا دیا۔ میری ڈگری ہو گئی ہوتی۔ تو مجھے دس بیگھہ زمین مل جاتی۔ اور سارے علاقہ میں نام ہو جاتا۔ تم نے میرے ڈیڑھ سو نہیں لئے۔ میرے پانچ ہزار بگاڑ دیئے۔ پُورے پانچ ہزار۔ لیکن یاد رکھنا یہ گھمنڈ نہ رہے گا۔ کہے دیتا ہوں۔۔۔۔ ستیاناش ہو جائے گا۔ اس عدالت میں تمہارا راج ہے۔ لیکن ایشور کے دربار میں برہمنوں کا ہی راج ہے۔ برہمن کی دولت لے کر کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔

مسٹر سنہا نے بہت افسوس اور شرم ظاہر کی۔ بہت خوشامد و رآمد سے کام لیا۔ اور آخر میں پوچھا۔ سچ بتلاؤ۔ پانڈو کتنے روپے پاجاؤ تو میرا قصور معاف کرو۔

جگت پانڈے اس مرتبہ زور لگا کر اُٹھ بیٹھے۔ اور بڑی بے صبری سے بولے "پانچ ہزار سے کوڑی کم نہ لوں گا۔"

سنہا۔ پانچ ہزار تو بہت ہوتے ہیں۔ اس قدر ظلم نہ کرو۔

جگت۔ نہیں! اس سے کم نہ لوں گا۔

مسٹر سنہا کو اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ روپے لانے گھر چلے۔ لیکن

گھر پہنچتے پہنچتے نیت بدل گئی۔ ڈیڑھ سو کے عوض پانچ ہزار دیتے قلق ہوا۔ دل میں کہنے لگے۔ مرتا ہے مرجانے دو۔ کہاں کی برہم ہتیا۔ اور کیسا پاپ! یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ بدنامی ہی نہ ہوگی۔؟ سرکاری ملازم تو یونہی بدنام ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ بچا کیسے اکڑ بیٹھے تھے۔ سمجھا ہوگا۔ اچھا اُلو پھنسا۔ اگر چھ دن کی فاقہ کشی سے پانچ ہزار ملیں تو میں مہینہ میں کم سے کم پانچ مرتبہ یہ عمل کروں۔ پانچ ہزار نہیں کوئی مجھے ایک ہی ہزار دیدے۔ یہاں تو مہینہ بھر ناک رگڑتا ہوں تب جاکے چھ سو کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔!

وہ چارپائی پر لیٹنا ہی چاہتے تھے۔ کہ اُن کی بیوی صاحبہ آکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ آنکھیں سہمی ہوئیں۔ رہ رہ کر کانپ اُٹھتی تھیں۔ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے بولیں۔ آدھی رات تو ہو گئی ہوگی۔؟ تم جگت پانڈے کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے ابھی ایسا بُرا خواب دیکھا ہے۔ کہ ابھی تک کلیجہ دھڑک رہا ہے۔ جان مصیبت میں پڑی ہوئی تھی۔ جا کے کسی طرح اسے ٹالو۔

مسٹر سنہا۔ وہیں سے تو چلا آرہا ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ فکر ہے۔ ابھی آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ تم آگئیں۔

بیوی۔ اچھا! تو تم گئے تھے! کیا باتیں ہوئیں۔ راضی ہوا۔؟

سنہا۔ پانچ ہزار روپیہ مانگتا ہے۔

بیوی۔ پانچ ہزار!

سنہا۔ کوڑی کم نہیں کرتا۔ اور میرے پاس اس وقت ایک ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے۔

بیوی صاحبہ نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ جتنا مانگتا ہے۔ اتنا ہی دیدو۔

کسی طرح گلو خلاصی تو ہو۔ تمہارے پاس روپئے نہ ہوں تو میں دیدوں گی۔ ابھی سے خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔ مرا تو جان کیسے بچے گی۔ پولتا چالتا ہے نہ ..؟

مسٹر سنہا آبنوس تھے تو اُن کی بیوی چندن! سنہا اُن کے غلام تھے۔ اُن کے اشاروں پر چلتے تھے۔ بیوی صاحبہ بھی سیاسیات زوجی میں ماہر تھیں جس بنچہری میں نفاق ہے جیسے کبھی بھولی نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے نفس پر اور آسن جمانا خوب جانتی ہے۔

سنہا۔ تو لاؤ دبتا آؤں۔ لیکن آدمی بڑا کائیاں ہے۔ کہیں روپے لے کر سب کو دکھاتا پھرے تو۔؟

بیوی۔ اس کو اسی وقت یہاں سے بھاگنا ہوگا۔!

سنہا۔ تو نکالو دے ہی دوں۔ زندگی بھر یہ بات یاد رہے گی۔

بیوی صاحبہ نے بے اعتباری کے انداز سے کہا۔ چلو میں بھی چلتی ہوں۔ اس وقت کون دیکھتا ہے۔

بیوی سے زیادہ شوہر کے محسوسات کا علم اور کسی کو نہیں ہوتا۔ مسٹر سنہا کے جذبات کو اُن کی بیوی صاحبہ خوب جانتی تھیں۔ کون جانے روپیہ لے کر راستہ میں کہیں چھپا دیں اور کہدیں کہ دے آئے۔ یا کہنے لگیں روپے لے کر بھی نہیں ٹلتا۔ تو میں کیا کروں گی۔ جا کر صندوق سے نوٹوں کے پلندے نکالے اور انہیں چادر میں چھپا کر مسٹر سنہا کے ساتھ چلیں۔ سنہا کے منہ پر جھاڑو سی پھری ہوئی تھی۔ لالٹین لئے پچھتاتے چلے جاتے تھے۔ پانچہزار نکلے جاتے ہیں! پھر اتنے روپے کب ملیں گے۔ کون جانتا ہے۔! اس سے تو کہیں اچھا تھا۔ کہ کمبخت مر ہی جاتا۔ بلا سے بدنامی ہوتی کوئی میری جیب سے روپے تو نہ چھین لیتا۔ ایشور کرے مر گیا ہو۔!

ابھی دونوں آدمی پھاٹک ہی تک آئے تھے کہ دیکھا جگت پانڈے لاٹھی ٹیکتا چلا آتا ہے۔ اُس کی صورت اتنی ہیبتناک تھی۔ گویا کہ قبرستان سے کوئی مردہ بھاگا چلا آتا ہو۔

ان کو دیکھتے ہی جگت پانڈے بیٹھ گیا۔ اور ہانپتا ہوا بولا۔ بڑی دیر ہوئی۔ لائے۔ ؟

بیوی صاحبہ بولیں۔ مہاراج! ہم تو آ ہی رہے تھے۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔ روپیہ لے کر سیدھے گھر چلے جاؤ گے نہ؟

جگت ۔ ہاں ہاں سیدھا گھر جاؤں گا۔ کہاں ہیں روپے دیکھوں!

بیوی صاحبہ نے نوٹوں کا پلندہ باہر نکالا اور لالٹین دکھا کر بولیں۔ گن لو پورے پانچہزار روپے ہیں۔ !

پانڈے نے پلندہ لیا اور اُلٹ پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمکنے لگیں۔ ہاتھوں میں نوٹوں کو تولتا ہوا بولا۔ پورے پانچہزار ہیں۔ !

بیوی ۔ پورے گن لو۔ ؟

جگت ۔ پانچہزار میں تو ٹوکری بھر جائے گی۔ (ہاتھوں سے بتلا کر) اتنے سارے ہوئے پانچہزار!

سنہا ۔ کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آتا۔ ؟

جگت ۔ ہیں ہیں۔ پورے ہیں پورے پانچہزار۔ تو اب جاؤں، بھاگ جاؤں۔ ؟

یہ کہہ کر وہ پلندہ لئے کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ جیسے کوئی شرابی۔ اور تب دھم سے زمین پر گر پڑا۔ مسٹر سنہا لپک کر اٹھانے دوڑے تو دیکھا۔ اُس کی

آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اور منہ زرد پڑ گیا ہے۔ بولے۔ پانڈے!..... پانڈے! کیا کہیں چوٹ آ گئی۔؟

پانڈے نے ایکبار منہ کھولا۔ جیسے مرتی ہوئی چڑیا سر لٹکا کر چونچ کھول دیتی ہے۔ زندگی کا آخری تاگا بھی ٹوٹ گیا۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اور نوٹوں کا پلندہ چھاتی پر رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں بیوی صاحبہ بھی آ پہنچیں اور لاش دیکھ کر چونک پڑیں۔

بیوی۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔؟

سنہا۔ مر گیا ہے۔ اور کیا ہو گیا؟

بیوی۔ (سر پیٹ کر) مر گیا! ہائے بھگوان۔ اب کہاں جاؤں۔!؟

یہ کہہ کر وہ بنگلہ کی طرف بڑی تیزی سے چلیں۔ مسٹر سنہا نے بھی نوٹوں کا پلندہ مردہ کی چھاتی پر سے اُٹھا لیا۔ اور چلے۔

بیوی۔ یہ روپے اب کیا ہوں گے۔؟

سنہا۔ خیرات کر دوں گا۔

بیوی۔ گھر میں مت رکھنا۔ خبردار! ہائے بھگوان!!

(۴)

دوسرے دن سارے شہر میں خبر مشہور ہو گئی۔ جگت پانڈے نے جنٹ صاحب پر جان دیدی اس کی لاش اٹھی۔ تو ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ مسٹر سنہا کو گھلم کھلا گالیاں دی جا رہی تھیں۔

شام کے وقت مسٹر سنہا کچہری سے آ کر بیٹھے تھے۔ کہ نوکروں نے آ کر کہا۔ سرکار ہم کو چھٹی دی جائے! ہمارا حساب کر دیجئے۔ ہماری برادری کے لوگ دھمکاتے ہیں۔ کہ تم اگر جنٹ صاحب کی نوکری کرو گے۔ تو حقہ، پانی بند

ہو جائے گا۔

سنہا نے جھلا کر کہا۔ کون دھمکاتا ہے۔؟

کہار۔ کس کس کا نام بتائیں سرکار۔! سبھی تو کہتے ہیں۔

رسوئیا۔ حضور! مجھے تو لوگ دھمکاتے ہیں کہ مندر میں نہ گھسنے پاؤ گے۔!

سنہا۔ ایک مہینہ کی نوٹس دیئے بغیر تم نہیں جا سکتے۔

سائیس۔ حضور! برادری سے بگاڑ کرکے ہم لوگ کہاں جائیں گے۔ ہمارا آج سے استعفا ہے۔ حساب جب چاہے کر دیجئے گا۔

مسٹر سنہا نے بہت دھمکایا۔ پھر دلاسا دینے لگے۔ لیکن نوکروں نے ایک نہ سنی۔ آدھ گھنٹہ کے اندر سبھوں نے اپنا اپنا راستہ لیا۔ مسٹر سنہا دانت پیس کر رہ گئے۔ لیکن حاکموں کا کام کب رکتا ہے۔ انھوں نے اسی وقت کوتوال کو خبر دی اور کئی آدمی بیگار میں پکڑ آئے۔ کام چل نکلا۔

اسی دن سے مسٹر سنہا اور ہندو سماج میں کشمکش شروع ہوگئی۔ دھوبی نے کپڑے دھونا بند کر دیئے۔ گوالے نے دودھ لانے میں پہلو تہی کی۔ حجام نے حجامت بنانا چھوڑا۔ ان مصیبتوں پر بیوی صاحبہ کا رونا دھونا اور بھی غضب تھا۔ انہیں روزانہ ڈراونے خواب دکھائی پڑتے۔ رات کو ایک کمرے سے دوسرے میں جاتے جان نکلتی تھی۔ کسی کا ذرا سر بھی درد کرتا۔ تو ناخونوں میں جان سما جاتی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی۔ کہ اپنے رشتہ داروں نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن سالے آئے۔ لیکن بغیر پانی پیئے واپس چلے گئے۔ اسی طرح ایک دن بہنوئی صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے پان تک نہ کھایا۔ مسٹر سنہا بڑے استقلال سے یہ ساری بے عزتی برداشت کرتے تھے۔ اب تک ان کا مالی

نقصان نہ ہوا تھا۔ غرض کے باوے جھک مار کر آتے ہی تھے۔ اور نذر و نذرانہ ملتا ہی تھا۔ پھر متفکر ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

لیکن اہل برادری سے نفاق کرنا پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا موقع ضرور ہی آجاتا ہے۔ جب ہم کو اہل برادری کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ مسٹر سنہا کو بھی سال بھر کے اندر ہی ایسا موقع آپڑا۔ یہ اُن کی لڑکی کی شادی تھی۔ یہی وہ معاملہ ہے کہ بڑے بڑے شان و شوکت والوں کا گھمنڈ چُور چُور کر دیتا ہے۔ آپ کسی کے آنے جانے کی پرواہ نہ کریں۔ حُقّہ، پانی، بھوج، بھات، میل جول۔ کسی بات کی پرواہ نہ کریں۔ مگر لڑکی کی شادی تو نہ ٹلنے والی بلا ہے۔ اُس سے بچکر آپ کہاں جائیں گے۔ مسٹر سنہا کو اس بات کا دغدغہ تو پہلے ہی سے تھا۔ کہ تربینی کی شادی میں رکاوٹیں پڑیں گی۔ لیکن انہیں اطمینان تھا۔ کہ دولت کی لاانتہا طاقت اس مشکل کو حل کر دے گی۔ کچھ دنوں تک انہوں نے جان بوجھ کر ٹالا کہ شاید اس آندھی کا زور کچھ کم ہو جائے۔ لیکن جب تربینی کا سولھواں سال ختم ہوا۔ تو ٹال مٹول کی گنجائش نہ رہی۔ پیغام بھیجنے لگے۔ لیکن جہاں پیغام جاتا وہیں جواب ملتا ہمیں منظور نہیں۔ جن گھروں میں سال بھر پیشتر اُن کا پیغام پاکر لوگ اپنی قسمت پر ناز کرتے۔ وہیں سے اب سوکھا جواب ملتا تھا ہمیں منظور نہیں۔ مسٹر سنہا دولت کا لالچ دیتے۔ زمین نذر کرنے کو کہتے۔ لڑکے کو ولایت بھیج کر اونچے درجہ کی تعلیم دلانے کی تجویز پیش کرتے۔ لیکن اُن کی ساری تجاویز کا ایک ہی جواب ملتا۔ ہم کو منظور نہیں۔ اعلیٰ خاندانوں کا یہ رویہ دیکھ کر مسٹر سنہا اُن خاندانوں میں پیغام بھیجنے لگے۔ جن کے ساتھ بیٹھ کر پیشتر انہیں کھانا کھانے میں بھی گریز تھا۔ لیکن وہاں بھی انہیں وہی جواب ملا۔ ہمیں منظور نہیں یہاں تک کہ کئی جگہ وہ خود دوڑ دوڑ کر گئے۔ لوگوں کی منتیں کیں۔ پر یہی جواب ملا۔

صاحب! ہمیں منظور نہیں۔

شاید برادری سے نکالے ہوئے خاندانوں میں اُن کا پیغام منظور کر لیا جاتا۔ پر مسٹر سنہا جان بوجھ کر مکھی نہیں نگلنی چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں سے رشتہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جن کا برادری میں کوئی شمار نہ تھا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔

مسز سنہا چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھیں۔ تربینی کھانا بنا رہی تھی۔ اور مسٹر سنہا بیوی کے پاس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ بار بار اُسے دیکھتے اور سوچنے لگتے تھے۔ بڑی دیر کے بعد روہنی نے آنکھیں کھولیں اور بولیں۔ اب نہ بچوں گی۔ پانڈے میری جان لیکر چھوڑے گا۔

"ہاتھ میں کیسا کاغذ ہے؟"

سنہا۔ لیشو وانندن کے پاس سے خط آیا ہے۔ پاجی کو یہ خط لکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ میں نے اس کی نوکری لگائی۔ شادی کرائی۔ اور آج اس کا مزاج اتنا بڑھ گیا ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میری لڑکی سے کرنا پسند نہیں کرتا۔ کمبخت کی قسمت کھل جاتی۔!

بیوی۔ بھگوان اب یہ چلو یہ دُرگت نہیں دیکھی جاتی..... انگور کھانے کو جی چاہتا ہے۔ منگوائے ہیں کہ نہیں۔؟

سنہا۔ میں خود جا کر لیتا آیا ہوں۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے انگور کی طشتری بیوی کے پاس رکھ دی۔ وہ اُٹھا اُٹھا کر کھانے لگیں۔ جب طشتری خالی ہو گئی۔ تو بولیں:۔ اب کس کے یہاں پیغام بھیجو گے۔؟

سنہا۔ کس کے یہاں بتلاؤں، میری سمجھ میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں

رہ گیا۔ ایسی برادری میں رہنے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے۔ کہ برادری کے باہر رہوں۔ میں نے ایک برہمن سے رشوت نا لی۔ اس سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن کون رشوت نہیں لیتا۔ اپنے موقع پر کوئی نہیں چوکتا۔ برہمن نہیں خود ایشور ہی کیوں نہ ہو۔ رشوت تو رُنہیں کبھی چوس ہی لیں گے۔

رشوت دہندہ اگر نا اُمید ہو کر جان دیدے۔ تو میری کیا خطا۔؟ اگر کوئی میرے فیصلہ سے ناراض ہو کر زہر کھائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس پر بھی میں اس کا کفارہ ادا کرنے کو تیار رہوں۔

برادری جو سزا دے اُسے منظور کرنے کو تیار رہوں۔ سب سے کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے جو کفارہ چاہو کرا لو........ پر کوئی نہیں سنتا۔ سزا خطا کے مطابق ہونی چاہیئے۔ نہیں تو یہ ناانصافی ہے۔

اگر کسی مسلمان کا چھوا ہوا کھانا کھانے کے لئے برادری مجھے بھور دربائے شور کی سزا دینا چاہے تو میں اُسے کبھی نہ مانوں گا۔ پھر خطا اگر ہے تو میری ہے۔ میری لڑکی نے کیا خطا کی ہے۔ میری خطا کے لئے میری لڑکی کو سزا دینا سراسر بعید از انصاف ہے۔

بیوی۔ مگر کر دگے کیا۔؟ کوئی پنچایت کیوں نہیں کرتے۔؟

سنہا۔ پنچایت میں بھی تو وہی برادری کے مکھیا لوگ ہی ہوں گے اُن سے مجھے انصاف کی امید نہیں۔ درحقیقت اس عتاب کا سبب حسد ہے۔ مجھے دیکھ کر سب جلتے ہیں۔ اور اسی بہانے سے مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں۔

بیوی۔ دل کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ یہ ارمان لئے دُنیا سے جانا پڑے گا۔ ایشور کی جیسی مرضی۔ تمہاری باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہ

میری بچی کی نہ جانے کیا حالت ہوگی۔

گمر تم سے میری آخری درخواست یہی ہے۔ کہ برادری سے باہر نہ جانا۔ نہیں تو پرلوک میں کبھی میری رُوح کو تسکین نہ ہوگی۔ یہی رنج میری جان لے رہا ہے۔

ہائے میری بچی!........ ہائے میری بچی......!!

گھاس والی

(۱)

ملیا ہری ہری گھاس کا گٹھا لے کر لوٹی تو اس کا گیہواں رنگ کچھ سرخ ہو گیا تھا۔ اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں کچھ سہمی ہوئی تھیں۔ مہابیر نے پوچھا کیا ہے ملیا۔؟ آج کیسا جی ہے۔؟ ملیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور منہ پھیر لیا۔

مہابیر نے قریب آ کر پوچھا۔ کیا ہوا ہے، بتاتی کیوں نہیں۔؟ کسی نے کچھ کہا ہے۔؟ اماں نے ڈانٹا ہے؟ کیوں اتنی اداس ہے۔؟

ملیا نے سسک کر کہا۔ کچھ نہیں ہوا کیا ہے۔ اچھی تو ہوں۔

مہابیر نے ملیا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔ چپ چاپ روتی رہے گی۔ بتائے گی نہیں۔

ملیا نے سرزنش کے انداز سے کہا۔ کوئی بات بھی ہو۔ کیا بتا دوں۔!

ملیا اس خارزار میں گل صد برگ تھی۔ گیہواں رنگ تھا۔ غنچہ کا سا منہ، بیضاوی چہرہ۔ ٹھوڑی کھچی ہوئی۔ رخساروں پر دلآویز سرخی، بڑی بڑی نکیلی پلکیں آنکھوں میں ایک عجیب التجا۔ ایک دلفریب معصومیت۔ ساتھ ہی ایک عجیب

کشش، معلوم نہیں، چاروں کے اس گھر میں یہ اپسرا کہاں سے آگئی تھی۔ کیا اس کا نازک پھول سا جسم اس قابل تھا۔ کہ وہ سر پر گھاس کی ٹوکری رکھ کر بیچنے جاتی۔ اس گاؤں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ جو اس کے تلووں کے نیچے آنکھیں بچھاتے تھے۔ اُس کی چتونوں کے لئے ترستے تھے۔ جن سے اگر وہ ایک بات بھی کرتی تو نہال ہو جاتے۔ لیکن ملیا کو آئے سال بھر سے زائد ہو گیا۔ کسی نے اُسے مردوں کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ وہ گھاس لینے نکلتی۔ تو اس کا گندمی رنگ طلوع کی سنہری کرنوں سے کندن کی طرح دمک اٹھتا۔ گویا بسنت اپنی ساری فرحت اور شگفتگی اور مستانہ پن لئے مسکراتی چلی جاتی ہو۔ کوئی غزلیں گاتا۔ کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھتا۔ پر ملیا آنکھیں نیچی کئے اپنی راہ چلی جاتی تھی۔ لوگ حیران ہو کر کہتے اتنا غرور! اتنی بے نیازی! مہابیر میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایسا جوان بھی تو نہیں۔ نہ جانے کیسے اُس کے ساتھ رہتی ہے۔ چاند میں گہن لگ جاتا ہوگا۔

مگر آج ایک ایسی بات ہوگئی۔ جو چاہے اس ذات کی دوسری نازنینوں کے لئے دعوت کا پیغام ہوتی۔ ملیا کے لئے زخم جگر سے کم نہ تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ ہوا آم کے بور کی خوشبو سے متوالی ہو رہی تھی۔ آسمان زمین پر سونے کی بارش کر رہا تھا۔ ملیا سر پر ٹوکری رکھے گھاس چھیلنے جا رہی تھی۔ کہ دفعتاً نوجوان چین سنگھ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ ملیا نے چاہا۔ کہ کترا کر نکل جائے۔ مگر چین سنگھ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا:۔ ملیا! کیا تجھے مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔

ملیا کا وہ پھول سا چہرہ شعلہ کی طرح دہک اٹھا۔ وہ ذرا بھی نہیں ڈری۔ ذرا بھی نہیں جھجکی۔ جھوا زمین پر گرا دیا۔ اور بولی:۔ مجھے چھوڑ دو،

نہیں تو میں چلاتی ہوں۔

چین سنگھ کو آج زندگی میں یہ نیا تجربہ ہوا۔ نیچی ذاتوں میں حسن کا اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کا کھلونا بنے۔ ایسے کتنے ہی معرکے اُس نے جیتے تھے۔ پر آج مُلیا کے چہرے کا وہ رنگ، وہ غصہ، وہ غرور، وہ تمکنت دیکھ کر اُس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اُس نے خفیف ہو کر اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مُلیا تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا۔ زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ تو ٹیس ہونے لگتی ہے۔ مُلیا جب کچھ دور نکل گئی۔ تو غصہ اور خوف اور اپنی بیکسی کے احساس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے کچھ دیر تک توضبط کیا۔ پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اگر وہ اتنی غریب نہ ہوتی۔ تو کسی کی مجال تھی کہ اس طرح اس کی آبرو لوٹ لیتا۔ وہ روتی جاتی تھی اور گھاس چھیلتی جاتی تھی۔ مہابیر کا غصہ وہ جانتی تھی۔ اگر اُس سے کہہ دے تو وہ اس ٹھاکر کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو! اس خیال سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اسی لئے اس نے مہابیر کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

(۲)

دوسرے دن مُلیا گھاس کے لئے نہ گئی۔ ساس نے پوچھا۔ تو کیوں نہیں جاتی۔ اور سب تو چلی گئیں۔ مُلیا نے سر جھکا کر کہا۔ میں اکیلی نہ جاؤں گی۔

ساس نے کہا۔ اکیلے کیا تجھے باگھ اُٹھا لے جائے گا۔ کیوں اوروں کے ساتھ نہیں چلی گئی۔

مُلیا نے اور بھی سر جھکا لیا۔ اور نہایت دبی ہوئی آواز میں بولی۔ میں اوروں کے ساتھ نہ جاؤں گی۔

ساس نے ڈانٹ کر کہا۔ نہ تو اوروں کے ساتھ جائے گی، نہ اکیلی جائے گی، تو پھر کیسے جائے گی ۔؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ میں نہ جاؤنگی۔ تو یہاں میرے گھر میں رانی بن کر نباہ نہ ہوگا۔ کسی کو چام نہیں پیارا ہوتا۔ کام پیارا ہوتا ہے۔ تو بڑی سندر ہے تو تیری سندرتا لے کر چاٹوں۔ اُٹھا چھوا اور جا گھاس لا۔

دروازہ پر نیم کے درخت کے سایہ میں کھڑا مہابیر گھوڑے کو مل رہا تھا۔ اس نے ملیا کو رونی صورت بنائے جاتے دیکھا۔ پر کچھ بول نہ سکا ۔ اُس کا بس چلتا تو ملیا کو کلیجہ میں بٹھا لیتا۔ آنکھوں میں چُرا لیتا۔ لیکن گھوڑے کا پیٹ بھرنا تو ضروری تھا۔ گھاس مول لے کر کھلائے تو بارہ آنے سے کم خرچ نہ ہوں۔ ایسی مزدوری ہی کیا ملتی ہے۔ مشکل سے ڈیڑھ دو روپے۔ وہ بھی کبھی ملے کبھی نہ ملے۔ بُرا ہو ان موٹر لاریوں کا۔ اب یکے کو کون پوچھتا ہے مہاجن سے ڈیڑھ سو روپے قرض لے کر یکہ اور گھوڑا خریدا تھا۔ اس کے سُود کے بھی نہیں پہنچتے۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ ظاہرداری کی۔ نہ جی چاہتا ہو نہ جا، دیکھی جائے گی ۔

ملیا نہال ہو گئی۔ آبگوں آنکھوں میں محبت کا سرور چھلک اٹھا۔ بولی۔ گھوڑا کھائے گا کیا ۔؟

آج اُس نے کل کا راستہ چھوڑ دیا اور کھیتوں کی بینڈھوں سے ہوتی ہوئی چلی۔ بار بار خائف نظروں سے اِدھر اُدھر تاکتی جاتی تھی۔ دونوں طرف اوکھ کے کھیت کھڑے تھے۔ ذرا بھی کھڑکھڑاہٹ ہوتی تو اُس کا جی سن سے ہو جاتا۔ کوئی اوکھ میں چھپا بیٹھا نہ ہو۔ مگر کوئی نئی بات نہ ہوئی۔ اوکھ کے کھیت نکل گئے۔ آموں کا باغ نکل گیا۔ سینچے ہوئے کھیت نظر آنے لگے۔

دُور ایک کنوئیں پر پُرچل رہا تھا۔ کھیتوں کی مینڈھوں پر ہری ہری گھاس جمی ہوئی تھی۔ ملیا کا جی للچا یا۔ یہاں آدھ گھنٹہ میں جتنی گھاس چھیل سکتی ہے۔ اتنی خشک میدان میں دوپہر تک بھی نہ چھیل سکے گی۔ یہاں دیکھتا ہی کون ہے۔؟ کوئی پکاریگا تو چپکے سے سرک جاؤں گی۔ وہ بیٹھ کر گھاس چھیلنے لگی۔ اور ایک گھنٹہ میں اس کا جھابا آدھے سے زیادہ بھر گیا۔ اپنے کام میں اتنی محو ہو گئی کہ اُسے چین سنگھ کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ یکایک آہٹ پا کر سر اٹھایا تو چین سنگھ کھڑا تھا۔

مُلیا کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ جی میں آیا بھاگ جائے۔ جھابا وہیں اُلٹ دے اور خالی جھابا لے کر چلی جائے۔ پر چین سنگھ نے کئی گز کے فاصلہ ہی پر رُک کر کہا۔ ڈر مت، ڈر مت، بھگوان جلنے میں تجھ سے کچھ نہ بولوں گا۔ خوب چھیل لے۔ میرا ہی کھیت ہے۔

مُلیا کے ہاتھ مفلوج سے ہو گئے۔ کھرپی ہاتھ میں جم سی گئی۔ گھاس نظر ہی نہ آتی تھی۔ جی چاہتا تھا دھرتی پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں' زمین آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی۔

چین سنگھ نے دلاسا دیا۔ چھیلتی کیوں نہیں۔ میں تجھ سے کچھ کہتا تھوڑا ہی ہوں۔ یہیں روز چلی آیا کر۔ میں چھیل دیا کروں گا۔

مُلیا بُت بنی بیٹھی رہی۔ اُس کے سینے میں اب اتنی دھڑکن نہ تھی۔

چین سنگھ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بولا۔ تو مجھ سے اتنا کیوں ڈرتی ہے۔ کیا تو سمجھتی ہے۔ میں تجھے ستانے آیا ہوں۔ ایشور جانتا ہے۔ کل بھی تجھے ستانے کے لئے تیرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ تجھے دیکھ کر آپ ہی آپ ہاتھ بڑھ گئے۔ مجھے کچھ سُدھ ہی نہ رہی۔ تو چلی گئی تو میں وہیں بیٹھ کر گھنٹوں روتا رہا۔ جی میں آتا تھا اس ہاتھ کو کاٹ ڈالوں۔ کبھی جی چاہتا تھا زہر کھالوں۔

تبھی سے تجھے ڈھونڈھ رہا ہوں ۔ آج تو اِدھر سے چلی آئی ۔ میں سارے ہار میں مارا مارا پھرا کیا ۔ اب جو سزا تیرے جی میں آوے دے ۔ اگر تو میرا سر بھی کاٹ لے تو گردن نہ ہلاؤں گا ۔ میں شہدا ہوں ۔ لُچا ہوں لیکن جب سے تجھے دیکھا ہے ۔ نہ جانے کیوں میرے من کی ساری کھوٹ مٹ گئی ۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے ۔ کہ تیرا کُتا ہوتا اور تیرے پیچھے پیچھے چلتا ۔ تیرا گھوڑا ہوتا تب تو تو کبھی کبھی میرے منہ پر ہاتھ پھیرتی ۔ تو مجھ سے کچھ بولتی کیوں نہیں ۔ کسی طرح یہ چولا تیرے کام آوے ۔ میرے من کی یہی سب سے بڑی لالسا ہے ۔ روپیہ، پیسہ، اناج، پانی ۔ بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے ۔ بس تیری دیا چاہتا ہوں ۔ میری جوانی کام نہ آوے ۔ اگر میں کسی کھوٹ سے یہ باتیں کر رہا ہوں ۔ بڑا بھاگوان تھا ۔ مہابیر کہ ایسی دیوی اُسے ملی ۔

مُلیا چُپ چاپ سُنتی رہی ۔ پھر سر نیچا کر کے بھولے پن سے بولی ۔ تو تم مجھے کیا کرنے کہتے ہو ۔؟

چین سنگھ نے اور قریب آ کر کہا بس تیری دیا چاہتا ہوں ۔

مُلیا نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا ۔ اُس کا شرمیلا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا ۔ چبھتے ہوئے لفظوں میں بولی تم سے ایک بات پوچھوں ۔ بُرا تو نہ مانوگے ؟ تمہارا بیاہ ہو گیا ہے یا نہیں ۔؟

چین سنگھ نے دبی زبان سے کہا ۔ بیاہ تو ہو گیا ہے مُلیا ! لیکن بیاہ کیا ہے ۔ کھلواڑ ہے ۔

مُلیا کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہو گیا ۔ بولی ۔ اگر اسی طرح مہابیر تمہاری عورت کو چھیڑتا تو تمہیں کیسا لگتا ؟ تم اُس کی گردن کاٹنے پر تیار ہو جاتے کہ نہیں ۔؟

بولو! کیا سمجھتے ہو مہا بیر چمار ہے تو اس کے بدن میں لہو نہیں ہے۔ شرم نہیں آتی ہے۔ اپنی اجّت آبرو کا کھیال نہیں ہے۔! میرا رُوپ رنگ تمہیں بھاتا ہے۔ کیا مجھ سے بہت سُندر عورتیں شہر میں، ندی کے گھاٹ پر، نہیں گھوما کرتیں۔ میرا منہ اُن کے تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔ تم اُن میں سے کسی سے کیوں دیا نہیں مانگتے۔؟ کیا اُن کے پاس دیا نہیں ہے مگر تم وہاں نہ جاؤ گے۔ کیونکہ وہاں جاتے تمہاری چھاتی دہلتی ہے۔ مجھ سے دیا ملتے مانگتے ہو۔ اسی لئے تو کہ میں چمارن ہوں، نیچ جات ہوں۔ اور نیچ جات کی عورت جراسی آرجو منتی، یا جراسے لالچ، یا جراسی گھُڑکی دھمکی سے کابو میں آجاتی ہے۔ کتنا سستا سودا ہے! ٹھاکر ہو نہ، ایسا سستا سودا کیوں چھوڑنے لگے۔

چین سنگھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بلکہ سیکڑوں جُوتے پڑ گئے۔ خفت آمیز لہجہ میں بولا۔ یہ بات نہیں ہے مُلیا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اس میں اونچ نیچ کی بات نہیں ہے۔ سب آدمی برابر ہیں۔ میں تو تیرے چرنوں پر سر رکھنے کو تیار ہوں۔

مُلیا طنز سے بولی۔ اسی لئے تو کہ جانتے ہو میں کچھ کر نہیں سکتی۔ جا کر کسی کھترانی یا ٹھکرائن کے چرنوں پر سر رکھو تو معلوم ہو کہ چرنوں پر سر رکھنے کا کیا پھل ملتا ہے۔ پھر یہ سر تمہاری گردن پر نہ رہے گا۔

چین سنگھ مارے شرم کے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اس کا منہ اتنا خشک ہو گیا تھا۔ جیسے مہینوں کی بیماری کے بعد اٹھا ہو۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ مُلیا اتنی ذی فہم ہے۔ اس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔

مُلیا نے پھر کہا۔ میں بھی روز بجار جاتی ہوں۔ بڑے بڑے گھروں کا حال جانتی ہوں۔ مجھے کسی بڑے گھر کا نام بتا دو۔ جس میں کوئی سائیس، کوئی کوچوان، کوئی کہار، کوئی پنڈا، کوئی مہراج نہ گھُسا بیٹھا ہو۔ یہ بھی بڑے گھروں کی

بیلا ہے۔ اور وہ عورتیں جو کچھ کرتی ہیں ٹھیک کرتی ہیں۔ اُن کے مرد بھی تو چار لوں اور کہار لوں پر جان دیتے پھرتے ہیں۔ لینا دینا برابر ہو جاتا ہے۔ بیچارے گریب آدمیوں کے لئے یہ راگ رنگ کہاں۔ ؟ مہابیر کے لئے سنسار میں جو کچھ ہوں میں ہوں۔ وہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ سنجوگ کی بات ہے۔ کہ میں جرا سُندر ہوں۔ لیکن میں کالی کلوٹی ہوتی تب بھی مہابیر مجھے اسی طرح رکھتا۔ اس کا مجھے بھروسا ہے۔ میں چمارن ہو کر بھی اتنی کمینہ نہیں ہوں۔ کہ جو اپنے اوپر بھروسے کرے۔ اُس کے ساتھ دگا کروں۔ ہاں مہابیر اپنے من کی کرنے لگے۔ میری چھاتی پر مونگ دلے۔ تو میں بھی اس کی چھاتی پر مونگ دلوں گی تم میرے رُوپ ہی کے دیوانے ہو نہ ؟ آج مجھے ماتا نکل آئے۔ کالی ہو جاؤں، تو میری طرف تاکو گے بھی نہیں۔ بولو جھوٹ کہتی ہوں۔ ؟

چین سنگھ انکار نہ کر سکا۔

مُلیا نے اُسی ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ لیکن میری ایک نہیں، دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں۔ تب بھی مہابیر کی آنکھ نہ پھرے گی۔ مجھے اُٹھا دے گا۔ بٹھا دے گا۔ کھلا دے گا۔ سلا دے گا۔ کوئی ایسی سیوا نہیں ہے۔ جو وہ اُٹھا رکھے۔ تم چاہتے ہو۔ میں ایسے آدمی سے دگا کروں۔ جاؤ۔ اب مجھے کبھی نہ چھیڑنا۔ نہیں اچھا نہ ہو گا۔

(۳)

جوانی کا جوش ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے، رحم ہے، قوت ہے۔ اور وہ سب کچھ جو زندگی کو روشن، پاکیزہ اور مکمل بنا دیتا ہے۔ جوانی کا نشہ ہے، نفس پروری ہے۔ رعونت ہے۔ ہوس پرستی ہے۔ خود مطلبی ہے۔ اور وہ سب کچھ جو زندگی کو بہیمیت، زوال اور بدی کی جانب لے جاتا ہے۔ چین سنگھ پر

جوانی کا نشہ تھا۔ ملیا نے ٹھنڈے چھینٹوں سے نشہ اُتار دیا۔ عورت جتنی آسانی سے دین اور ایمان کو غارت کر سکتی ہے۔ اتنی ہی آسانی سے اُن کو قوت بھی عطا کر سکتی ہے۔ وہی چین سنگھ جو بات بات پر مزدوروں کو گالیاں دیتا تھا۔ آسامیوں کو پیٹتا تھا اب اتنا خلیق، اتنا متحمل، اتنا منکسر ہو گیا تھا۔ کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن شام کو چین سنگھ کھیت دیکھنے گیا۔ پُر چل رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک جگہ نالی ٹوٹ گئی ہے۔ اور سارا پانی بہا چلا جا رہا ہے۔ کیاری میں بالکل پانی نہ پہنچتا تھا۔ مگر کیاری برانے والی عورت چُپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے اس کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ کہ پانی کیوں نہیں آتا۔ پہلے یہ لاپروائی دیکھ کر چین سنگھ آپے سے باہر ہو جاتا۔ اُس عورت کی پورے دن کی مزدوری کاٹ لیتا اور پُر چلانے والوں کو گھڑکیاں جماتا۔ پر آج اُسے غصہ نہیں آیا۔ اُس نے مٹی لے کر نالی باندھ دی۔ اور بڑھیا کے پاس جا کر بولا۔ تو یہاں بیٹھی ہے اور پانی سب بہا جا رہا ہے۔

بڑھیا کی رُوح فنا ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ابھی کھُل گئی ہو گی۔ راجہ میں جا کر بند کئے دیتی ہوں۔

بڑھیا کو تھر تھر کانپتے دیکھ کر چین سنگھ نے اس کی دلجمی کرتے ہوئے کہا۔ بھاگ مت! میں نے نالی بند کر دی ہے۔ بڑھو کئی دن سے نہیں دکھائی دیئے کہیں کام دھندا کرنے جاتے ہیں کہ نہیں۔ ؟

بڑھیا کا سکڑا ہوا چہرہ چکنا ہو گیا۔ بولی۔ آج کل تو ٹھالی ہی بیٹھے ہیں۔ بھیا! کہیں کام نہیں لگتا۔

چین سنگھ نے نرمی سے کہا۔ تو ہمارے یہاں لگ جاوے۔ تھوڑا سا سن

رکھا ہے۔ کاٹ دیں۔

یہ کہتا ہوا وہ کنوئیں کی جانب چلا گیا۔ وہاں چار پُرچل رہے تھے۔ پر اس وقت دو ہکوے بیر کھانے گئے ہوئے تھے۔ چین سنگھ کو دیکھتے ہی باقی مزدوروں کے ہوش اُڑ گئے۔ اگر ٹھاکر نے پوچھا دو آدمی کہاں گئے۔ تو کیا جواب دیں گے۔ سب کے سب ڈانٹے جائیں گے۔ بچارے دل میں سہمے جا رہے تھے۔ کہ دیکھیں سر پر کون آفت آتی ہے۔

چین سنگھ نے پوچھا۔ وہ دونوں کہاں گئے۔؟

ایک مزدور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ دونوں کسی کام سے ابھی ابھی چلے گئے ہیں بھیا!

دفعتاً دونوں مزدور دھوتی کے ایک کونے میں بیر بھرے آتے دکھائی دیئے۔ دونوں خوش خوش چلے آرہے تھے۔ چین سنگھ پر نگاہ پڑی۔ تو پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ اب نہ آتے بنتا ہے۔ نہ جاتے۔ دونوں سمجھ گئے۔ کہ آج بے طرح مار پڑی۔ شاید مزدوری بھی کٹ جائے۔ کشمکش و ترجیح کی حالت میں کھڑے تھے۔ کہ چین سنگھ نے پکارا۔ آؤ! بڑھ آؤ! کیسے بیر ہیں۔؟ ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔ میرے ہی باغ کے ہیں نہ؟

دونوں اور بھی تھر تھرا اُٹھے۔ آج ٹھاکر جینا نہ چھوڑے گا۔ شاید سر کے بال بھی نہ بچیں۔ بھگو بھگو کر لگائے گا۔

چین سنگھ نے پھر کہا۔ جلدی سے آؤ جی، کھڑے کیا ہو۔ مگر پکّی پکّی سب میں لے لوں گا۔ مجھے دیتا ہوں۔ ذرا ایک آدمی لپک کر گھر سے تھوڑا سا نمک تو لے لو۔ (مزدوروں سے) چھوڑ دو پُر، آؤ بیر کھاؤ۔ اس باغ کے بیر بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ کام تو کرنا ہی ہے۔

دونوں خطاواروں کو اب کچھ تشفی ہوئی۔ آکر سارے بیر چین سنگھ کے سامنے رکھ دیئے۔ ایک مزدور نمک لانے دوڑا۔ ایک نے کنوئیں سے لٹیا ڈور سے پانی نکالا۔ چین سنگھ جس سے کا پانی نہ پیتا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک چاروں پر بند رہے بسجھوں نے خوب بیر کھائے۔ جب سب بیر اُڑ گئے۔ تو ایک مجرم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھیا جی! آج جان بکسی ہو جائے۔ بڑی بھوکھ لگی تھی۔ نہیں تو کام چھوڑ کر نہ جاتے۔

چین سنگھ نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ تو اس میں بُرائی کیا ہوئی ہیں نے بھی تو بیر کھائے۔ آدھ گھنٹہ کا ہرج ہوا۔ اتنا ہی تو۔ تم چاہوگے تو گھنٹہ بھر کا کام آدھ گھنٹہ میں کر لوگے۔ نہ چاہوگے تو دن بھر میں بھی گھنٹہ بھر کا کام نہ ہوگا۔

چین سنگھ چلا گیا، تو چاروں باتیں کرنے لگے۔

ایک نے کہا۔ مالک اس طرح رہے تو کام کرنے میں جی لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہر دم چھاتی پر سوار۔!

دوسرا۔ میں نے تو سمجھا آج کچا ہی کھا جائے گا۔

تیسرا۔ کئی دن سے دیکھتا ہوں۔ مجاج کچھ نرم ہو گیا ہے۔

چوتھا۔ سانجھ کو پوری مجوری ملے تو کہنا۔

پہلا۔ تم تو ہو گوبر گنیس۔ آدمی کا رُکھ نہیں پہچانتے۔

دوسرا۔ اب خوب دل لگا کر کام کریں گے۔

تیسرا۔ جب انھوں نے ہمارے اوپر چھوڑ دیا۔ تو ہمارا بھی دھرم ہے۔ کہ اپنا کام سمجھ کر کام کریں۔

چوتھا۔ مجھے تو بھیّا ٹھاکر پر اب بھی بسواس نہیں آتا۔

(۴۷)

ایک دن چین سنگھ کو کسی کام سے کچہری جانا تھا۔ پانچ میل کا سفر تھا۔ یوں تو وہ برابر اپنے گھوڑے پر جایا کرتا تھا۔ پر آج دھوپ تیز تھی۔ سوچا یکے پر چلا چلوں۔ مہابیر کو کہلا بھیجا مجھے بھی لیتے جانا۔ کوئی نو بجے مہابیر نے پکارا۔ چین سنگھ تیار بیٹھا تھا۔ چٹ پٹ یکے پر بیٹھ گیا۔ مگر گھوڑا اتنا دُبلا ہو رہا تھا۔ یکے کی گدی اتنی میلی اور پھٹی ہوئی۔ سارا سامان اتنا بوسیدہ کہ چین سنگھ کو یکے پر بیٹھتے شرم آتی تھی۔ پوچھا یہ سامان کیوں بگڑا ہوا ہے۔ مہابیر! تمہارا گھوڑا تو کبھی اتنا دُبلا نہ تھا۔ کیا آج کل سواریاں کم ہیں۔؟

مہابیر نے کہا۔ مالک! سواریاں کم نہیں ہیں۔ مگر لاریوں کے سامنے یکے کو کون پوچھتا ہے۔ کہاں دو، ڈھائی، تین کی مجوری کر کے گھر لوٹتا تھا۔ کہاں اب بیس آنے کے پیسے بھی نہیں ملتے۔ کیا جانور کو کھلاؤں۔ کیا آپ کھاؤں۔ بڑی بپتا میں پڑا ہوا ہوں۔ سوچتا ہوں یکہ، گھوڑا بیچ باچ کر آپ لوگوں کی مجوری کروں۔ پر کوئی گاہک نہیں لگتا۔ جیادہ نہیں تو بارہ آنے تو گھوڑے ہی کو چاہیئے۔ گھاس اوپر سے۔ جب اپنا ہی پیٹ نہیں چلتا۔ تو جانور کو کون پوچھے۔

چین سنگھ نے اُس کے پھٹے ہوئے کرتے کی طرف دیکھ کر کہا۔ دو چار بیگھے کی کھیتی کیوں نہیں کر لیتے۔ کھیت مجھ سے لے لو۔

مہابیر نے معذوری کے انداز سے سر جُھکا کر کہا کھیتی کے لئے بڑی ہمت چاہیئے مالک! میں نے بھی سوچا ہے کوئی گاہک لگ جائے تو یکے کو دونے پونے نکال دوں۔ پھر گھاس چھیل کر بجار لے جایا کروں۔ آج کل ساس بہو دونوں گھاس چھیلتی ہیں۔ تب جا کر دس بارہ آنے

پیسے نصیب ہوتے ہیں۔

چین سنگھ نے پوچھا۔ تو بڑھیا بجار جاتی ہوگی۔؟

مہابیر شرماتا ہوا بولا:۔ نہیں راجہ! وہ اتنی دور کہاں چل سکتی ہے گھر والی چلی جاتی ہے۔ دوپہر تک گھاس چھیلتی ہے۔ تیسرے پہر بجار جاتی ہے۔ وہاں سے گھڑی رات گئے لوٹتی ہے۔ ہلکان ہو جاتی ہے۔ بھیا۔ مگر کیا کروں، تکدیر سے کیا جور!

چین سنگھ کچہری پہنچ گیا۔ مہابیر سواریوں کی ٹوہ میں شہر کی طرف چلا گیا۔ چین سنگھ نے اُسے پانچ بجے آنے کو کہہ دیا۔

کوئی چار بجے چین سنگھ کچہری سے فرصت پاکر باہر نکلا۔ احاطے میں پان کی دکان تھی۔ احاطہ کے باہر پھاٹک سے ملا ہوا ایک برگد کا درخت تھا۔ اُس کے سایہ میں بیسیوں ہی یکے، تانگے، بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑے کھول دیئے گئے تھے۔ وکیلوں۔ مختاروں اور افسروں کی سواریاں یہیں کھڑی رہتی تھیں۔ چین سنگھ نے پانی پیا، پان کھایا اور سوچنے لگا۔ کوئی لاری مل جائے تو ذرا شہر کی سیر کر آؤں۔ کہ یکایک اُس کی نگاہ ایک گھاس والی پر پڑ گئی سر پر گھاس کا جھابا رکھے سائیسوں سے مول بھاؤ کر رہی تھی۔ چین سنگھ کا دل اچھل پڑا۔ یہ تو ملیا ہے کیتی بنی ٹھنی۔ کئی کوچبان جمع ہو گئے تھے۔ کوئی اُس سے مذاق کرتا تھا۔ کوئی گھورتا تھا۔ کوئی ہنستا تھا۔

ایک کالے کلوٹے کوچبان نے کہا۔ ملیا۔ گھاس تو اُڑ کے چھ آنے کی ہے۔

ملیا نے نشہ خیز آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ چھ آنے پر لینا ہے۔ تو وہ سامنے گھسیارنیں بیٹھی ہیں۔ چلے جاؤ۔ دو چار پیسے کم میں پا جاؤ گے۔ میری

گھاس تو بارہ آنے ہی میں جائے گی۔

ایک ادھیڑ کوچبان نے فٹن کے اوپر سے کہا۔ نیرا جما نہ ہے۔ بارہ آنے نہیں۔ ایک روپیہ مانگ بھائی۔ لینے والے جھک ماریں گے۔ اور لیں گے۔ نکلنے دے وکیلوں کو۔ اب دیر نہیں ہے۔

ایک تانگے والے نے جو گلابی پگڑی باندھے ہوئے تھا کہا۔ بڑھؤ کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اب ملیا کا مجاج کاہے کو ملے گا۔

چین سنگھ کو ایسا غصہ آ رہا تھا کہ ان بدمعاشوں کی جوتوں سے خبر لے۔ سب کے سب اس کی طرف کیسا ٹکٹکی لگائے تاک رہے ہیں۔ گویا آنکھوں سے پی جائیں گے۔ اور ملیا بھی یہاں کتنی خوش ہے! نہ لجاتی ہے۔ نہ جھجھکتی ہے۔ نہ بگڑتی ہے۔ کیسا مسکرا مسکرا کر۔ رسیلی چتونوں سے دیکھ دیکھ کر سر کا آنچل کھسکا کھسکا کر، منہ موڑ موڑ کر باتیں کر رہی ہے۔ وہی ملیا جو شیرنی کی طرح تڑپ اٹھی تھی!

ذرا دیر میں وکیل مختاروں کا ایک میلا سا نکل پڑا۔ کوچبانوں نے بھی چٹ پٹ گھوڑے جوتے۔ ملیا پر چاروں طرف بے ڈھنگ بازوں کی مشتاق، متانہ قدر دانانہ، ہوسناک نظریں پڑنے لگیں۔ ایک انگریزی فیشن کے بھلے آدمی کر اس فٹن پر بیٹھ گئے اور ملیا کو اشارے سے بلایا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ ملیا نے گھاس پائدان کے پاس رکھی۔ ہاتھ پھیلا کر اور منہ موڑ کر کچھ لیا۔ پھر مسکرا کر چل دی۔ فٹن بھی روانہ ہو گئی۔

چین سنگھ پان والے کی دکان پر خود فراموشی کی حالت میں کھڑا تھا پان والے نے دکان بڑھائی۔ کپڑے پہنے اور کیبن کا دروازہ بند کر کے نیچے اترا تو چین سنگھ کو ہوش آیا۔ پوچھا کیا دکان بند کر دی۔؟

پان والے نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ اس کی دوا کرو ٹھاکر صاحب! یہ بیماری اچھی نہیں ہے۔

چین سنگھ نے استعجاب سے پوچھا۔ کیسی بیماری۔؟

پان والا بولا۔ کیسی بیماری؟ آدھ گھنٹہ سے یہاں کھڑے ہو جیسے بدن میں جان ہی نہیں ہے۔ ساری کچہری خالی ہو گئی مہتر تک جھاڑو لگا کر چل دیئے تمہیں کچھ خبر ہوئی؟ جلدی دوا کرا ڈالو۔!

چین سنگھ نے چھڑی سنبھالی اور پھاٹک کی طرف چلا کہ مہابیر کا یکہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

(۵)

یکہ کچھ دور نکل گیا تو چین سنگھ نے پوچھا۔ آج کتنے پیسے کمائے مہابیر؟

مہابیر نے ہنس کر کہا۔ آج تو مالک دن بھر کھڑا ہی رہ گیا۔ کسی نے بیگار میں بھی نہ پکڑا۔ اوپر سے چار پیسے کی بیڑیاں پی گیا۔

چین سنگھ نے ذرا پس وپیش کے بعد کہا۔ میری ایک صلاح مانو۔ عزت ہماری اور تمہاری ایک ہے۔ تم مجھ سے ایک روپیہ روز لے لیا کرو۔ بس، جب بلاؤں تو یکہ لے کر آ جاؤ۔ تب تو تمہاری گھر والی کو گھاس کو لے کر بازار نہ آنا پڑے گا۔ بولو منظور ہے۔؟

مہابیر نے مشکور نظروں سے دیکھ کر کہا۔ مالک آپ ہی کا تو کھاتا ہوں۔ پرجا بھی آپ ہی کا ہوں۔ جب مرجی ہو بلوا لیجئے۔......... آپ سے روپے.........

چین سنگھ نے بات کاٹ کر کہا۔ نہیں میں تم سے بیگار نہیں لینی چاہتا تم مجھ سے ایک روپیہ روز لے جایا کرو۔ گھر والی کو گھاس لے کر بازار مت

بھیجا کرو۔ ہاں دیکھو! ملیا سے بھول کر بھی اس کی چرچا نہ کرنا۔ نہ اور کسی سے کچھ کہنا۔

کئی دنوں کے بعد شام کو ملیا کی ملاقات چین سنگھ سے ہو گئی۔ وہ آسامیوں سے لگان وصول کر کے گھر کی طرف لپکا جا رہا تھا کہ اُسی جگہ جہاں اُس نے ملیا کی بانہہ پکڑی تھی۔ ملیا کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے ٹھٹک کر دیکھا تو ملیا دوڑی چلی آ رہی تھی۔ بولا:۔ کیا ہے ملیا۔؟ دوڑ مت! دوڑ مت۔ میں تو کھڑا ہوں۔!

ملیا نے ہانپتے ہوئے کہا:۔ اب میں گھاس بیچنے نہیں جاتی۔ کئی دن سے تم سے ملنا چاہتی تھی۔ پر تم کہیں ملتے نہ تھے۔ اور تمہارے گھر جا نہ سکتی تھی۔ آج تمہیں دیکھ کر دوڑی۔ اس پیپل کے پاس سے دوڑی آ رہی ہوں......!

چین سنگھ نے پیپل کی طرف دیکھ کر معذرت کے انداز سے کہا۔ ناحق اتنی دُور دوڑی۔ پسینے پسینے ہو رہی ہے۔ تُو نے بڑا اچھا کیا کہ بازار جانا چھوڑ دیا۔

ملیا نے پوچھا:۔ تم نے مجھے کبھی گھاس بیچتے دیکھا ہے کیا۔؟

چین سنگھ۔ ہاں ایک دن دیکھا تھا۔ کیا مہابیر نے تجھ سے سب کچھ کہہ ڈالا۔؟ میں نے تو منع کر دیا تھا۔

ملیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چُھپاتا۔

دونوں ایک لمحہ تک خاموش کھڑے رہے۔ یکایک ملیا نے مسکرا کر کہا۔ یہیں تم نے میری بانہہ پکڑی تھی!

چین سنگھ شرمندہ ہو کر بولا۔ اُس کو بھول جاؤ مولا دیوی۔ مجھ پر نہ

جانے کون بھوت سوار تھا۔

ملیا نے بھرآئی آواز میں کہا :۔ اُسے کیوں بھول جاؤں۔ اسی ہاتھ پکڑنے کی لاج تو نبھا رہے ہو۔ گریہ آدمی سے جو چاہے کرادے۔ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

ذرا دیر بعد ملیا نے شرارت آمیز انداز سے پوچھا۔ تم نے سمجھا ہو گا میں ہنسنے بولنے میں مگن ہو رہی تھی۔؟ کیوں۔؟

چین سنگھ نے زور دے کر کہا۔ نہیں ملیا مجھے ایسا خیال ایک لمحہ کے لئے کبھی نہیں آیا۔ اتنا کمینہ نہ سمجھ۔!

ملیا مسکرا کر بولی۔ مجھے تم سے یہی آسا تھی۔

ہوا سینچے ہوئے کھیتوں میں آرام کرنے جا رہی تھی۔ آفتاب اُفق کی گود میں آرام کرنے جا رہا تھا۔ اور اُس دھندلی روشنی میں کھڑا چین سنگھ ملیا کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

بیوی سے شوہر

(۱)

مسٹر سیٹھ کو ہر ایک ہندوستانی چیز سے نفرت تھی۔ اور اُن کی قبول صورت بیوی گوداوری کو ہر ایک ولائیتی چیز سے گُریز۔ مگر ضبط اور حلم ہندوستانی دیویوں کا خاصہ ہے۔ گوداوری دل پر ہزار جبر کر کے ہر ایک بدیسی چیز کا استعمال کرتی۔ حالانکہ اندر ہی اندر اُس کا دل اپنی بیکسی پر روتا رہتا۔ وہ جس وقت اپنے چھجے پر کھڑی ہو کر سٹرک پر نگاہ دوڑاتی۔ اور کتنی ہی مستورات کو کھدر کی ساڑیاں پہنے دیکھتی۔ تو اس کے دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکل آتی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دنیا میں نہیں ہے۔ میں اپنے اہل وطن کی اتنی خدمت بھی نہیں کر سکتی! شام کو مسٹر سیٹھ کے بضد ہونے پر بھی وہ کہیں سیر و تفریح کے لئے نہ جاتی۔ اُسے ولائتی کپڑے پہن کر نکلتے ہوئے شرم دامنگیر ہوتی تھی۔

ہولی کا دن تھا۔ آٹھ بجے رات کا وقت۔ فدائیان حُریت کا جلوس آ کر مسٹر سیٹھ کے مکان کے سامنے رُکا۔ اور اسی چوڑے میدان میں ولائیتی کپڑوں کی ہولی لگانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گوداوری اپنے کمرہ میں کھڑکی پر

کھڑی یہ نظارہ دیکھتی تھی۔ اور دل میں مسوس کر رہ جاتی تھی۔ ایک وہ ہیں۔ جو یُوں خوش نشہ آزادی سے مخمور، غرور سے سر اُٹھائے ہوئی لگا رہے ہیں۔ اور ایک میں ہوں قفس میں بند طائر کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی۔ ان تیلیوں کو کیسے توڑ دوں! اُس نے کمرہ میں نگاہ ڈالی۔ ہر ایک چیز ولائتی تھی۔ یہی چیزیں وہاں جلائی جا رہی تھیں۔ اور وہی چیزیں یہاں ذلت کے احساس کی طرح صندوق میں مقفل رکھی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتی تھی۔ ان چیزوں کو اٹھا کر اسی ہولی میں ڈالدے۔ اس کی ذلت اور بیکسی ایک شعلہ میں فنا ہو جائے۔ مسٹر سیٹھ ابھی تک کلب سے نہ لوٹے تھے۔ گوداوری کے جی میں آیا اپنی ساڑیاں اُٹھا کر ہولی میں ڈال آؤں۔ مگر پھر شوہر کی ناراضگی کا خیال آگیا۔ رُک گئی۔

یکایک مسٹر سیٹھ نے اندر آکر کہا۔ ذرا ان احمقوں کو دیکھو۔ کپڑے جلا رہے ہیں۔ یہ دیوانگی اور جنون اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ہندوستانیوں کو کبھی نہ عقل آئی ہے نہ آوے گی۔ کوئی کل بھی تو سیدھی نہیں۔

گوداوری نے کہا۔ تم بھی تو ہندوستانی ہو۔!

سیٹھ نے گرم ہو کر کہا۔ ہاں لیکن مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہتا ہے ایسے ذلیل ملک میں، میں کیوں پیدا ہوا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے ہندوستانی کہے یا سمجھے۔ کم سے کم میں نے اپنی بُود و باش طور و طریق قول و فعل میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی جس سے کوئی مجھے ہندوستانی سمجھے۔ سوچئے! جب ہمیں آٹھ آنے گز میں نہایت خوبصورت کپڑا ملتا ہے۔ تو ہم کیوں موٹا ٹماٹ خریدیں۔ اس معاملہ میں کامل آزادی ہونی چاہیئے۔ معلوم نہیں گورنمنٹ نے کیوں ان احمقوں کو یہاں جمع ہونے دیا۔ اگر میں برسر اختیار ہوتا تو سبھوں کو واصل جہنم کر دیتا۔

تب معلوم ہوتا۔

گوداوری۔ تمہیں ذرا بھی اپنے غریب بھائیوں کا خیال نہیں آتا۔؟

سیٹھ۔ میں انہیں اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔

گوداوری۔ آخر تمہیں سرکار جو تنخواہ دیتی ہے۔ وہ انہیں آدمیوں کی جیب سے تو آتی ہے۔

سیٹھ۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میری تنخواہ کس کی جیب سے آتی ہے۔ مجھے جس کے ہاتھ سے ملتی ہے۔ وہ میرا آقا اور مالک ہے۔ نہ جانے ان احمقوں کو یہ کیا سنک سوار ہوگئی ہے۔ کہتے ہیں روحانیت ہندوستانیوں کی خاص صفت ہے۔ یہ روحانیت ہے کہ پرماتما کی مرضی کی مخالفت کی جائے؟ جب یہ معلوم ہے کہ پرماتما کی مرضی کے بغیر ایک پتی بھی نہیں ہل سکتی۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اتنا بڑا ملک بغیر پرماتما کی مرضی کے انگریزوں کے زیر اقتدار ہو۔ کیوں ان دیوانوں کو اتنی عقل نہیں آتی۔ کہ پرماتما کی جب تک مرضی نہ ہوگی۔ کوئی انگریزوں کا بال بھی بینکا نہ کر سکے گا۔

گوداوری۔ لیکن پرماتما ان کی مدد بھی تو کرتا ہے۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

سیٹھ۔ بیشک کرتا ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے یہ لوگ کر رہے ہیں یا اپنے گھر میں آگ لگا دینا۔ گھر کی چیزوں کو جلا دینا ایسے کام ہیں جس میں پرماتما کبھی مدد نہیں کر سکتا۔

یکایک ہولی جلی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ گویا قومی آزادی آتشیں لباس میں ملبوس آکاش کے دیوتاؤں سے گلے ملنے جا رہی ہو۔ دینا ناتھ نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ یہ نظارہ دیکھنا ہی نہ چاہتے تھے۔

گوداوری صورت تصویر خاموش کھڑی رہی۔

(۲)

دوسرے دن علی الصباح کانگرس کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا۔ مسٹر سیٹھ نے ولائیتی لوتھ پاؤڈر ولائیتی برش سے دانتوں میں ملا۔ ولائیتی صابون سے نہایا۔ ولائیتی چائے ولائیتی چائے کے سٹ میں پیا۔ ولائیتی بسکٹ، ولائیتی مکھن کے ساتھ کھایا۔ ولائیتی دودھ پیا۔ پھر ولائیتی سوٹ زیب تن کر کے ولائیتی سگار ہونٹوں میں دبا کر گھر سے نکلے۔ سڑک پر ولائیتی موٹر کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر فلاور شو دیکھنے چلے گئے۔

گوداوری کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ مسٹر سیٹھ کی تالیف قلب کرنے کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک حسینہ کر سکتی ہے۔ پہ اس مرد خدا پر اس کی ساری سحر طرازیوں اور عشوہ پردازیوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ خود تو سُدیشی کپڑوں کے استعمال پر کیا راضی ہوتے، گوداوری کے لئے ایک کھدر کی ساڑی کی تجویز بھی منظور نہ کی۔ یہاں تک کہ گوداوری نے قسم کھائی کہ اب تم سے کبھی کوئی چیز نہ مانگوں گی۔

اس نے سوچا جب یہ میری اتنی سی تمنا نہیں پوری کر سکتے۔ تو پھر میں کیوں ان کے اشاروں پر چلوں۔ کیوں ان کی ہاں میں ہاں ملاؤں۔ میں نے ان کے ہاتھ کچھ اپنی آتما نہیں بیچی ہے۔ اگر آج یہ چوری یا غبن کریں۔ تو کیا میں اس میں ان کی شریک ہوں گی۔ اُس کی سزا یہ خود جھیلیں گے۔ اس کی ذمہ داری کلیتہً ان کے اُوپر ہوگی۔ میری ہستی ان کی ہستی میں کیوں مدغم ہو۔ انہیں اپنے قول و فعل کا اختیار ہے۔ مجھے اپنے قول و فعل کا اختیار۔ یہ اپنے سرکار کی غلامی کریں۔ انگریزوں کے چوکھٹ پر ناک رگڑیں۔ مجھے کیا غرض ہے کہ ان کی شریک بنوں

جو خود غلام ہے۔ اُس کی غلامی کیوں کروں۔ ملازمت اور غلامی میں فرق ہے۔ ملازم چند قواعد کا پابند ہو کر ملازمت کرتا ہے۔ وہ شرطیں حاکم و محکوم دونوں پر عاید ہوتی ہیں۔ غلام کے لئے کوئی شرط نہیں۔ اس کی جسمانی غلامی پیچھے ہوگی۔ روحانی غلامی پہلے ہے۔ سرکار نے کبھی شاید یہ نہ کہا ہوگا۔ کہ دیسی چیزیں نہ خریدو۔ سرکاری ٹکٹوں تک پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے "سُدیشی چیزیں خریدو" اس سے ظاہر ہے۔ کہ سرکار سُدیشی چیزوں کی ممانعت نہیں کرتی۔ پھر بھی یہ حضرت سرخرد بننے کی فکر میں سرکار سے بھی دو اُنگل آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں سے بھی زیادہ انگریز بنے ہوئے ہیں۔ وفا کی قبر پر لات مار رہے ہیں۔ میں کیوں ان کے پیچھے اپنی عاقبت بگاڑوں۔؟

ذرا دیر بعد سیٹھ نے کہا۔ کل فلاور شو دیکھنے چلوگی۔؟

گوداوری نے کہا۔ نہیں! میں کانگرس کے جلسہ میں جاؤں گی۔!

سیٹھ کے سر پر اگر چھت گر پڑی ہوتی۔ یا انھوں نے بجلی کا تار ہاتھ سے پکڑ لیا ہوتا تو بھی وہ اس قدر بدحواس اور مضطرب نہ ہوتے۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے "تم کانگرس کے جلسہ میں جاؤ گی"

'ہاں! ضرور جاؤں گی'

'میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں جاؤ'

"اگر تم میری پرواہ نہیں کرتے تو میرا فرض نہیں کہ تمہارے ہر ایک حکم کی تعمیل کروں"

'نتیجہ بُرا ہوگا'

'جو کچھ ہو۔ اس کا غم نہیں ہے۔ تم میرے خدا نہیں ہو۔

سیٹھ جی خوب گرم ہوئے۔ دھمکیاں دیں۔ آنکھیں دکھائیں۔ آخر منہ

پھیر کر لیٹ رہے۔ جاتے وقت بھی انھوں نے گوداوری سے کچھ نہ کہا۔

(۳۲)

گوداوری جس وقت کانگرس کے جلسہ میں پہنچی۔ کئی ہزار مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا۔ سکریٹری نے چندہ کی پُر زور اپیل کی تھی۔ اور کچھ لوگ چندے دے رہے تھے۔ گوداوری اُس مقام پر کھڑی ہو گئی۔ جہاں عورتیں جمع تھیں۔ اُس نے جیب ٹٹولی تو ایک روپیہ موجود تھا۔ سمجھا کافی ہے۔ اور لوگ دو دو، چار چار آنے ہی دے رہے ہیں۔

یکایک ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں خنجری لئے کھڑا ہو گیا۔ اسے گوداوری روز اپنے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ کر خنجری بجا بجا کر گاتے سُنا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیسہ کبھی روٹیاں دے دیتی تھی۔ لوگ اس کی طرف تاکنے لگے۔ کیا وہ بھی کچھ چندہ دینا چاہتا ہے۔ خوب! دن بھر گلا پھاڑتا ہے۔ تب تو پیٹ کی روٹی ملتی ہے۔ وہ چندہ دینے آئے گا۔ اور پھر ایسے سڑک پر گانے والوں کو دیتا بھی کون ہے۔ اگر وہی گانا خوش آواز اور ساز کے ساتھ کسی محفل میں ہو تو روپیوں کی بارش ہو جائے۔ لیکن سڑک والے اندھے کی خنجری کی کون پرواہ کرتا ہے۔

لڑکے نے کمر سے کچھ نکالا۔ اور جونہی چندہ کی جھولی اس کے قریب پہنچی اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جھولی والی نے جھولی بڑھا دی۔ اندھے نے اُس میں کچھ ڈال دیا۔ لوگوں نے دیکھا ایک پیسہ تھا۔ جھولی میں پیسہ ڈالتے ہی اندھا لڑکا وہاں سے چل دیا۔ اور دُور جا کر پھر گانے لگا۔

"وطن کی دیکھئے تقدیر کب بدلتی ہے"

جلسہ کے پریزیڈنٹ نے کہا:۔ دوستو! دیکھئے یہ وہ پیسہ ہے۔ جو

(دوم

غریب اندھا لڑکا اس جھولی میں ڈال گیا ہے۔ میری نگاہوں میں اس ایک پیسہ کی قیمت کسی امیر کے ایک ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ شائد یہی اس غریب کی ساری بساط ہوگی۔ جب ایسے غریبوں کی ہمدردی اور قربانی ہمارے ساتھ ہے۔ تو مجھے حق کی فتح یقینی نظر آتی ہے۔ ہمارے یہاں کیوں اتنے فقیر نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ یا تو سوسائٹی میں انہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ یا افلاس سے پیدا ہوئی بیماریوں کے باعث یہ اب اس قابل ہی نہیں رہے کہ کوئی کام کرسکیں۔ یا اس گداگری نے ان میں کوئی محنت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں باقی رکھی۔ سوراجیہ کے سوا ان حالات کی اور کوئی دوا نہیں ہے۔ یہ غریب اندھا جس کی تان اب بھی آپ کے کان میں آرہی ہے۔ اس حقیقت کو خوب سمجھتا ہے دیکھئے وہ گاتا ہے۔

" وطن کی دیکھئے تقدیر کب بدلتی ہے "

آہا! اس غریب، دُکھ سے بھرے، دل میں کتنا ایثار ہے یا اب بھی کیا کوئی شک کرسکتا ہے۔ کہ ہم کس کی آواز ہیں؟ یہ تامر پتر اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ آپ میں کون اس تبرک کو، اس رتن کو خریدنا چاہتا ہے کون اس دُرِ بے بہا کی قیمت ادا کرسکتا ہے۔؟

گوداوری کے دل میں ایک اضطراب خیز خواہش ہوئی۔ کیا وہ یہی پیسہ تو نہیں ہے۔ جو رات میں نے اُسے دیا تھا۔؟ کیا اُس نے سچ مچ رات کو کچھ نہیں کھایا۔

اس نے جاکر قریب سے پیسے کو دیکھا جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک سے ہوگیا۔ یہ وہی گھسا ہوا پیسہ تھا۔

گوداوری نے کانپتے ہوئے گلے سے کہا۔ مجھے آپ یہ پیسہ

دیدیجئے۔ میں پانچ روپیہ دوں گی۔

پریسیڈنٹ نے کہا۔ ایک بہن اس پیسہ کی قیمت پانچ روپیہ دے رہی ہیں۔

دوسری آواز آئی۔ دس روپے۔!

تیسری آواز آئی۔ بیس روپے!

گوداوری نے آخری شخص کی طرف دیکھا۔ کوئی خوش حال مغرور آدمی تھا سب کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گوداوری کے دل میں ایک ہیجان سا اٹھا۔ کچھ بھی ہو اس شخص کے ہاتھ میں یہ پیسہ نہ جانے دوں گی سمجھتا ہے۔ اس نے بیس روپیہ کیا کہہ دیا کوئی قلعہ جیت لیا۔

گوداوری نے کہا۔ چالیس روپے۔

امیر آدمی نے فوراً کہا۔ پچاس روپے۔

گوداوری کی طرف ہزاروں نگاہیں اٹھ گئیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ بس! یہ امیر اس پیسہ کو لئے جاتا ہے۔

گوداوری نے اس آدمی کی طرف مغرور نظروں سے دیکھ کر کہا:۔ سو روپے۔

امیر آدمی نے بھی فوراً کہا:۔ ایک سو بیس روپے۔

چاروں طرف سے تالیاں پڑیں۔ لوگ سمجھ گئے۔ امیر آدمی پیسہ لے گیا۔ گوداوری اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ لوگوں نے مایوس نظروں سے گوداوری کو دیکھا۔ مگر جونہی گوداوری کے منہ سے نکلا۔ ڈیڑھ سو! تو لوگوں نے امیر آدمی کو پھر فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے تھے۔ تم اس پیسہ کو نہیں لے جا سکتے۔ امیر آدمی نے پھر کہا پونے دو سو!

گوداوری بولی دو سو!

چاروں طرف سے تالیاں پڑیں۔ امیر آدمی شرمندہ ہو کر چلا گیا۔
گوداوری فتح کی مسرت کو انکسار سے دباتی ہوئی کھڑی تھی۔ اور ہزاروں دعائیں پھولوں کی طرح اس پر برس رہی تھیں۔

(۴)

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ گوداوری مسٹر سیٹھ کی بیوی ہے۔ تو انہیں ایک حاسدانہ مسرت کے ساتھ اس پر رحم بھی آیا۔ سیٹھ ایک ہی خوشامدی ہے۔ گوداوری کو زندہ نہ چھوڑے گا۔

مسٹر سیٹھ ابھی فلادرشو ہی میں تھے کہ ایک پولیس کے افسر نے یہ وحشتناک خبر سنائی۔ مسٹر سیٹھ سکتے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ گویا مفلوج ہو گئے ہوں۔ پھر دونوں مٹھیاں باندھ لیں۔ دانت پیسا۔ ہونٹ چبایا۔ اور اسی وقت گھر چلے۔ موٹر سائیکل اتنی تیز کبھی نہ چلی تھی۔

گھر میں گھستے ہوئے گرج کر بولے۔ میرے منہ میں کالکھ لگوانا چاہتی ہو تم ؟ میری قبر کھودنا چاہتی ہو تم ۔؟

گوداوری تحمل کے ساتھ بولی۔ کچھ منہ سے کہو تو کہو یا گالیاں ہی دیئے جاؤ گے۔ تمہارے منہ میں کالکھ لگے گی تو کیا میرے منہ میں نہ لگے گی۔ تمہاری قبر کھدے گی تو میرے لئے دوسرا کونسا سہارا ہے۔؟

سیٹھ۔ سارے شہر میں طوفان مچا ہوا ہے۔ تم نے میرے روپے کیوں دیئے۔؟

گوداوری نے اسی صابرانہ انداز سے کہا:۔ اس لئے کہ میں اسے اپنا ہی روپیہ سمجھتی ہوں۔

سیٹھ جی دانت کٹ کٹا کر بولے:۔ ہرگز نہیں۔ کسی طرح نہیں،

تمہیں میرے روپیہ کو خرچ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی اختیار نہیں ہے،
گوداوری۔ بالکل غلط۔ تمہارے روپیہ کو خرچ کرنے کا مجھے اتنا
ہی اختیار ہے۔ جتنا تم کو ہے۔ ہاں جب طلاق کا قانون پاس کرا لوگے اور
طلاق دیدوگے تب نہ رہے گا۔

سیٹھ جی نے اپنا ہیٹ اتنے زور سے میز پر پھینکا کہ وہ لڑھکتا ہوا
زمین پر گر پڑا۔ اور بولے۔ مجھے تمہاری عقل پر افسوس آتا ہے۔ جانتی ہو،
تمہاری اس حماقت کا کیا نتیجہ ہوگا۔ مجھ سے جواب طلب ہوگا۔ بتلاؤ کیا
جواب دوں گا۔ ہے کوئی جواب؟ جب ظاہر ہے کہ کانگرس سرکار سے
دشمنی کر رہی ہے۔ تو کانگرس کی مدد کرنا سرکار کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

"تم نے تو نہیں کی کانگرس کی مدد"؟

"تم نے تو کی"

"اگر میں کوئی جرم کروں تو اس کی سزا مجھے ملیگی یا تمہیں"؟

"جرم کی بات اور ہے۔ یہ بات اور ہے"!

"تو کیا کانگرس کی کچھ مدد کرنا، چوری یا ڈاکے سے بھی برا ہے"؟

"ہاں گورنمنٹ ملازم کے لئے چوری یا ڈاکے سے بھی کہیں زیادہ
برا ہے"

"میں نے یہ نہیں سمجھا تھا"۔

اگر تم نے نہیں سمجھا تھا تو تمہاری غلطی تھی۔ حماقت تھی۔ جہالت تھی۔
روز اخباروں میں دیکھتی ہو پھر بھی پوچھتی ہو۔ ایک کانگرس کا آدمی پلیٹ فارم
پر بولنے کھڑا ہوتا ہے۔ تو بیس وردی والے سپاہیوں خفیہ پولیس کے افسر اس
کی رپورٹ کی نقل کرتے بیٹھتے ہیں۔ کانگرس کے سرغناؤں کے پیچھے کئی کئی

مخبر لگائے جاتے ہیں۔ جن کا کام یہی ہے کہ ان کے اوپر کڑی نگاہ رکھیں۔ چوروں کے ساتھ تو اتنی سختی کبھی نہیں کی جاتی۔ ہزاروں چوریاں اور ڈاکے اور خون روز ہوتے ہیں۔ کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ نہ پولیس اس کی پرواہ کرتی ہے۔ مگر پولیس کو جس معاملہ میں پالٹیکس کی بو آتی ہے۔ اس میں دیکھو اس کی مستعدی انسپکٹر جنرل سے لے کر کانسٹبل تک ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ چوروں سے سرکار کو خوف نہیں۔ چور سرکار پر حملہ نہیں کرتا۔ کانگرس سرکار کے اختیار پر حملہ کرتی ہے۔ اس لئے سرکار بھی اپنی حفاظت کے لئے انتہائی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔

مسٹر سیٹھ آج دفتر چلے تو ان کے قدم پیچھے رہے جاتے تھے۔ وہاں آج نہ جانے کیا حشر ہو۔ روز کی طرح وہ دفتر میں پہنچتے ہی چپراسیوں پر بگڑے نہیں۔ کلرکوں پر رعب نہیں جمایا۔ چپکے سے وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ جونہی صاحب کی موٹر آکر رکی۔ روح فنا ہو گئی۔ روز وہ اپنے کمرہ میں بیٹھے رہتے تھے۔ جب صاحب آکر بیٹھ جاتے تھے۔ تب آدھ گھنٹہ کے بعد وہ مسلیں لے کر پہنچتے تھے۔ وہ برآمدہ میں سلام کرنے کو کھڑے تھے۔ صاحب اترے تو انھوں نے جھک کر سلام کیا مگر صاحب نے منہ پھیر لیا۔ مسٹر سیٹھ کی جان نکل گئی۔

لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا۔ جونہی صاحب نے کمرہ میں قدم رکھا آپ نے پنکھا کھول دیا۔ مگر جان سوکھی جاتی تھی کہ دیکھیں کب سر پر تلوار گرتی ہے۔ صاحب کو خبر تو مل ہی گئی ہو گی۔ یہ تو غیر ممکن ہے کہ اب تک انہیں خبر ہی نہ ہو۔ صاحب جونہی کرسی پر بیٹھے سیٹھ جی نے لپک کر سگار بکس اور دیا سلائی اور رکھا کر ان لاکر میز پر رکھ دیا۔

یکایک انہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا آسمان پھٹ گیا ہے۔ صاحب گرج رہے تھے۔ تم دغا باز آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ نے اس طرح صاحب کی طرف دیکھا گویا ان کا مطلب نہیں سمجھے۔

صاحب نے گھور کر کہا۔ تم دغا باز آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ کے خون میں حرارت آئی۔ میرا تو خیال ہے کہ مجھ سے زیادہ وفادار آدمی ہندوستان میں نہ ہوگا۔

صاحب۔ تم نمک حرام آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ کے چہرہ پر سُرخی آئی۔ آپ زبان مبارک کو ناحق خراب کر رہے ہیں۔

صاحب۔ تم شیطان آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ کی آنکھوں میں سُرخی آئی۔ آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی پندرہ سال کی ملازمت میں کبھی ایسی باتیں نہیں سنیں۔

صاحب۔ چُپ رہو۔ یُو بلاڈی۔ تم کو سرکار پانچ سو روپیہ تنخواہ اسی لئے دیتا ہے کہ تم اپنی بلاڈی وائف کے ہاتھ سے کانگرس کا چندہ دلوائے تم کو اس لئے سرکار روپیہ نہیں دیتا۔ تم کو اس لئے نوکر نہیں رکھا ہے۔ کہ تم سرکار کے دشمنوں سے مل کر سرکار کا گلا کاٹے۔

مسٹر سیٹھ کو اپنی صفائی دینے کا موقعہ ملا جس کے وہ تلاش میں تھے۔ بولے۔ میں حلف سے کہتا ہوں کہ میری وائف نے میرے حکم کے خلاف، سراسر میری مرضی کے خلاف روپے دیئے ہیں۔ میں تو اس وقت فلادرشو دیکھنے گیا تھا۔ جہاں میں نے مس کاک کا گلدستہ پانچ روپیہ میں لیا۔ وہاں سے

لوٹا تو مجھے یہ خبر ملی۔

صاحب۔ تم ہم کو بیوقوف بناتا ہے۔ ہم کو بیوقوف بناتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے صاحب جامہ سے باہر ہوگئے۔ کسی ہندوستانی کی اتنی مجال کہ انہیں بیوقوف بنائے۔ وہ جو ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ جس کے سامنے بڑے بڑے تعلقہ دار آ کر سلام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے رئیس ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ جس کے نوکروں کو بڑے بڑے ہندوستانی افسر نذرانے دیتے ہیں۔ اس کو کوئی بیوقوف بنائے۔ یہ وہ کیوں کر برداشت کرسکتا تھا۔ اس کا غصہ جوآیاں کے درجہ تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اس مکارانہ گستاخی پر مشتعل ہو پڑا۔ رُول اٹھا کر دوڑا۔

لیکن سیٹھ جی مضبوط آدمی تھے۔ ٹینس برابر کھیلتے تھے۔ یُوں وہ ہر طرح کی خوشامد کرنے پر تیار رہتے۔ لیکن یہ ذلت اُن کی قوت برداشت سے باہر تھی۔ انہوں نے رُول کو تو ہاتھ پر لیا۔ اور آگے بڑھ کر ایک گھونسا صاحب کے منہ پر رسید کیا۔ صاحب اس گھونسے کے لئے تیار نہ تھے۔ ہندوستانی تو متحمل مزاج ہوتا ہے۔ خاص کر صاحب بہادروں کے سامنے تو اس کی زبان بھی نہیں کھلتی۔ گھونسا کھاتے ہی وہ گر پڑا۔ ناک سے خون گرنے لگا۔ پھر مسٹر سیٹھ سے اُلجھنے کی اس کی ہمت نہ پڑی۔ شاید دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں رُول چلایا۔ یا سوچ رہا ہو۔ کہ اسے کیونکر نیچا دکھاؤں۔ مسٹر سیٹھ وہاں سے اپنے کمرہ میں آئے اور سوچنے لگے۔ انہیں مطلق ندامت نہ تھی۔ بلکہ وہ اپنی جسارت پر خوش تھے۔ اس کی بدمعاشی تو دیکھو کہ مجھ پر رُول چلا دیا۔ جتنا دبتا تھا، اتنا ہی دبائے جاتا تھا۔ اس کی بیوی یاروں کو لئے گھوما کرتی ہے تو اس کا کیا بنا لیتا ہے۔ اس کی بات بھی نہیں پوچھتی۔ منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ اور مجھ سے

شیر بن گئے ۔ اب دوڑے گا کمشنر صاحب کے پاس ۔ مجھے برخاست کرائے بغیر نہ چھوڑے گا ۔ ساری شرارت گوداوری کی ہے ۔ اس کی بدولت یہ ساری بربادی ہو رہی ہے ۔ بے عزتی تو ہو ہی گئی ۔ اب روٹیوں کو بھی محتاج ہونا پڑے گا ۔ ان صاحبوں سے انصاف کی امید رکھنا فضول ہے ۔ مجھ سے پوچھنا ہی کون ہے ایک پروانہ آ گیا تم برخاست کر دیئے گئے ۔ اپیل کہاں ہوگی سکریٹری ہیں تو ہندوستانی مگر انگریزوں کے غلام ۔ زر خرید ۔ گوداوری کے چندہ کا نام سنتے ہی انہیں لرزہ آ جائے گا ۔ انصاف کی کسی سے توقع نہیں ۔ اب یہاں سے نکل جانے ہی میں خیریت ہے ۔

یہ سوچ کر انھوں نے ایک استعفےٰ لکھا اور اردلی کو دیا کہ صاحب کو دے آئے ۔ صاحب نے استعفےٰ دیکھا تو جل گئے ۔ اسی پر لکھ دیا برخاست !

(۵)

مسٹر سیٹھ خونبار آنکھوں سے دیکھ کر بولے ۔ اب روؤ سر پر ہاتھ دھر کے ۔

گوداوری نے بیباکی سے کہا ۔ میں کیوں روؤں ۔ تم روؤ ۔ یہاں تو سوت کاتوں گی ۔ اسی سے کپڑے بھی ملیں گے ۔ کھانا بھی ۔ تم روؤ کہ تمہارا کام نہ چلے گا ۔ یہی اس غلامی کی سزا ہے جو تم نے پال رکھی تھی ۔

سیٹھ نے ہونٹ چبا کر کہا ۔ شرمندہ تو نہ ہوگی ۔ اور اوپر سے دھاندلی کرتی ہو ۔

گوداوری اسی شان استغنا سے بولی ۔ شرمندہ کیوں ہوں ؟ یہاں اپنا ضمیر اپنی ضرورتوں کے ہاتھ نہیں بیچا ہے ۔ تمہاری آمدنی ولائتی تکلفات کے پیچھے ہی تو غارت ہوتی تھی ۔ گویا ہم انھیں چیزوں کے غلام تھے ۔ پرماتما کا

شکر کیوں نہیں کرتے کہ تم اس غلامی سے آزاد ہو گئے۔

سیٹھ۔ آخر کچھ سوچا ہے کام کیسے چلے گا۔ ولائتی چیزیں چھوڑ بھی دوں تب بھی تو بلا روپئے کے کام نہ چلے گا۔

گوداوری۔ چلے گا۔ میں چلا کر دکھا دوں گی۔ میں جو کچھ کہوں وہ تم کئے جانا۔ اب تک میں تمہاری ہدایتوں پر چلتی تھی۔ اب تم میری ہدایتوں پر چلنا۔ میں تمہاری ساری باتیں بے عذر قبول کرتی تھی۔ تم ولائتی پہناتے تھے۔ پہنتی تھی۔ ننگی رکھتے ننگی رہتی۔ موٹا کھلاتے موٹا کھاتی۔ مہین کھلاتے مہین کھائی۔ محل میں رکھتے محل میں رہتی۔ جھونپڑے میں رکھتے جھونپڑے میں رکھتے جھونپڑے میں رہتی مگر حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ اسی طرح آپ بے چون وچرا میری ہدایتوں پر عمل کرنا۔ جس حالت میں رکھوں اُس حالت میں رہنا۔ جو کام کرنے کو کہوں وہ کام کرنا۔ پھر دیکھوں کیسے کام نہیں چلتا۔ ہاں میں تمہاری رُوحانی آزادی نہ چھینوں گی۔ کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہوں گی۔ جس میں تمہارے ضمیر کا خون ہو۔

آج تک تم میرے شوہر تھے۔ آج سے میں تمہاری شوہر ہوں۔

گوداوری ہاں ہاں کرتی ہی رہی۔ کہ سیٹھ نے ولائتی سُٹ کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ اور ذرا دیر میں اس گھر میں ولائتی کپڑوں کی ہولی چلی۔ جس کی پیدائش سے جلنے تک کے سارے مرحلے خود سیٹھ جی کے ہاتھوں طے ہوئے تھے

پوس کی رات!

(۱)

ہلکو نے آکر اپنی بیوی سے کہا "شہنا آیا ہے۔ لاؤ جو روپے رکھے ہیں۔ اسے دیدو۔ کسی طرح گردن تو چھوٹے"

منی بہو جھاڑو لگا رہی تھی۔ پیچھے پھر کر بولی:۔ "تین ہی تو روپے ہیں دیدوں، تو کمبل کہاں سے آئے گا۔؟ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اُس سے کہدو فصل پر روپے دیدیں گے۔ ابھی نہیں ہے"

ہلکو تھوڑی دیر تک چُپ کھڑا رہا۔ اور اپنے دل میں سوچتا رہا۔ پوس سر پر آگیا۔ بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں، گھڑکیاں دے گا۔ گالیاں سُنائے گا۔ بلا سے جاڑوں میں مریں گے۔ یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لئے ہوئے (جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا) اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اور خوشامد کرکے بولا "لا دیدے گردن تو کسی طرح سے بچے کمبل کے لئے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔

مُنی اس کے پاس سے دُور ہٹ گئی۔ اور آنکھیں ٹیڑھی کرتی بولی "کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سُنوں کون تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دیدے گا۔ نہ

جانے کتنا روپیہ باقی ہے۔ جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں۔ تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو۔ پیداوار ہو۔ تو اس سے قرضہ ادا کرو۔ چلو چھٹی ہوئی قرضہ ادا کرنے کے لئے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے۔ میں روپے نہ دوں گی نہ دوں گی۔"

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا "تو کیا گالیاں کھاؤں۔"؟

منی نے کہا "گالی کیوں دے گا۔؟ کیا اس کا راج ہے"؟ مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دل ہلا دینے والی صداقت تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے طاق پر سے روپے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ پھر بولی۔ تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے۔ مزدوری کر کے لاؤ، وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس۔"

ہلکو نے روپے لئے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین ۳ روپے کمبل کے لئے جمع کئے تھے۔ وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔!

(۲)

پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا "جبرا" پیٹ میں منہ ڈالے سردی سے کوں کوں،

کر رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا: "کیوں جبرا جاڑا لگتا ہی کہا تو تھا گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی۔ میں کیا کروں۔ جانتا تھا۔ میں حلوہ پوری کھانے آرہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنی نانی کے نام کو۔" جبرا نے لیٹے ہوئے دم ہلائی۔ اور ایک انگڑائی لے کر چپ ہو گیا۔ شاید وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آرہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا: "کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔ یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لئے آرہی ہے۔ اٹھوں پھر ایک چلم بھروں۔ کسی طرح رات تو کٹے۔ آٹھ چلم تو پی چکا۔ یہ کھیتی کا مزہ ہے۔ اور ایک بھاگوان ایسے ہیں۔ جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے گدے۔ لحاف کمبل۔ مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے۔ مزدوری ہم کریں۔ مزہ دوسرے لوٹیں۔"

ہلکو اٹھا اور گڈھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری۔ جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔ ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا۔ پئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے۔ ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکو نے کہا۔ "آج اور جاڑا کھالے۔ کل سے میں یہاں پیال بچھا دوں گا۔ اس میں گھس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا۔

جبرا نے اگلے پنجے اس کی گھٹنیوں پر رکھ دیئے۔ اور اس کے منہ کے

پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔ چلم پی کر ہلکو پھر لیٹا۔ اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو۔ اب کی سو جاؤں گا۔ لیکن ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کبھی اس کروٹ لیٹا کبھی اُس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔

جب کسی طرح نہ رہا گیا۔ تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اُٹھایا۔ اور اس کے سر کو تھپتھپا کر اسے اپنی گود میں سُلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی۔ پر اسے اپنی گود سے چمٹاتے ہوئے ایسا سُکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے۔ اور ہلکو کی رُوح اتنی پاک تھی کہ اس کو کُتے سے بالکل نفرت نہ تھی۔ وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اُس کی رُوح کے سب دروازے کھول دیئے تھے۔ اور اس کا ایک ایک ذرّہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی۔ اس کے مالک کی اس خاص رُوحانیت نے اس کے دل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی۔ جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا۔ اور جھوپڑی سے باہر آ کر بھونکنے لگا۔ ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پچکار کر بلایا۔ پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لئے آ بھی جاتا۔ تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔

(۳)

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اُٹھ بیٹھا۔ اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا۔ پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا۔ کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اِس نے اُٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا ابھی کتنی رات باقی ہے۔ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں۔ ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر چکے۔ جب وہ اُوپر آ جائیں گے۔ تو کہیں سویرا ہو گا۔ ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دُور کے فاصلہ پر ایک باغ تھا۔ پت جھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہلکو نے سوچا۔ چلکر پتیاں بٹور دوں۔ اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی مجھے پتیاں بٹورتے دیکھے۔ تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو۔ مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر کئی پودے اکھاڑے۔ اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سُلگتا ہوا اُپلہ لئے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا۔ تو پاس آیا۔ اور دم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا۔ اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرو، چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں ٹاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آ کر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔

جبرا نے کُوں کُوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی۔ اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بُوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ یکایک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لئے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا۔ کیسی اچھی مہک آئی جبرا۔ تمہاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے۔؟

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اُسے چوس رہا تھا۔

ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی۔ اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے۔ ننگے پاؤں گلے جاتے تھے۔ اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اٹھا۔ اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے کہ وہ اس لاانتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبالی اور دونوں پاؤں پھیلا دیئے۔ گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا "تیرے جی میں جو آئے وہ کر۔" سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا۔ کیوں جبرا! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے۔؟

جبرا نے کوں، کوں کر کے گویا کہا۔ اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی۔!

"پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی، نہیں اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے۔"؟

جبرا نے دُم ہلائی۔

"اچھا آؤ" اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔ اگر جل گئے بچہ تو میں دوا نہ کروں گا۔"

جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا۔

"منی سے کل یہ نہ جڑ دینا کہ رات خوب ٹھنڈ لگی۔ اور تاپ تاپ کر

رات کاٹی۔ ورنہ لڑائی کرے گی۔"

یہ کہتا ہوا وہ اُچھلا اور اُس الاؤ کے اُوپر سے صاف نکل گیا۔ پیر دل میں ذرا سی لپٹ لگ گئی۔ پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا۔ "چلو چلو، اس کی سہی نہیں۔ اُوپر سے کُود کر آؤ۔"

وہ پھر کُودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

(۴)

پتیاں جل چکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی۔ جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اُٹھتی تھی۔ پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی۔ اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا۔ اُس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی۔ پر جُوں جُوں سردی بڑھتی جاتی تھی۔ اُسے سُستی دبائے لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اُس کے کھیت میں آیا۔ شاید نیل گاؤں کا جھنڈ تھا۔ اُن کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھیں۔

پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں۔ ....

.... اُس نے دل میں کہا۔

نہیں، جبرا کے ہوتے کوئی جانور کھیت میں نہیں آ سکتا۔ نوچ ہی ڈالے۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ کہاں! اب تو کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا۔!

اُس نے زور سے آواز لگائی۔ جبرا۔! جبرا۔!

جبرا بھونکتا رہا۔ اُس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چر، چر، سُنائی دینے لگی۔ ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا۔ مگر اُسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہُوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا جانوروں کو بھگانا۔ اُن کا تعاقب کرنا اُسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لئے چلّانے لگا۔ ہو ہو، ہو۔ ہو۔ ہا ہا!

مگر جبرا پھر بھونک اُٹھا۔ اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لوٹ آیا ہوتا۔ نہیں بھاگے۔ ابھی تک چر رہے ہیں۔ شائد وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں۔ کہ اس سردی میں کون بیٹھا ہے جو اُن کے پیچھے دوڑے گا۔ فصل تیار ہے۔ کیسی اچھی کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا۔ اُسے یہ ابھاگے تباہ کئے ڈالتے ہیں۔!

اب ہلکو سے نہ رہا گیا۔ وہ پکا ارادہ کر کے اُٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایسا ٹھنڈا، چُبھنے والا، بچھّو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا۔ کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کُرید کُرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کئے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ افسردگی نے اُسے چاروں طرف سے رسّی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

آخر وہیں چادر اوڑھ کر سو گیا۔

سویرے جب اُس کی نیند کھلی۔ تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل

گئی ہے۔ اور منی کھڑی کہہ رہی ہے "کیا آج سوتے ہی رہو گے۔ تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو۔ اور اُدھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔ سارا کھیت ستیا ناس ہو گیا۔ بھلا کوئی ایسا بھی سوتا ہے۔ تمہارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا ہوا۔

ہلکو نے بات بنائی۔ "میں مرتے مرتے بچا۔ تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے۔ پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔"

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈ پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں۔ اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے۔ گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔ دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منی کے چہرہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ پر ہلکو خوش تھا۔

منی نے فکر مند ہو کر کہا۔ اب مجوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا۔ رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔

"میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لئے کھیتی کرتے ہیں۔ مرنے کے لئے نہیں کرتے۔"

"جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔"

"آج جا کر سحنا سے کہہ دے، کھیت جانور چر گئے۔ ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔"

"رات بڑے غضب کی سردی تھی۔"

"میں کیا کہتی ہوں۔ تم کیا سُنتے ہو۔"

"تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ سحنہ کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ تمہارا کھیت چاہے جانور رکھائیں۔ چاہے آگ لگ جائے۔ چاہے

اُوپر پڑجائیں۔ اُسے تو اپنی مالگزاری چاہیئے۔"

"تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔"

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے۔ کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں مُنّی! تجھ سے سچ کہتا ہوں۔ مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اُٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے کھیتی کا مرجاد نہ بگاڑوں گا۔ جبرا! جبرا! کیا سوتا ہی رہے گا۔ چل گھر چلیں۔
